مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

زیرِ ادارت:- پروفیسر محمد عاقل ایم۔اے

جلد ۴۴ نمبر ۱	جنوری ۱۹۶۷ء	سالانہ چندہ ۵ ر فی پرچہ ۸ ر

فہرست مضامین

طابع و ناشر پروفیسر محمد مجیب بی۔اے (آکسن) دیال پریس، دہلی

دہلی سلطنت کا تعلیمی نظام

(دہلی سلطنت کا زمانہ قطب الدین ایبک کی تخت نشینی (۱۲۰۶ء) سے شروع ہوتا اور بابر کے حملے (۱۵۲۶ء) پر ختم ہوتا ہے۔ اس مضمون میں دہلی سلطنت کے تعلیمی حالات کے بارے میں تمام تر مواد ہمعصر ماخذوں سے مستنبط ہے مضمون کو غیر ضروری طوالت اور اثقال سے بچانے کے لئے حوالے نہیں دئے گئے ہیں) ریاض الاسلام

علم اور اصحاب علم کی سرپرستی کی روایات اسلامی تہذیب کا ہمیشہ سے جزو رہی ہیں۔ خلفائے عباسیہ نے مشرق میں اور خلفائے بنو امیہ نے مغرب میں ان بیش قیمت یونانی علوم کو جو زوال کی حالت میں تھے فنا سے بچایا اور انھیں بنی نوع انسان کے واسطے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ یورپ کے عہد تاریک میں بنو امیہ نے علم کی وہ مشعل روشن کی جس نے یورپ کو نئی دنیا اور نئے دور کا راستہ دکھایا۔ اسپین میں عہد اسلام میں جو دار العلوم قائم ہوئے وہ علوم و فنون اور ذہنی تلاش و تحقیق کے شاندار مرکز تھے اور انھیں کے نمونے پر یورپ میں وہ سری یونیورسٹیوں کی داغ بیل پڑی۔

خلافت عباسیہ کے زوال پر جو سلطنتیں بنیں، اُنھوں نے ان روایات کو قائم رکھا سلطان محمود غزنوی کا دربار اپنے عہد میں ایشیا کا سب سے مہذب اور متمدن دربار تھا یہ شعراء اور فضلاء کا مرکز تھا معزالدین غوری اور قطب الدین ایبک اگرچہ علم سے بیگانہ نہ تھے لیکن ان کا زیادہ وقت فتوحات میں گزرا۔ التمش کی توجہ بھی صوبائی بغاوتوں اور چنگیزی تاتاروں کے حملوں پر لگی رہی۔ لیکن اس کے عہد سے ہمیں تعلیمی پالیسی کے

آثار ملنا شروع ہوتے ہیں. شروع کے زمانہ میں مواد کم ملتا ہے لیکن جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے ہیں مواد کی افراط ہوتی جاتی ہے۔ مدرسے اس زمانے میں خاصی کثرت سے تھے، بعض ریاست کی طرف سے قائم تھے. بعض کو ریاست سے امداد ملتی تھی. اور اس کے علاوہ بہت سے مدرسے امراء اور ایسے لوگوں کی سرپرستی کی بدولت جاری تھے جنھیں استطاعت کے ساتھ توفیق کی دولت ملی تھی. اس کے علاوہ تقریباً ہر مسجد اور ہر مقبرہ کے ساتھ مدرسہ ملحق ہوتا تھا. با استطاعت لوگ اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے کسی مدرس کو یا آخری درجوں کے کسی طالب علم کو گھر پر رکھ لیتے تھے۔

التمش (جلوس ۱۲۱۰ء) نے اپنے بڑے بیٹے ناصرالدین محمود (اس کا انتقال التمش کی حیات میں ہو گیا تھا) کی یادگار میں مدرسہ ناصری دہلی میں قائم کیا تھا۔ اس کا پرنسپل سلطانہ رضیہ کے عہد میں قاضی منہاج الدین سراج خبرجانی تھا جو طبقات ناصری کے مصنف کی حیثیت سے مشہور رہے۔ ملتان میں ایک مدرسہ فیروزی تھا جو التمش کے لڑکے رکن الدین فیروزشاہ (جلوس ۱۲۳۵ء) نے قائم کیا تھا. دہلی میں ایک مدرسہ معزی بھی تھا جو غالباً معزالدین غوری کی یادگار میں قائم کیا گیا تھا. یہ مدرسے چھوٹے موٹے اسکولوں کی حیثیت نہ رکھتے تھے بلکہ بڑے پیمانے کے علمی مرکز تھے. بلبن کے چالیس سالہ دور اقتدار (۸۷-۱۲۴۶ء) میں علوم و فنون کو نمایاں ترقی ہوئی. بلبن نے اپنی غیر معمولی انتظامی صلاحیت سے سلطنت دہلی میں امن و امان اور نظم و ضبط قائم کیا. عرب و عجم پر اس وقت تاتاری عذاب مسلط تھا. تاتاری منگولوں نے سمرقند، بخارا اور بغداد جیسے علمی مرکزوں کو تباہ کر دیا تھا. بلبن نے اپنی ہوشیاری، فوجی قوت اور سیاست کاری سے ہندوستان کی اسلامی سلطنت اور اسلامی تمدن کو تاتاریوں کی غارت گری سے بچا لیا تھا. اس بات نے بلبن کی حیثیت اسلامی دنیا میں بہت اونچی کر دی تھی جس طرح قسطنطنیہ کی

فتح کے بعد یونان کے علماء اور فضلا روم چلے گئے تھے اسی طرح تاتاری حملے کے بعد وسط ایشیا اور ایران کے بے شمار علماء اور فضلا ہندوستان چلے آئے اور یہاں انھیں گوشۂ عافیت بھی نصیب ہوا۔ اور ریاست کی سرپرستی بھی۔ گویا یوں کہنا چاہیئے کہ وسطِ ایشیا سے علوم و فنون ہجرت کرکے ہندوستان میں آباد ہو گئے۔

علاؤالدین خلجی (۱۲۹۶ تا ۱۳۱۶) کا شمار تاریخ کے بڑے مدبروں میں ہونا چاہیئے۔ وہ ایک جری تخیل کا مالک تھا، اس نے غیر معمولی حالت میں غیر معمولی تدابیر اختیار کیں۔ اس کا اقتصادی ضبط اور منصوبہ بندی ہندوستان کی تاریخ میں ایک نیا تجربہ تھا۔ اس کا عہد امن و امان، عام فارغ البالی اور سلطنت کی توسیع کے لئے یادگار رہے گا۔ خلجی اگرچہ خود ان پڑھ تھا لیکن اس نے ملک میں وہ حالات پیدا کر دیئے تھے جن میں عموماً علوم و فنون اور تمدنی ادارے پھلتے پھولتے ہیں اس عہد کے ہمعصر مورخ ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں علماء اور فضلا کی ایک کثیر تعداد کا ذکر کیا ہے جو دہلی میں رہتے تھے اور درس دیتے تھے برنی ان کے ناموں کی فہرست دے کر کہتا ہے:

> جمل بشش اوستاد مذکور کہ من القاب اسامی ایشان نوشتہ ام آنانند کہ من از پیش بعضے تلمذ کردہ ام و بخدمت بعضے رسیدہ و بیشتر من را در مسند افادات و در محافل و مجالس دیدہ..... استادان دیگر کہ من القاب ایشان نیاوردہ ام در عہد علائی بر صدر حیات بودہ اند و دائم سبق می گفتند۔

کتابوں کا عام چرچا تھا اور کتب فروشی مستقل پیشہ تھا۔ تغلق خاندان کے پہلے تینوں بادشاہ (۱۳۲۰-۱۳۸۹) اہل علم تھے اور اصحاب علم کی قدر کرتے تھے۔ محمد بن تغلق سے بڑا عالم دہلی کے تخت پر شاید ہی کبھی بیٹھا ہو۔ وہ علوم رائج کی بیشتر

شاخوں سے اچھی طرح واقف تھا منطق، فلسفہ، معقول، علوم مذہبی سبھی سے اسے شغف
تھا۔ اُسے ہدایہ پوری حفظ تھی اور فارسی شعراء کے کلام اس کے نوک زبان تھے۔ وہ
ری بھی جانتا تھا، اس کے زمانہ میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے[1] وہ اہل
علم کی بے حد قدر کرتا تھا۔ اس کی قدردانی کی خبر سُنکر اسلامی ممالک کے بہت سے
علماء اور فضلاء دہلی آکر آباد ہو گئے تھے۔ فیروز شاہ کو مذہبیات سے خاص شغف
تھا۔ اس نے تیس بڑے مدرسے قائم کئے۔ ان میں مدرسہ شاہزادہ فیروز خاں، مدرسہ
فیروز شاہی اور مدرسہ سیری نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ مدرسہ فیروز شاہی کی عمارت
حوض خاص کے کنارے بڑے اہتمام سے بنائی گئی تھی یہ نیم شکستہ حالت میں اب بھی
موجود ہے۔ اُس زمانہ میں اس کا شمار دہلی کی بہترین عمارتوں میں ہوتا تھا۔ ساری
عمارت ایک باغ کے اندر تھی جس میں داخل ہونے کے لئے ایک خوش نما دروازہ تھا
مدرسے کے گنبدوں پر ہرے رنگ کے گلدستے لگے ہوئے تھے۔ شہر کے بہت سے
ارباب علم نے آس پاس مکان بنوالئے تھے۔ طلبا کا دار الاقامہ مدرسہ سے ملحق تھا۔ اس طرح
یہ مقام علمی اور ذہنی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ شیخ جلال الدین رومی جو اپنے عہد کے
بڑے جلیل القدر عالم سمجھے جاتے تھے اس کے صدر مدرس تھے۔ مدرسہ میں مختلف علوم
پڑھائے جاتے تھے۔ برنی نے اس مدرسہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :۔

> از بناہائے مبارک خداوند عالم مدرسہ فیروز شاہی ست کہ بس بوالعجب عمارتے
> بر سرِ حوض علائی بنا شدہ است و عمارت مدرسہ مذکور از رفعت گنبدہا و شیرینی عمارت ہا و
> موازین صحن ہا و لطافت نشست جائے ہا و محل ہائے مروج وصف ہائے دل آویز گوئی
> لطافت از عمارت ہائے کہ در عالم معروف ست ربودہ۔

---

[1] مسالک الابصار

دربار کے شاعر مطہر (ساکن کڑہ) نے مدرسہ کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں اگرچہ کچھ مبالغہ ہے لیکن پھر بھی اصل سے زیادہ دور نہیں۔ اس کے بعض اشعار حسب ذیل ہیں :-

اہل ازاد کہ مدرس رفت دراں فرخ جائے ۔۔۔ عرصۂ دید چو صحرا بہشتی و ہموار
سبزہ و سنبل و ریحان و گل و لالہ درو ۔۔۔ رستہ وارستہ چندانکہ کند چشم تو کار
نارو نارنج و ترنج و بہ و سیب و انگور ۔۔۔ دررسانیدہ درو میوہ امسال بہار
واندراں باغ یکے فرش بہ بالائے دو مرد ۔۔۔ طول و پہناش ز ہر سوئے چہل رس بشمار
قبہ بر سرش افراشتہ تا طارم ماہ ۔۔۔ کہ چو خورشید درو خیرہ ہمی شد ابصار
بام و برجش بزد آراستہ چوں روئے عروس ۔۔۔ در و دیوار جلا دادہ بطلق آئینہ دار
سطح او را ز رخ روشن حوراں شنگرف ۔۔۔ سقف او را ز پر سبز ملایک زنگار
عالمان عربی لفظ و عراقی دانش ۔۔۔ ہمہ در جبہ شاہی و بمصری دستار
گفتم ایں عالم آفاق جلال الدین است ۔۔۔ رومی آں کز نسبش رہی کند روم فخار
ہمچناں یکدگر از طالب علماں ہر سوی ۔۔۔ بر فلک بردہ صدا غلغل بحث و تکرار
ساعتی چوں شغب و شور و جدل ساکن شد ۔۔۔ اندر آورد (ز) درخورد نیش خوان سالار
ہمہ دراج و کبوتر ہمہ و کبک و کلنگ ۔۔۔ ماہی و مرغ مسمن برہ کوہ وقار
وآبداراں ہمہ بر دست قدح جابجا بلہ ۔۔۔ کردہ با شربت خاص شراب آثار
چوں بپرداخت زماں محفل از شرب نوش ۔۔۔ سفرہ بر داشتہ شد دست کشیدند اخیار
برگ ولاں شدہ در دادن تنبول دواں ۔۔۔ برگ داں ہائے زر و سیم گرفتہ یکبار
بیرہا چوں گل صد برگ چو گل ۔۔۔ دوختہ اں گل صد برگ بیک سوزن خار

کھانے کے بیان میں مبالغہ کی چاشنی غالباً کچھ تیز ہو گئی ہے۔ لیکن اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ مدرسہ کی تنظیم اقامتی طور پر تھی۔ طلباء آپس میں مباحثہ اور تکرار سے سبق یاد کیا کرتے تھے اور ریاست کی طرف سے ان کے لئے کھانے کا اچھا انتظام تھا۔

سیری میں جو مدرسہ بنایا تھا اس کی عمارت بھی خوشنما تھی۔ اور اس کے چاروں طرف باغ تھا۔ اس کے مدرس مولانا سید نجم الدین سمرقندی تھے۔ اس کے علاوہ مسجد خانجہاں (کالی مسجد، بلبلی خانہ) اور حضرت فتح خاں (متصل مزار خواجہ باقی باللہ صاحب) سے بھی مدرسے ملحق تھے۔

فیروز شاہ تغلق کے بعد سلطنت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ رہا سہا وقار تیمور کے تباہ کن حملے نے ختم کر دیا۔ دلی تخت گاہ دانش کی حیثیت سے کچھ عرصہ کے لئے ختم ہو گئی۔ لیکن اس کا ایک اچھا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ شرقی سلطنت، بنگال، گجرات، مالوہ، بہمنی سلطنت کے تخت گاہوں میں علوم و فنون کے نئے مرکز قائم ہو گئے۔ جونپور نے خاص امتیاز حاصل کیا اور وہاں کے عالموں اور استادوں کی شہرت ہندوستان کی حدوں سے باہر نکل کر دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی پہنچی

ہندوستانی مسلمانوں میں زیادہ تعداد حنفی عقیدہ کے لوگوں کی تھی اس لئے یہاں شروع سے حنفی اصول تعلیم کا اثر تھا۔ حنفی اصول تعلیم ذہنی جلا اور ارتقا، آزادی خیال اور تنقیدی قوتوں کی تربیت پر زیادہ زور دیتا ہے۔ شافعی اصول اس کے برخلاف علوم دینی کے محفوظ کرنے پر اور تقلید پر زور دیتا ہے۔ . . کی عبارتوں سے یہ فرق مزید واضح ہو جائے گا۔ برہان الدین زرنجی (چھٹی صدی عیسوی) جو کہ حنفی اصول کا علم بردار ہے اپنی کتاب تعلیم و متعلم میں کہتا ہے "خدا پر ایمان عقل پر مبنی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ایک نقال اور مقلد کا عقیدہ اگرچہ بالذات درست ہو لیکن ہمارے نقطۂ نظر سے نادرست ہو گا۔ جب تک کہ اس پر عقل اور ذہن نے مُہر نہ لگادی ہو۔" امام شافعی فرماتے ہیں کہ شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ علم الکلام ہے۔[1]

---

(1) Islamic Culture 1944, The Muslim Theory of Education during the Middle Ages.

اس بنیادی فرق کا اظہار طرز تعلیم اور نصاب میں ہوتا ہے۔ شافعی تمام تر توجہ تفسیر، حدیث اور فقہ پر دیتے تھے اور ان علوم کے مطالعہ میں بھی تحفظ و تقلید پر زیادہ زور دیتے تھے۔ علوم عقلی ان کے لئے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ حنفی علوم دین کی اہمیت کو مانتے تھے لیکن طلباء میں آزادی رائے اجتہاد اور استدلال کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ وہ طلباء میں بحث و نظر کی صلاحیتیں بیدار کرنا چاہتے تھے۔ اور علوم عقلی کو تعلیم کا ضروری جزو گردانتے تھے۔

خوش قسمتی سے اسلامی ہند شروع سے حنفی اصول تعلیم کے زیر اثر تھا ہندوستان میں پہلا بڑا مسلمان عالم، ابو ریحان البیرونی، علمی تحقیق اور ذہنی آزادی کا شاندار نمونہ تھا۔ وہ طب، منطق، فلسفہ، فلکیات، مذہبیات کا ماہر تھا۔ اور تمام علوم رائجہ پر اس کی بڑی اچھی نظر تھی۔ اس کی کتاب الہند اس کی تلاش وتحقیق اور آزادی خیال کا نمونہ ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں نے جو مدرسے قائم کئے ان میں طرز تعلیم اور نصاب دونوں میں حنفی نقطۂ نظر کارفرما نظر آتا ہے۔ ان مدرسوں میں علوم دین اور معقولات ساتھ ساتھ پڑھائے جاتے تھے۔ بڑے مدرسوں میں ہر علم و فن کا علیحدہ استاد ہوتا تھا جو کہ اپنے مضمون کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ تفسیر، فقہ، قرأت، حدیث صرف و نحو، معانی، انشاء، بدیع، بیان، کلام، منطق، فلسفہ، تاریخ وغیرہ غرض سب ہی علوم پڑھائے جاتے تھے۔ طلباء علمی مسائل پر آپس میں بحث و تکرار کیا کرتے تھے۔ فلکیات میں دلچسپی بدستور قائم تھی۔ فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں سنسکرت کی بعض کتابوں کا ترجمہ ہوا جو فلکیات سے بحث کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب کا قلمی نسخہ حبیب گنج لائبریری (ضلع علی گڈھ) میں اب بھی موجود ہے۔ یہ کتاب کسوف خسوف، سمت، آب ہوا کی تبدیلی اور اس قسم کے دوسرے معاملات پر حاوی ہے فلسفہ اور معقولات کا اتنا زور تھا کہ غیاث الدین تغلق کے دربار کے کئی اہم اشخاص

اس سے متاثر تھے اور مذہبی معاملات میں آزاد خیالی اور بے اعتقادی کے لئے بدنام تھے خود محمد بن تغلق نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ اس پر نیم لامذہبیت کا ایک دور گذرا ہے۔ وہ منطق کا بڑا استاد تھا۔ اور اچھے اچھے عالم اس سے بحث کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔

تعلیم کا عام معیار اچھا تھا۔ عین الملک ماہرو ملتانی جو کہ خود اپنے زمانہ کا بڑا انشا نگار مانا جاتا تھا۔ اپنے لڑکے کو ایک خط میں لکھتا ہے:۔

"ابنائے جنس اہل فضل ہادر ہیں سن کہ آن فرزند است شاید کہ از مبادی ومقدمات تعلیم گذاشت وعادی سقامہ (؟) مفصل شدہ ومستعد علم المعانی والبیان وفروع واصول ومعقول گشتہ وقلم انشا واختراع وتصرف وتصنیف وابداع بر دست باشد وبہ تلفیق معانی دقیق قادر و بہ تملیک فکر ونکتہ لطائف الی و آمر بودہ ......"

حساب ابتدائی تعلیم کا ضروری جز سمجھا جاتا تھا۔ دفتری ملازمت کے لئے ریاضی اور مساحت کا علم ناگزیر تھا۔ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں عبدالحمید محرر غزنوی نے ایک کتاب دستور الالباب فی علم الحساب کے نام سے تالیف کی جس میں ریاضی اور مساحت سے تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ علم طب کا عام چرچا تھا۔ علاء الدین کے عہد میں چند مشہور طبیب اور جراح گذرے ہیں جن کی شہرت ہندوستان تک محدود نہ تھی۔ محمد بن تغلق کے عہد میں صرف دہلی میں ستر شفاخانے تھے۔ جو اس زمانے میں مارستان یا بیمارستان کہلاتے تھے۔ بادشاہ کی ملازمت میں بارہ سو اطبا رہتے تھے۔ فیروز شاہ کو خود علم طب سے بڑا شغف تھا اور اس نے ایک رسالہ طب فیروز شاہی کے نام سے تالیف کیا تھا۔

صنعتی تعلیم منظم اور اچھے پیمانے پر تھی۔ یہ تعلیم صنعتی انجمنوں (Guilds) کے ذریعہ دی جاتی تھی کہ اس زمانے میں طائفے کہلاتے تھے۔ ہر صنعت کا ایک علیحدہ طائفہ ہوتا تھا۔ یہ طائفہ اور تنظیم صنعتی ہنر اور کمال کے تحفظ اور ترقی کا بڑا اچھا ذریعہ تھی۔

بادشاہ، دربار اور امرا کی گوناگوں ضروریات کی بدولت صنعت وحرفت کا بازار ہمیشہ گرم رہتا تھا۔ اس طرح صنعتی تعلیم معاش حاصل کرنے کا بڑا اچھا ذریعہ تھی اور بہت مقبول تھی۔ ان میں سے بہت سے لوگوں کو شاہی کارخانوں میں جگہ مل جاتی جہاں بادشاہ اور حکومت کی ضروریات کی چیزیں تیار کی جاتیں۔ بہت سے لوگ اپنا کاروبار کھول لیتے تھے۔ محمد بن تغلق کے جامہ خانہ میں چار ہزار کاری گر کام کرتے تھے جو مختلف قسم کے کپڑے، خصوصاً ریشمی کپڑے اور شاہی خلعتیں تیار کرتے تھے۔ اس کے علاوہ چار ہزار کاریگر زردوزی کے کام پر متعین تھے۔ فیروز شاہ کے زمانے میں حکومت کے ۳۶ کارخانے تھے۔ ان میں سے بعض صرف سامان فراہم کرتے تھے، بعض سامان تیار کرتے تھے۔ سامان تیار کرنے والے کارخانوں میں سے بعض یہ ہیں:۔ عطردار خانہ، جامہ دار خانہ، علم خانہ، گھڑیال خانہ، فراش خانہ، رکاب خانہ، زراد خانہ، سلاح خانہ، دارو خانہ وغیرہ۔ یہ کارخانے بلاواسطہ یا بالواسطہ صنعتی تعلیم کی ترویج کا ذریعہ بھی تھے۔ کیونکہ بہت سے لوگ اس میں آکر کام سیکھتے تھے۔ فیروز شاہ نے ان کارخانوں میں ۱۲ ہزار غلاموں کو مختلف صنعتیں سکھا کر ملازم رکھا تھا۔ علاوہ ازیں سنگتراش، چوب تراش، آہن گر، درودگر، آرہ کش، چونہ پز اور راج ملازم تھے۔ فیروز شاہ نے بہت سے غلاموں کو سنگ تراشی کا کام سکھا کر عمارت خانہ میں برسرکار لگا دیا تھا۔ ان سب باتوں سے اندازہ ہو گا کہ ریاست صنعتی تعلیم کے سلسلے میں کتنی عملی دل چسپی لیتی تھی۔

تعلیم کی سرپرستی میں ریاست خاصہ روپیہ خرچ کرتی تھی۔ ریاستی مدرسے کے مدرسین کی تنخواہ ریاست کے ذمہ ہوتی تھی۔ تنخواہ رقم کی صورت میں خزانے سے دی جاتی یا مدرسہ یا مدرس کے نام کچھ اراضی کر دی جاتی تھی جس کی آمدنی اسے مل جاتی۔ فیروز شاہ نے بہت سے مدرسوں کے لئے گاؤں وقف کر دیے تھے

تھے۔ مثال کے طور پر صرف ایک حوالہ دینا کافی ہوگا۔

"مولانا سید نجم الدین سمرقندی مدرسہ وادرار و انعام تعین شدہ وجند بن مغلمان را آنجا نان کردہ اند وہر روز بخدمت استاد مذکور علوم دینی درس می کنند" (برنی)

غریبوں اور غلاموں کی تعلیم کے لئے فیروز شاہ نے خاص طور سے انتظام کیا تھا اور اس کا خرچ ریاست کے ذمہ تھا۔ غلام جو لڑائیوں میں سے پکڑے ہوئے آتے تھے انھیں حسب صلاحیت کلام اللہ، حفظ قرآن، علوم دینی علم تحریر، صنعت و حرفت کی تعلیم دی جاتی۔

سرکاری زبان فارسی تھی اور مسلمانوں کی عام بول چال اور تحریر کی زبان بھی فارسی تھی۔ عربی اعلیٰ تعلیم کا لازمی جزو سمجھی جاتی تھی۔ سنسکرت سے مسلمان علماء ناواقف نہ تھے جیسا کہ سنسکرت کی کتابوں کے ترجمہ سے ظاہر ہے۔ ہندی کا رواج مسلمان گھروں میں تھوڑا تھوڑا ہو چلا تھا۔ صوفیار کرام ہندی سے خوب واقف تھے جیسا کہ ان کے ملفوظات سے پتہ چلتا ہے۔ تعلیم کا ذریعہ عموماً فارسی زبان تھی۔

صوفیار کرام نے جس طرح اپنے لئے مروجہ راستوں سے ہٹ کر زندگی کا ایک نہج اختیار کر لیا تھا، اسی طرح ان کی تعلیم و تدریس کا طریقہ بھی عام لوگوں سے مختلف تھا ان کی تعلیم کے دو ذریعے تھے، ملفوظات اور مکتوبات۔ شیخ روزانہ اپنے مریدوں کے ساتھ مجلس میں بیٹھا کرتے تھے۔ ان مجلسوں کے لئے عموماً رات کا وقت انتخاب کیا جاتا لیکن وقت کی کوئی قید نہ تھی۔ مرید کوئی سوال دریافت کرتا یا باتوں باتوں میں کوئی نکتہ نکل آتا اور پھر شیخ اس پر اپنی رائے کا اظہار کرتے۔ مریدوں میں سے کوئی ایک شخص نے اس کام کے لئے اپنے کو مخصوص کر لیا ہو، شیخ کے کلمات کو سپرد قلم کر لیتا۔ ان کلمات یا ملفوظات کو جمع کرنے میں عموماً بڑے اہتمام سے کام لیا جاتا تھا۔ مرید وقتاً فوقتاً ان قلم کردہ عبارتوں کو شیخ کو دکھا لیتا تاکہ اس سے اگر لکھنے یا سمجھنے میں کوئی غلطی ہوگئی ہو تو شیخ درست کر دیں۔ شیخ کی زندگی ہی میں ان ملفوظات کی بے شمار نقلیں ہو کر

تقسیم ہو جاتیں۔ مُرید انہیں بڑے ذوق شوق سے پڑھتے۔ کتب فروش ان کی نقلیں کرا کے دُکان پر رکھ لیتے اور ان کی خوب بکری ہوتی۔ شیخ نظام الدین اولیار، شیخ برہان الدین غریب شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی، شیخ شرف الدین منیری، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت سید اشرف جہانگیر سمنانی اور دوسرے شیوخ کے ملفوظات کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور مُریدوں معتقدوں اور عام مسلمانوں کے لئے بھی یہ روحانی اور مذہبی تعلیم کا بہت اہم ذریعہ ثابت ہوئے۔

صوفیار میں تعلیم کا دوسرا ذریعہ مکتوبات تھے۔ مُرید اگر کسی سبب سے شیخ کی صحبت اور مجالس سے محروم ہے تو وہ شیخ کو اپنی مشکلات لکھ کر بھیجتا اور شیخ اس بارے میں مفصّل جواب تحریر فرماتے۔ ان خطوط کے طرز نگارش سے صاف ظاہر ہے کہ ان کی تحریر کا مقصد بالکل تعلیمی تھا۔ مکتوبات میں کاتب یا مکتوب الیہ کے ذاتی حالات کا یا حالات حاضرہ کا برائے نام بھی ذکر نہیں ملتا۔ ہر مکتوب کسی ایک خاص مسئلہ سے منظم اور باضابطہ انداز میں بحث کرتا ہے۔ مکتوب کے شروع میں سے القاب اور آخر سے کاتب کا نام نکال دیا جائے تو ان کی حیثیت خالص عالمانہ مضامین کی رہ جائے۔ ملفوظات کی طرح مکتوبات بھی نقل ہو کر ایک وسیع دائرہ میں تقسیم ہوتے اور روحانی اور مذہبی ہدایات کا ذریعہ بنتے۔ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری نے خاص طور سے مکتوبات کو اپنے خیالات کی ترویج کا ذریعہ بنایا۔ ان کے مکتوبات کے کئی ایک مجموعے رائج ہیں۔ شیخ مجدد الف ثانی نے بھی مکتوبات کو اپنے افکار و نظریات کے ترویج اور نشر کا ذریعہ بنایا۔

اس زمانے کا نظام تعلیم اس قدر باضابطہ نہ تھا جیسا کہ آج کل ہے۔ درجات کی تقسیم، حاضری نصاب کے تعین اور امتحان کے وہ بندھے ٹکے طریقے نہ تھے جو اب رائج ہیں۔ مدرسے کی شہرت اُستاد کی شہرت سے

وابستہ ہوتی تھی۔ مشہور استادوں کی دی ہوئی سند ڈگری کا درجہ رکھتی تھی۔ بہت سے طالب علم کئی استادوں سے یکے بعد دیگرے درس حاصل کرتے اور اس طرح کئی مضامین پر سند حاصل کرتے۔ چھوٹے مدرسوں کی کارکردگی بڑی حد تک مدرس کی فرض شناسی اور دیانت داری اور دیوان رسالت (محکمہ الصدر) یا سرپرست کی نگرانی پر منحصر ہوتی۔ غرض یہ کہ اس عہد کے نظام میں ضابطہ بندی کم تھی اور لچک زیادہ اور یہی چیز اس عہد کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے موزوں تھی۔

جامعہ ملیہ میں تعلیم بالغان کے تجربے

پہلی جنگ عظیم کے بعد جماعتی زندگی کے ہر کام میں عوام کی اہمیت کا احساس پیدا ہوگیا تھا۔ جامعہ ملیہ اسی زمانہ میں قائم ہوئی۔ اور اس کا قیام اس بات کا اعلان تھا کہ ہندوستان کے باشندے تعلیم کے سرمایہ کو کسی خاص طبقے اور گروہ کی اجارہ داری میں دینے سے برداشتہ خاطر اور تعلیم کو عام کرنے کے لئے مضطرب و بے چین ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ نے صرف متوسط یا خوش حال طبقہ کی خدمت کو کبھی ساری قوم کی خدمت نہیں سمجھا۔ اسے اپنا مستقبل اور اپنی خدمت کا اصلی میدان ہمیشہ عوام اور غربا میں نظر آتا رہا ہے۔ متوسط اور خوش حال طبقہ اس کا مخاطب اس لئے رہا اور ہے کہ عوام کی اصلاح و ترقی میں قیادت کے فرائض اکثر یہی انجام دیتا ہے۔

تعلیم کو عام کرنے کے لئے دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی یہ کوشش کی گئی کہ زیادہ سے زیادہ مکتب، اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں قائم اور ملک کے بچوں اور نوجوانوں کے لئے تعلیم کے بیش از بیش مواقع فراہم کئے جائیں۔ اس سلسلہ میں عوام کی طرف سے سب سے پہلے یہ مطالبہ کیا گیا کہ ابتدائی تعلیم کو عام اور ہندوستان کے ہر بچے کے لئے ابتدائی تعلیم کا نہ صرف انتظام کیا جائے بلکہ ہر ایک کے لئے اسے لازمی اور جبری قرار دیا جائے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے تعلیم کے یہ تمام میدان اپنے سامنے رکھے۔ مکاتب مدارس اور کالج غرض تعلیم کے ہر میدان میں نئی سے نئی راہیں معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اس کے کارکن برابر اس فکر میں لگے رہے کہ وسائل اجازت دیں تو وہ لوگوں کو آزاد

تعلیمی نظام کی اشاعت کی طرف متوجہ کریں اور ہندوستانیوں کو ایسی تعلیم سے نجات حاصل کرنے میں مدد دیں جو انھیں زندگی کے نئے راستوں سے تو کیا خاک واقف کرتی، اُن کے لئے محض بار اور بوجھ بنی ہوئی ہے۔

ہندوستان میں تعلیم بالغان کے چرچے

تعلیم بالغان کا مطالبہ عام تعلیم کی طرف دوسرا قدم ہے۔ یہ قدم اُٹھانے کے لئے اس سے زیادہ ہمت اور حوصلہ کی ضرورت ہے جس کے ساتھ پہلے قدم اٹھائے گئے ہیں تعلیم بالغان کے نام سے، ہمارے ملک میں کچھ نہ کچھ کام ایک عرصہ سے ہو رہا ہے۔ یہ کام اگر اسی نہج پر جاری رہا جس پر اب تک چل رہا تھا تو اس سے عام تعلیم کے مقاصد ہرگز حاصل نہ ہو سکیں گے شبینہ مدارس کا خیال ہندوستان میں اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ خود ہماری سیاسی تحریک اس تمام عرصہ میں ادھر اُدھر رات کے جو مدرسے کھلتے رہے، وہ سب انفرادی کوششوں کا نتیجہ تھے اور انھیں لوگ مذہبی تبلیغ کے جوش میں یا سیاسی اغراض کے پیش نظر اور یا پھر خدمت کے جذبہ سے متاثر ہو کر علم کی خیرات تقسیم کرنے کے لئے قائم کر دیتے تھے۔ نیک لوگ ہمیشہ سے چاہتے آئے ہیں کہ جو کچھ ان کے پاس ہے اس میں غریبوں اور فقراء کو بھی شریک کرتے رہیں۔ علم کی بھینٹ چڑھانے کا طریقہ لوگوں کو "مدارس شبینہ" کی شکل میں مل گیا۔ جامعہ ملیہ بھی زمانہ کی اس نیک فضا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ اس نے سنہ ۲۶ء اور پھر سنہ ۳۰ء میں رات کے مدرسے قائم کئے۔ لیکن وہ کبھی زور شور سے اور کبھی مدھم چل کر کچھ عرصہ کے بعد بند ہو گئے۔ ملک کے مختلف حصوں میں تعلیم بالغان کے نام سے جو کوششیں ہو رہی تھیں، ان سب کا یہی حشر ہوا۔ ہر تھوڑے عرصہ کے بعد ملک میں مدارس شبینہ کا زور بڑھتا لیکن وہ زیادہ مدت تک کام نہ کرنے پاتے کہ ہانڈی کے اُبال کی طرح پھر دب کر رہ جاتے۔ تعلیم کی خیرات تقسیم کرنے کا یہ طریقہ برابر جاری رہا۔ لیکن اس سے عوام کی تعلیمی حالت میں کچھ تبدیلی نہ ہوئی کیونکہ یہ سب کچھ تعلیمی فرض سمجھ کر کبھی کیا ہی نہیں گیا تھا۔

صوبوں میں جب خود مختار حکومتیں قائم ہوئیں تو لوگوں پر جمہوریت اور مساوات کو زندگی کے حقائق سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت واضح ہو گئی۔ جن لوگوں کو ملکی مسائل میں بولنے کا حق دیا جاتا ہے، اگر وہ اپنے مسائل کو سمجھنے سے معذور رہیں تو انھیں ہر شخص آسانی سے بہکا سکتا ہے۔ اس لئے عام تعلیم کا مسئلہ جمہوری حکومتوں کے لئے ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ جسے وہ مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے علاوہ تعلیم بالغان کے ملک گیر پروگرام کے ذریعے حل کرتی ہیں۔ ہندوستان کی صوبائی حکومتوں نے اول دن سے اس ضرورت کو محسوس کیا اور اپنے اپنے صوبے میں جہالت کو ختم کرنے اور تعلیم کو عام کرنے کے بڑے بڑے منصوبے بنائے۔ اور منصوبوں پر بڑی فیاضی سے روپیہ خرچ کیا گیا۔ اس تمام جد و جہد سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ عوام میں تعلیم بالغان کا چرچا ہوا اور ان کے رہنما تعلیم بالغان کو علم کی خیرات تقسیم کرنے کا طریقہ نہیں بلکہ ملک کے تعلیمی مسائل کا ایک اہم جزو سمجھنے لگے۔ لیکن عملی نتائج کچھ زیادہ امید افزا نہ نکلے۔

ادارۂ تعلیم و ترقی

جامعہ ملیہ کے کارکن جو اپنی درسگاہ کے قیام کی اصلی غرض و غایت، عام تعلیم کی اشاعت میں مضمر سمجھتے تھے، اس صورتِ حال کا غائر نظر سے مطالعہ کرتے رہے۔ وہ اب تک مدارس، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کے ایسے ذرائع دریافت کرتے رہے تھے جو ہندوستان کی ضروریات کا کفیل بن سکیں۔ اب انھیں تعلیم بالغان کے میدان میں تجربے اور ایسے وسائل تعلیم دریافت کرنے کی ضرورت کا احساس ہوا جو ہندوستانی عوام کی تعلیمی ضروریات پورا کر سکیں۔ انھیں اس بات کا اندیشہ تھا کہ مدارس شبینہ کی ناکامی سے مایوس ہو کر کہیں تعلیم کے اس میدان میں بھی وہی غلطی نہ کی جائے جو اب تک کی جاتی رہی ہے۔ یورپ میں جس نہج پر تعلیم بالغان کا کام ہوا ہے اگر اسے ہندوستان کی ضروریات کے مطابق تبدیل کئے بغیر من و عن رائج کر دیا گیا تو جن... لیکہ زمانہ تک نقصان اٹھانا پڑے گا۔ انھوں نے ملک میں عام تعلیم کی جو کوششیں ہو رہی تھیں

انھیں اپنے سامنے رکھا اور دوسرے ملکوں کی تحریکوں سے ان کا مقابلہ کیا۔ اور یہ کھوج لگانا شروع کیا کہ ہندوستان میں مدارس شبینہ کی ناکامی کے کیا اسباب ہیں۔ اور یہاں تعلیم بالغان کے کون سے طریقے مقبول ہو سکتے ہیں۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہمارے یہاں عام تعلیم کی جو کوششیں کی گئی تھیں وہ اس لئے ناکام رہیں کہ عوام کی تعلیم کے لئے نہ راہ معین تھی اور نہ اس کے طریقے معلوم کئے گئے تھے۔ نہ کوئی نصاب تھا اور نہ اس کے لئے کوئی تعلیمی سامان۔ اپنی اور دوسروں کی ناکامی سے وہ یہ جان گئے کہ عام تعلیم کا کام صرف لکھنا پڑھنا سکھانے کا کام نہیں ہے بلکہ اس سے وسیع تر اور متنوع کام ہے۔ اگر یہ کام کرنا ہے تو ہمیں اس سے متعلق بہت سے مسائل کی تحقیق کرنا ہوگی۔ مختلف طریقوں کو آزمانا ہوگا۔ اور پھر عام تعلیم کے لئے کوئی منظم پروگرام بنا کر اس پر چلنا ہوگا۔

چنانچہ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ادارۂ تعلیم و ترقی قائم کیا۔ جناب شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی کی نگرانی میں عام تعلیم کے تجربے اور بالغوں کی تعلیم کے لئے مناسب طریقے معلوم کرنے کا کام شروع ہوا۔ ابتدا میں ادارہ کے سامنے کوئی واضح طریقہ کار نہ تھا۔ اس کے کارکنوں کو صرف اتنا معلوم تھا کہ انھیں تعلیم بالغان کے متعلق جملہ امور میں ان لوگوں کی رہنمائی اور مدد کا فرض انجام دینا ہے جو نجی طور پر یا کسی انجمن اور ادارے سے متعلق ہو کر تعلیم بالغان کا کام کر رہے ہیں یا جن کو آئندہ اس کام کے سلئے آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس ادارہ کے قیام کی غرض یہ طے پائی کہ تحقیق اور تجربے کے بعد ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں کے مخصوص حالات میں بالغوں اور عوام کی تعلیم کے لئے :-

(۱) مناسب راہیں متعین کرے، نصاب تعلیم اور طریق تعلیم تجویز کرے اور ان کی ترویج اور اشاعت کی کوشش کرے۔

(۲) حسب ضرورت تعلیمی سامان تیار کرے اور اس کی اشاعت کا بندوبست کرے۔

(۳) کارکنوں کی ٹریننگ کا انتظام کرے اور ان کی ہدایت کے لیے مناسب لٹریچر تیار کرلے اور اس کی اشاعت کا بندوبست کرے۔

(۴) ان مقاصد کے حصول کے لئے منجملہ اور طریقوں کے سردست حسب ذیل طریقے تجویز کئے گئے:۔

(۱) ایک کتب خانہ اور ایک میوزیم ادارہ میں قائم کیا جائے۔ کتب خانے میں بالخصوص بالغوں کی تعلیم پر مفید کتابیں، رسائل اور لٹریچر جمع کیا جائے اور میوزیم میں ماڈل، آلات اور ایسا سامان جمع کیا جائے جس سے بالغوں اور عوام کی تعلیم میں مؤثر طریقے پر کام کیا جاسکتا ہے۔

(۲) ایک نمونہ کا تعلیمی مرکز قرول باغ میں قائم کیا جائے اور اس کو ناخواندہ کم خواندہ اور خواندہ طبقے کی تعلیم کے لئے تجربہ گاہ بنایا جائے۔

(۳) ایک نمونہ کا تعلیمی مرکز ہال قرول باغ میں قائم کیا جائے اور اس میں بستی کے تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے تعلیم، تفریح اور ورزش کا انتظام کیا جائے اور اراکین ہال کے لئے سماجی خدمت کے مواقع پیدا کئے جائیں۔

(۴) دوسری بستیوں میں بھی اسی نمونہ کے تعلیمی مرکز اور تعلیمی مرکز ہال قائم کرنے کی تحریک کی جائے۔

(۵) بالغ مبتدیوں کے لئے کتابچے، رسائل اور کتابیں تیار کی جائیں اور ان کی اشاعت کا انتظام کیا جائے۔

(۶) کارکنوں کے لئے وقتاً فوقتاً تعلیمی حلقے منعقد کئے جائیں اور اُن کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے ادارہ کی طرف سے مناسب انتظام کیا جائے۔

(۷) عوام اور بالغوں کی تعلیم کا کام کرنے والے دوسرے اداروں اور کارکنوں سے ربط قائم کیا جائے اور پیش نظر مقاصد کے لئے ان کا تعاون اور اشتراک حاصل کیا جائے۔

ابتدائی تجربے

جولائی ۱۹۳۹ء میں ادارہ نے ایک تعلیمی مرکز قائم کیا۔ پہلے یہ طے پایا تھا کہ مرکز کی سرگرمیاں پورے قرول باغ میں جاری کی جائیں لیکن تجربات نے بتایا اتنی بڑی بستی کے لئے ایک مرکز ناکافی ہے اس لئے مرکز کی سرگرمیوں کو قرول باغ کے ایک چھوٹے سے علاقہ میں محدود کر دیا گیا۔ جس علاقہ میں کام شروع ہوا، اس کا تفصیلی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی۔ مکانوں کی تعداد، باشندوں کی تعداد، تعلیم یافتہ بالغوں کی تعداد، حرف شناس بالغوں کی تعداد، بے پڑھے بالغوں کی تعداد، حرف شناس بچوں اور بے پڑھے بچوں کی تعداد معلوم کرنے اور پیشے کے اعتبار سے آبادی کی تقسیم دریافت کرنے کے لئے مرکز کے کارکن بستی کے ہر گھر پر جاتے اور متعلقہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ یہ سب اس لئے کیا جاتا کہ مرکز کے کارکنوں کو اپنے کام کا اندازہ ہو سکے وہ یہ جان سکیں کہ کتنے لوگ اُن کے کام میں مدد دے سکتے ہیں اور کتنے ہیں جو ان کی مدد کے مستحق ہیں۔ ان دونوں کے فرصت کے اوقات کیا ہیں۔ اور اگر ان میں کام کیا جائے اور بعض سے کام میں مدد لی جائے تو ان کو کیا کیا دشواریاں پیش آسکتی ہیں اور ان دشواریوں پر قابو پانے کے لئے کن تدابیر پر عمل کرنا ضروری ہے۔ تفصیلی جائزہ تیار کرنے کی پہلی کوشش زیادہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اکثر لوگ متعلقہ معلومات بتانے سے پہلو تہی برتتے۔ بعض حضرات کو تعلیمی مرکز کے قیام اور اس کے مقاصد سے آگاہ کرنے میں بڑی دیر لگتی۔ غرض لوگ اس کام سے واقف نہ تھے۔ انھیں اس قسم کے کام سے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا۔ اور وہ اس میں کسی قسم کی مدد دیتے ہوئے گھبراتے تھے۔ لیکن پھر بھی بستی کا ایک جائزہ نامکمل ہی سہی، کسی نہ کسی طرح تیار ہو گیا۔ اور اس سے یہ فائدہ ہوا کہ بستی کے لوگوں میں مرکز کا تعارف ہو گیا۔ اب وہ تماشائی کی طرح یہ دیکھنے لگے کہ مرکز کے کارکن اب کیا کرتے ہیں۔

بستی کے لوگوں کو مرکز کے مقاصد بتا دئے گئے تھے اور انھیں دعوت دی گئی تھی کہ تعلیم یافتہ کام میں مدد دینے اور ناخواندہ تعلیم کی غرض سے روزانہ رات کو مرکز میں جمع

ہوجایا کریں۔ لیکن مرکز میں آنے والوں کی تعداد بالکل صفر کے برابر تھی۔ کارکنوں نے ایک دن جلسہ کا اعلان کیا۔ اس پر بھی کوئی نہ آیا۔ تقریر شروع ہوئی۔ جلسہ گاہ میں صرف مرکز کے کارکن بیٹھے تھے۔ جلسہ گاہ سے دور سڑک پر بستی کے چند آدمی ضرور تماشائی کی حیثیت سے کھڑے رہے۔ اس قسم کے بہت سے تجربات کے بعد یہ طے کیا گیا کہ مرکز میں لوگوں کے لئے کشش کے اتنے سامان پیدا کر دئے جائیں کہ وہ بن آئے نہ رہ سکیں۔ اب مرکز ایسی جگہ قائم کیا گیا جس پر راستہ کے ہر آنے جانے والے کی نظر پڑ سکے اور وہ وہاں کی دلچسپیوں سے کنارہ کش ہو کر نہ نکل سکے۔ ریڈیو کا انتظام کیا گیا۔ مصور اخبار نکالے گئے۔ میجک لالٹین سے تصاویر دکھائی جانے لگیں۔ خبروں سے متعلق حاضرین سے گفتگو کی گئی۔ بستی کے بچوں کو دلچسپ دلچسپ کھیل کھلائے گئے۔ اَن پڑھ اور پڑھے لکھے بالغوں اور بچوں کی ایک بڑی تعداد مرکز میں آنے لگی۔ تجربے نے مرکز کے کارکنوں پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ کام شروع کرنے سے پہلے مرکز میں لوگوں کے لئے دلچسپی کا اتنا سامان جمع کر دینا چاہیئے کہ وہ بغیر ارادے کے اس کی طرف کھنچتے چلے آئیں۔ دلچسپی اور کشش کا یہ سامان اتنا متنوع ہونا چاہیئے کہ روزانہ آنے والوں پر اس کی یکسانیت بار نہ ہونے پائے۔

تجربے سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ بالغوں کی تعلیم میں پڑھنے لکھنے پر زیادہ زور نہ دینا چاہیئے۔ مرکز کا ماحول اگر اتنا دلفریب اور دلکش ہو کہ ان پڑھ بالغ اس کی فضا میں رہ کر تھوڑا بہت سیکھ سکے تو یہی فضا بعد میں پڑھنا لکھنا سیکھنے کا سبب بن جاتی ہے۔ اَن پڑھ بالغوں کو روزی حاصل کرنے کے لئے اتنا زیادہ کام کرنا پڑتا ہے کہ وہ پابندی کے ساتھ باقاعدہ تعلیم کے لئے وقت نہیں نکال سکتے۔ ان کے پاس فرصت کا وقت بہت کم ہوتا ہے جو اُن کی تفریح کے لئے بھی کافی نہیں ہوتا۔ اس لئے بالغوں کی تعلیم کا کوئی ایسا نظام ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا جو اپنے طلباء سے وقت کی پابندی کا طالب ہو۔ یا جس کی مدت تعلیم چند ماہ سے زائد ہو۔ بالغوں میں کوئی ایسا نظام تعلیم بھی مقبول نہیں

ہوسکتا جس میں تعلیم اور تفریح دونوں کی آمیزش نہ کی جائے۔ ہمارے مدارس شبینہ کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہی تھا کہ وہ ان باتوں کا بالکل خیال نہ رکھتے تھے۔ اُنکی مدت تعلیم زیادہ ہوتی اور وہ اپنے طلباء سے روزانہ مدرسہ میں حاضر ہونے کے طالب رہتے تھے۔ اس کے علاوہ ان میں خشک تعلیم کے علاوہ دل چسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ بالغوں کی تعلیم کا کام تو صرف وہ لوگ کرسکتے ہیں جو ان کی روزانہ کی زندگی سے دلچسپی لے سکیں اور اُن کے لئے تفریح اور دلچسپی کا سامان پیدا کرتے رہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھیں اس طرح پڑھائیں کہ وہ تھوڑی دیر کی تعلیم کے بعد اپنی تعلیم کے مفید نتائج محسوس کرنے لگیں۔ بالغوں کے لئے حرف شناسی کی ایسی تعلیم بالکل مناسب نہیں جو کئی ماہ کی مسلسل کوششوں کے بعد انھیں صرف یہ بتا سکے کہ وہ پڑھنا لکھنا سیکھ سکتے ہیں۔ انھیں تو ایسے طریقۂ تعلیم کی ضرورت ہے جو بہت جلد حرف شناس کرسکے اور قلیل سے قلیل مدت میں پڑھنا لکھنا سکھا دے۔ اور اس کے بعد انھیں اس کا موقع دے اور ایسا سامان پیدا کرے کہ وہ اپنی مدد آپ کرنے کے اصول پر تعلیم جاری رکھ سکیں۔

پڑھنا لکھنا سکھانے کا تجربہ

اُن پڑھ بالغوں کو پڑھنا لکھنا سکھانے کے لئے ادارہ نے خدمت کے عہد کی اسکیم کا تجربہ شروع کیا۔ بستی کے تعلیم یافتہ لوگوں سے یہ عہد لیا گیا کہ ان میں سے ہر ایک سال بھر میں کم از کم ایک اَن پڑھ کو پڑھنا لکھنا سکھا دے۔ اور اَن پڑھ بالغوں سے یہ وعدہ لیا گیا کہ وہ سال بھر میں کسی سے پڑھنا لکھنا سیکھ لیں۔ یوں تو یہ اسکیم بہت سادہ عام فہم اور خوش نما تھی۔ بستی کے سب لوگوں نے بلا تفریق عالم و عامی اس خیال کی داد دی اور جہالت سے نبرد آزما ہونے کے لئے اسے بہترین حربہ قرار دیا۔ لیکن اس کا عملی پہلو کچھ زیادہ کامیاب نہ رہا۔ جن لوگوں نے خدمت کا عہد کیا تھا اُن کی ایک بڑی تعداد کو یہ شکایت رہتی کہ انھیں طالب علم نہیں ملتے۔ ان کا کہنا ایک حد تک صحیح بھی تھا۔ ہمارے ملک میں

گو ان پڑھ بے شمار ہیں لیکن ایسے جن میں علم کی واقعی طلب ہو کمیاب ہیں۔ اس کے علاوہ تعلیم یافتہ طبقہ میں جن سے خدمت کا عہد لیا گیا تھا ایسے استاد بھی نہیں ملتے جن میں پڑھانے کی سچی لگن ہو اور جو پابندی کے ساتھ روزانہ اس نیک کام کے لئے وقت نکال سکیں۔ اور اَن پڑھ بالغ کی بے قاعدگی کو جو اکثر حالات میں ناگزیر ہوئی درس و تدریس کو ختم کرنے کے لئے بہانہ نہ بنائیں۔ ادارۂ تعلیم و ترقی کے کارکنوں کی سرگرم جدوجہد کا یہ نتیجہ تو بے شک نکلا کہ بستی میں عہد کرنے والوں اور وعدہ کرنے والوں کی ایک اچھی خاصی جماعت تیار ہو گئی لیکن مشکل یہ پیش آئی کہ ان میں سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ قطب کی طرح قائم رہا۔ نہ پیاسا کنویں کے پاس آیا اور نہ کنویں نے پیاسے کا رُخ کیا۔ کبھی کبھار دونوں میں ملاپ ہوا بھی تو وہ زیادہ دن تک قائم نہ رہ سکا۔ ادارے کے کارکنوں کا خیال ہے کہ اس اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے وعدہ اور عہد کرنے والے دونوں کو یاددہانی کرتے رہنے کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ عہد اور وعدہ کرنے کی مدّت سال بھر نہ ہونی چاہیئے بلکہ سال میں مناسب موقع پر ایک دو مرتبہ دو تین ماہ کے لئے پڑھنے پڑھانے کے منصوبے چلائے جائیں اور ان میں مرکز کی طرف سے عہد اور وعدہ کرنے والوں کو ہر ممکن مدد دی جائے۔ ایسا کرنے کے لئے ایک بڑے نظام کی ضرورت ہے جس کی ذمّہ داری لینے کے لئے ابھی تک ادارہ اپنے کو تیار نہیں پاتا۔ اس لئے وہ اَن پڑھ بالغوں کو حرف شناسی کی تعلیم دینے کے لئے مرکز میں کبھی کبھی تعلیمی حلقے قائم کرتا ہے۔ یہ حلقے مرکز کے ناخواندہ آنے والوں کو شوق دلا کر وقتاً فوقتاً جاری کئے جاتے ہیں۔ اور انھیں چالیس سبق میں جو دو ماہ کی مدّت میں ختم ہوتے ہیں، پڑھنا لکھنا سکھا دیا جاتا ہے۔ ان حلقوں کے علاوہ بستی کے جو لوگ پڑھنا لکھنا سیکھنا چاہتے ہیں وہ مرکز کے اوقات میں اپنی سہولت دیکھ کر کسی وقت آجاتے ہیں اور منتظم مرکز سے سبق لیکر چلے جاتے ہیں۔ اس حلقے کے لیے جماعت بندی نہیں ہوتی بلکہ انفرادی توجہ سے کام لیا جاتا ہے۔

تعلیمی مرکز کا حلقہ اثر

ابتدا میں مرکز کے کارکن یہ سمجھتے تھے کہ اپنے کام کی خاطر بستی کے لوگوں کو صرف خواندہ (تعلیم یافتہ) اور ناخواندہ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اور انہی دونوں سے مرکز کو اپنے کام کے سلسلے میں تعلق رکھنا پڑتا ہے۔ ایک سے مدد لی جاسکتی ہے اور دوسرا امداد کا مستحق ہے۔ لیکن تجربے سے یہ پتہ چلا کہ یہ تقسیم ناکافی ہے اور اس سے عام تعلیم کے کام میں فائدے کی بجائے اکثر نقصان ہوتا ہے۔ جو لوگ حرف شناس نہیں ہیں انھیں تو ناخواندہ لوگوں کے زمرہ میں رکھا جاسکتا ہے لیکن جو حرف شناس ہیں اور تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا سیکھ چکے تھے اور اب بھولتے جارہے ہیں انھیں ناخواندہ کہنا ٹھیک نہیں۔ ان کے مسائل ناخواندہ لوگوں سے بالکل مختلف ہیں۔ اس لئے انھیں 'کم خواندہ' کے لفظ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ انھیں فوری توجہات کا مستحق سمجھنا چاہیئے تاکہ وہ پڑھنا لکھنا بالکل بھول جائیں۔ اس سے اوپر ایک طبقہ وہ بھی ہے جو اردو کی کتابیں پڑھ لیتا ہے اور اس کی معلومات پہلے دو طبقوں کے مقابلے میں ذرا زیادہ ہوتی ہیں۔ لیکن پھر بھی اسے تعلیم یافتہ گروہ میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ اسے 'خواندہ' کہنا چاہیئے۔ تعلیم یافتہ طبقہ صرف ان لوگوں پر مشتمل سمجھنا چاہیئے جنھوں نے اسکولوں اور کالجوں میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے۔ ناخواندہ، کم خواندہ، خواندہ اور تعلیم یافتہ یہ چار طبقے بالغوں کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن عام تعلیم کا کام کرنے والوں کو چاہیئے کہ بچوں کو بھی اپنے حلقۂ اثر میں شامل سمجھیں کیونکہ شبینہ مدارس کی ناکامی کا اکثر سبب وہ بچے بھی بن جاتے ہیں جن کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ ان پڑھ بالغوں کو جب تعلیم کی ترغیب دلائی جاتی ہے اور وہ مدارس شبینہ میں آتے ہیں تو اپنے ساتھ ان بچوں کو بھی لے آتے ہیں۔ مدرسہ میں بچوں اور بڑوں کے یکجا ہوجانے سے تنظیم اور طریقۂ تعلیم میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔ ان بچوں کے علاوہ، مرکز کی دلچسپیوں کو دیکھ کر وہ بچے بھی آجاتے ہیں جو دن میں کسی

مدرسہ میں پڑھتے ہیں اور شام کے وقت اُنھیں مشغول رکھنے کا کوئی انتظام موجود نہیں ہے تعلیم بالغان کا کام کرنے والوں کے لئے ان کی نگرانی ایک بڑا مسئلہ بن جاتی ہے۔

ان سب تجربات نے ادارہ کے کارکنوں کو اس حقیقت پر متنبہ کیا کہ عام تعلیم کا کام صرف اسی وقت صحیح طریقہ پر انجام دیا جا سکتا ہے جب اس مہم میں بستی کے ناخواندہ، کم خواندہ، تعلیمیافتہ لوگوں بچوں اور مدرسہ و کالج کے طالب علموں سب کی ہمدردیاں حاصل کی جائیں۔ ان میں سے ہر طبقہ کی ہمدردی حاصل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ تعلیمی مرکز میں ان سب کی دلچسپیوں کا خیال رکھا جائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو جو لوگ مدد کے مستحق ہیں وہ اپنی تعلیم کے لئے تیار ہو جائیں گے اور جو مدد دے سکتے ہیں وہ مدد دینے میں کسی قسم کی کوتاہی نہ برتیں گے۔

بالغ مبتدی اور اُن کا لٹریچر

تجربے نے یہ بتایا کہ جو لوگ بچپن میں پڑھنا لکھنا سیکھ چکے ہوتے ہیں لیکن انھیں اپنی خواندگی کو تازہ رکھنے کا موقع نہیں ملتا وہ تعلیم و ترقی کے سلسلے میں سب سے زیادہ مفید ہو سکتے ہیں۔ اس خواندہ طبقہ کو تعلیم بالغان کی کنجی سمجھنا چاہیئے۔ یہ تنہا واسطہ ہے تعلیم یافتہ اور جاہل کے درمیان اور یہی واحد ذریعہ ہے علم کو جاہل کے در تک لے جانے اور جاہل کو مدرسہ لے آنے کا۔ ان لوگوں کو مطالعہ کے لئے مناسب کتابیں ملتے رہنا ان کی تعلیم کا بہتر ذریعہ ہے۔ مرکز کے کارکنوں نے اسی لئے اپنے پروگرام میں گشتی کتب خانہ کو بڑی اہمیت دی ہے۔ جو لوگ مرکز میں کتابیں نہیں لے سکتے، ان کے گھروں پر کتابیں پہنچائی جاتی ہیں۔ مرکز کا یہ کام خواندہ لوگوں میں بڑا مقبول ہوا اور اس طرح ہر گھر مرکز کی تعلیمی جد و جہد سے فائدہ اُٹھانے لگا۔

بالغوں کے لئے اردو میں کوئی لٹریچر نہ تھا۔ ادارۂ تعلیم و ترقی نے سب سے پہلے اس طرف توجہ کی اور بالغ مبتدیوں کی دلچسپی اور مذاق و استعداد کو ملحوظ رکھ کر ایک ایسا

سہل اور تدریجی نصاب تیار کیا جس سے خواندگی کی مشق ہوتی ہے کتب بینی کا شوق پیدا ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس طرح ایک اَن پڑھ آدمی پڑھنا لکھنا سیکھنے کے بعد کسی اُستاد کی مدد کے بغیر کتب خانہ تعلیم و ترقی کے ذریعہ اپنی تعلیم کو آپ جاری رکھ سکتا ہے۔ پڑھنے لکھنے کی مشق جاری نہ رہنے سے لوگ پڑھ لکھ کر سب بھول جاتے ہیں اور اس طرح پڑھنے والے اور پڑھانے والوں دونوں کی محنت ضائع جاتی ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر ادارہ نے سلسلۂ تعلیم ترقی کے رسائل کا ایک خاکہ تیار کیا جس میں سے کوئی دو سو رسالے شائع ہو چکے ہیں اور کچھ زیر ترتیب ہیں یا چھپنے کے لئے تیار ہیں۔ ان رسالوں کے علاوہ ادارہ نے اپنے قاعدے اور پڑھنا لکھنا سکھانے کا سامان بھی تیار کیا ہے۔

اس نصاب کے علاوہ ادارہ نے تعلیمی کتبوں اور تبلیغی مطبوعات کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ کتبوں میں اسلامی تعلیمات، سیاسی اور اقتصادی حالات، مدنی اور سماجی زندگی کے متعلق سبق آموز اور مفید معلومات، دلآویز عبارتوں اور جاذب نظر نقشوں کے ذریعہ پیش کی جاتی ہیں۔ یہ کتبے مساجد، مکاتب، مدارس، کتب خانوں، دارالمطالعوں اور انجمنوں وغیرہ کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔ اس لئے کہ بالغوں کے اجتماع کے یہی بڑے بڑے مرکز ہیں۔ اور تعلیم کے مرکز بھی بن سکتے ہیں۔ ان کتبوں کے علاوہ حالات کو پیش نظر رکھ کر وقتاً فوقتاً مختلف قسم کی ہدایات، تعلیمات اور معلومات سادہ اور سہل زبان میں خوبصورت چھپوا کر بستی میں گھر گھر تقسیم کی جاتی ہیں۔ اور اس طریقے سے خواندہ اور ناخواندہ سب لوگوں تک ضروری ہدایات اور تعلیمات پہنچا دی جاتی ہیں۔ جو لوگ خود نہیں پڑھ سکتے وہ کسی دوسرے سے پڑھوا کر ضرور سن لیتے ہیں۔

عام تعلیم کے ذرائع عام تعلیم کے لئے وقتاً فوقتاً تقریروں کا انتظام کیا گیا۔

تاکہ جو لوگ مرکز کی کتابوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے اور تعلیمی حلقوں میں بھی شریک نہیں ہو سکتے وہ زبانی تعلیم سے فائدہ اٹھا سکیں۔ مرکز کے جلسے کے علاوہ علاقہ کی مسجد میں بھی مذہبی تعلیم کا انتظام کیا گیا اور رمضان المبارک میں بعد نماز فجر اکثر قرآن پاک کا ترجمہ بھی ہوتا رہا ہے۔

تعلیمی مرکز کی روزانہ دلچسپیوں میں اس کے دیواری اخبار اور کتبے ہیں۔ جنگ کے زمانہ میں ایک مصور اخبار 'جنگ' روزانہ شائع ہوتا رہا۔ جنگ سے عوام کو بھی چونکہ دلچسپی تھی اس لئے اس اخبار کی بدولت مرکز میں آنے والوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر باتوں باتوں میں لوگوں کو تاریخ، جغرافیہ، تمدن و مذہب آزادی اور غلامی اور موجودہ معاشی نظام کے متعلق موٹی موٹی باتیں کچھ تو اخبار کے ذریعہ اور کچھ تقریروں کے ذریعہ سمجھائی جانے لگیں۔ اس سلسلہ میں جغرافیائی، معاشی اور مدنی زندگی سے متعلق ہر قسم کے نقشے، تصاویر اور چارٹ جمع کئے گئے۔ رفتہ رفتہ مرکز کی ان دلچسپیوں میں ناخواندہ، کم خواندہ اور مدرسوں، کالجوں کے طالب علم اور بچے سب ہی حصہ لینے لگے۔

ان تمام دلچسپیوں کے علاوہ کبھی مقامی کاریگروں کے کام کی نمائش کی گئی اور کبھی علاقہ کے بچوں اور بڑوں میں مضمون نویسی وغیرہ کے مقابلہ کا انتظام کیا گیا۔ بستی کے لوگوں کے ڈرامے بھی کرائے گئے۔ مرکز کی نگرانی میں بستی کے پڑھے لکھے نوجوانوں کی تنظیم کی گئی جنھوں نے تحریر، تقریر، کھیل و تفریح اور ڈراموں کے لئے اپنے مذاق کے مطابق انجمنیں بنائیں۔

بستی کے بچے

بستی کے بچے مرکز قائم ہونے سے پہلے اپنے فارغ اوقات میں آوارہ پھرتے تھے اور ان کو مصروف رکھنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ رات کو مرکز میں آکر یہ بچے بڑی شرارتیں کرتے تھے۔ ادارہ نے بستی کے بچوں

کو مشغول رکھنے کے لئے مختلف تدبیریں کیں۔ ان کے لئے غروب آفتاب کے بعد چھوٹے چھوٹے تعلیمی کھیلوں کا پروگرام شروع کیا گیا اور فرصت کے اوقات کے لئے میدانی کھیلوں کی ٹیمیں تشکیل کی گئیں۔ اب بچوں کے یہ سب کام تعلیمی مرکز جامعہ کلب کی نگرانی میں انجام پاتے ہیں۔ اس کلب میں بچوں کے لئے مختلف کھیلوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ ان کی تحریر و تقریر کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے ان میں پیام برادری کی ایک شاخ کھول دی گئی ہے اور خدمت کے جذبہ کو ترقی دینے کے لئے انھیں جامعہ اسکاؤٹ کی تنظیم میں شامل کیا جاتا ہے۔ اس طرح ایک طرف تو تعلیمی مرکز بالغان کے کام میں بچوں کی وجہ سے جو رکاوٹیں پیدا ہو جاتی تھیں وہ دور ہو گئیں اور دوسری طرف بستی کے بچوں کو فرصت کے اوقات میں مصروف رکھنے کا مسئلہ حل ہو گیا۔

تعلیمی مرکز ہال

ادارۂ تعلیم و ترقی اپنے عام تعلیم کے کام میں تعلیم یافتہ طبقہ کو بھی شریک کرنا چاہتا ہے۔ ان کے مذاق اور دلچسپیوں کا لحاظ کرکے اس نے تعلیمی مرکز ہال قائم کیا ہے۔ جامعہ کے کارکن سمجھتے ہیں کہ تعلیم کا مقصد یہی نہیں ہے کہ اسکولوں میں بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیا جائے یا کالجوں اور یونیورسٹیوں میں انھیں گنتی کی چند کتابیں پڑھا دی جائیں۔ پڑھے لکھے لوگوں اور تعلیم یافتہ حضرات کو اپنے علم کو تازہ رکھنے اور ترقی پذیر زندگی کے نئے گوشوں اور پہلوؤں سے واقفیت بہم پہنچانے کے مواقع فراہم کرنا بھی کسی تعلیمی نظام کے لئے بہت بڑا منصب ہے۔ تعلیمی مرکز ہال اس ضرورت کو پورا کرنے کی ایک کوشش ہے کے ذریعہ تعلیم یافتہ حضرات کے لئے اجتماعی زندگی کی دلچسپیوں کا سامان پیدا کرنے کے ہ اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ اجتماعی زندگی ان کے لئے تعلیم کا ذریعہ بن جائے۔ اس سلسلہ میں دارالمطالعہ اور کتب خانہ کی ابتدا کردی گئی ہے۔ تصنیف و تالیف کا

ذوق رکھنے والوں کے لئے حلقۂ علم وادب کی تشکیل کی گئی ہے تاکہ وہ اپنے ذوق کے مطابق مطالعہ کرسکیں اور حلقے کی نشستوں میں اپنے نتائج فکر و مطالعہ کا اظہار کرسکیں تعلیمی مرکز ہال کے ماتحت علمی، تعلیمی اور تہواری جلسے بھی منعقد کئے جاتے ہیں اور شعراء کا کلام سننے کے لئے مشاعروں وغیرہ کا بھی انتظام ہوتا ہے۔ کبھی کبھی موسیقی کے مذاق کی تربیت کے لئے محفل موسیقی بھی گرم کی جاتی ہے۔ مختلف قسم کے فرشی اور میدانی کھیلوں، ورزشی اکھاڑوں کا انتظام اور کھیلوں میں زندگی پیدا کرنے کے لئے ٹورنامنٹ کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ ہال کے کارکنوں کی کوشش ہے کہ وہ بہت جلد اپنی بستی کی علمی، ادبی، تفریحی، تعلیمی اور شہری و مدنی ہر طرح کی خدمات انجام دینے کے قابل ہو جائیں۔

جامعہ کے کارکن اپنے تعلیمی تجربات کی روشنی میں یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کے تعلیمی مسائل اسکولوں، کالجوں، یا تعلیم بالغان کے مدارس شبینہ کے قیام سے حل نہیں ہوسکتے۔ تعلیم کے ان تمام میدانوں میں اگر جدا جدا کوششیں کی بھی گئیں تو اس سے عام تعلیم کے مقاصد ہرگز حاصل نہیں ہوسکتے۔ کسی بستی میں عام تعلیم صرف ایسی صورت ہی میں رواج پاسکتی ہے جب اس کا تعلیمی مرکز ہر قسم کی تعلیم کا انتظام کرے اور اس کے ذریعہ بستی کی تمام تعلیمی اور تمدنی ضروریات پوری ہوسکیں۔ کسی بستی میں اس قسم کا مرکز قائم ہونے سے اس کے باشندوں کی صرف معلومات میں اضافہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اجتماعی زندگی کے مسائل کی عملی تعلیم بھی حاصل کرسکتے ہیں۔

جامعہ ملیہ کا ادارۂ تعلیم و ترقی تعلیمی مرکز کے مختلف کاموں میں تجربے کر رہا ہے اور اس کے حلقۂ اثر کو زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی کر دینا چاہتا ہے۔ اس کے کارکن چاہتے ہیں کہ ہر بستی میں اس قسم کے تعلیمی مرکز قائم کئے جائیں۔ بستی کے لوگ اپنا تعلیمی مرکز اپنی خوشی سے خود بنائیں۔ اپنے خرچ سے چلائیں اور خود ہی اس کا انتظام بھی کریں

جامعہ اپنے تعلیمی مرکز کو ایک نمونہ کا مرکز بنانا چاہتی ہے جس میں ناخواندہ، کم خواندہ خواندہ، تعلیم یافتہ، بچوں اور نوجوانوں کی عام تعلیم کا سامان موجود ہو۔

اس قسم کے تعلیمی مرکز چلانے کے لئے کام کرنے والوں کو جس تربیت کی ضرورت ہے وہ بھی جامعہ کے پیش نظر ہے۔ اب تک اُسے وسائل نے اجازت نہیں دی کہ وہ اپنی نگرانی میں کارکنوں کے لئے کوئی تربیتی مرکز قائم کرسکے۔ اس کی مکافات ادارۂ تعلیم و ترقی اپنے تجربات اور تعلیم و ترقی سے متعلق مفید معلومات وقتاً فوقتاً شائع کرکے کرتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں اب تک کئی رسالے شائع ہو چکے ہیں اور وہ بالغوں کی تعلیمی خدمت کرنے والوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوئے ہیں۔ مرکز کا انتظام و اہتمام کرنے والوں کے لئے ایک مختصر نصاب بھی تیار کیا گیا ہے اور یہ کوشش ہے کہ بہت جلد اس نصاب کے مطابق کارکنوں کی تربیت کا بھی انتظام کیا جائے۔ کارکنوں کی تربیت کا موقع ملنے اور حالات سازگار ہونے پہ جامعہ کے کام کرنے والے اس تحریک کو ہندوستان کے ہر شہر اور ہر قصبے ہر گاؤں اور ہر محلے تک پہنچا دینا چاہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قوم کی تعمیر نو کے تمام منصوبے تعلیمی مرکزوں کی بنیاد ہی پر استوار ہو سکتے ہیں۔

تدریس اور زائد نصاب مصروفیات

تدریس کا مفہوم | طلبار کو محض واقفیت یا علمی مواد یا کتابی معلومات بہم پہنچانا یا بیرونی دنیا کے مظاہرات کے متعلق ضروری واقفیت ذہن نشین کراتا ہے۔ یا عام خیال کے موجب ارباب تعلیمات کا مرتبہ نصاب اس طرح طلبار کو ذہن نشین کرادینا کہ وہ بجنسہ امتحانات کے موقع پر ظاہر کر دیں۔

زاید نصاب مصروفیات | اس سے مراد ایسے تربیتی مصروفیات ہیں جس میں حصہ لے کر طالب علم اپنی زندگی سنوارتا ہے اور اپنی سیرت اور کردار کی اصلاح کرتا ہے۔ دنیاوی امور اور ماحول کو سمجھ کر اپنے مفید مطالب و منشا، کام میں لاتا ہے۔ بنی نوع انسان کے ساتھ عمدہ اور اچھے تعلقات قائم کرتا ہے۔ غرض زائد نصاب مصروفیات وسیع معنوں اور مفہوم میں تعلیم کی تعریف میں آسکتے ہیں۔ جس کا ایک جز تدریس ہے۔

تعلیمی دنیا میں تدریس اور زائد نصاب مصروفیات کی افادیت کے متعلق خوب گرما گرم بحثیں ہو رہی ہیں۔ بعض اصحاب مصر ہیں کہ تدریس زائد نصاب مصروفیات سے زیادہ مفید ہے۔ اور بعض اصحاب کی یہ رائے ہے کہ زائد نصاب مصروفیات تدریس سے زیادہ سود مند ہیں۔ عموماً جب دو مکاتیب خیال میں تنازعہ واقع ہوتا ہے تو حقیقت یہ رہتی ہے کہ ان دونوں کا درمیانی راستہ ہی صحیح رہتا ہے۔ اسی طرح میرے خیال میں نہ صرف تدریس ہی مفید ہے اور نہ صرف زائد نصاب مصروفیات بلکہ ان دونوں کا لطیف امتزاج ہی کامیاب و بامراد زندگی کا ضامن ہے۔

اب ہم ذیل میں تدریس اور زائد نصاب مصروفیات کے حامیوں کے نقاط نظر کا مطالعہ کریں گے ۔

حامیان تدریس کے نقاط نظر (۱) تدریس بذات خود اتنی مکمل ہوتی ہے کہ اس پر اور زائد نصاب مصروفیات کا بار ڈالا جائے تو طلبار کے دماغ اس کے متحمل نہ ہوں گے ۔ جس کی وجہ سے وہ سب کچھ بھول جائیں گے ۔ قدیم زمانے کے طلبار میں جو ٹھوس قابلیت پائی جاتی تھی ، اس کی وجہ یہ تھی وہ طلبار صرف تدریس سے استفادہ کرتے اور اس کو اپنے دماغوں میں محفوظ رکھتے تھے ۔

(۲) تدریس کے دوران میں طلبار جو نظم وضبط اطاعت اور فرماں برداری سیکھ سکتے ہیں ، وہ کسی اور مصروفیت میں نہیں سیکھ سکتے ۔

(۳) مضامین کی تعلیمی اہمیت اور ان کے ارتباط سے طلبار میں سیرت سازی جس کمال سے سکھائی جاتی ہے ، اتنی کسی اور مصروفیت سے نہیں ہو سکتی ، یہ سیرت نہایت مستحکم اور پائدار ہوتی ہے ، کیونکہ ان کی بنیاد میں علم ہی علم رہتا ہے ۔

(۴) زاید نصاب مصروفیات عموماً (۱) جوشیلے اساتذہ کی کمیابی (۲) قبل از قبل غیر تجویز شدہ زاید نصاب مصروفیات کا انعقاد ۔ (۳) طلبار کو مصروفیت سے ہم آہنگ بنانے میں اُن کی دلچسپی کا عدم لحاظ (۴) تنظیم مدرسہ کا عدم تعاون ، غرض ایسے امور ہیں جن کی وجہ سے یہ مصروفیات بذات خود کتنے ہی مفید ہوں لیکن اُن کے اثرات طلبار پر بُرے پڑتے ہیں ۔ اور وہ بسا اوقات مضر ثابت ہوتے ہیں ۔

(۵) زائد نصاب مصروفیات میں طلباء ایسی آزادی کا سانس لیتے ہیں جو استاد اور شاگرد کے رشتہ کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے ۔ چنانچہ انھیں زائد نصاب مصروفیات کی وجہ فی زمانہ استادی اور شاگردی کے مراتب عنقا ہو گئے ہیں ۔

زائد نصاب مصروفیات کے حامیوں کے نقاط نظر (۱) زائد نصاب مصروفیات کے

ذریعہ طالب علم دوستی کے روابط سیکھتا، اور سماجی ماحول کو سمجھ کر اپنے کو اس کے مطابق بناتا ہے۔ تمام اقسام کی انجمنیں اور ورزشی مقابلوں، ادبی و تعلیمی رسالوں اور ڈراموں اور کشافہ وغیرہ میں حصہ لینے سے اس کی عملی اور کلچری زندگی سدھر جاتی ہے اور اس کو لوازم ہونے کا موقعہ میسر آجاتا ہے، مہارت پسندی، اعتماد ذات خودداری، قوت عمل جدت پسندی اور صحیح قیادت جیسے مفید اور پسندیدہ خصائل پیدا ہوتے ہیں اور سماجی سرگرمیوں کی شرکت سے اس میں سماجی اور اخلاقی اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔

(۵) نفسیاتی نقطۂ نظر سے اب یہ تسلیم کیا جانے لگا ہے کہ ہر ارتسام کے لئے اظہار کا ہونا ناگزیر ہے۔ یعنی کوئی بات اس وقت تک ذہن نشین نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے ردعمل کے طور پر کوئی حرکت اظہاری شکل میں وقوع پذیر نہ ہو۔ اس مطلب کے لئے مدرسے کی انجمن مباحثہ اور انجمن ادبی بے حد مفید ہیں۔ علاوہ ازیں جیمس لانگ کے نظریہ جذبات کے سلسلے میں ڈرامہ سازی سے طلبار کے جذبات کی اصلاح و تربیت میں بہت مدد ملتی ہے۔ جو بچہ فی الحقیقت مہربانی اور فیاضی کے جذبات سے بے بہرہ ہو جب ہماری ترغیب و تشویق کے باعث رسمی طور پر کچھ مہربانی کے کاموں میں حصہ لیتا ہے، تو فی الحقیقت اس میں مہربانی و فیاضی کے جذبات نمودار ہوتے ہیں، چنانچہ اکثر ایکٹروں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ جب وہ مصنوعی طریقے پر جسمانی تغیرات اپنے اوپر وارد کرتے ہیں تو حقیقی جذبات محسوس کرنے لگ جاتے ہیں۔

(۶) معاشی نقطہ نظر سے بھی زائد نصاب مصروفیات بہت اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ ان میں آئندہ اختیار کئے جانے والے پیشے میں مہارت و دسترس پیدا کرنے کے بہت سے مواقع میسر ہیں مثلاً زراعت کا پیشہ اختیار کرنے والا باغبانی میں حصہ لے کر مفید معلومات و تجربات حاصل کرتا ہے، وکالت کا پیشہ اختیار کرنے والے کو انجمن مباحثہ

بہت مفید ثابت ہوگی۔

(۴) معاشرتی نقطہ نظر سے بھی زائد نصاب مصروفیات بہت اہمیت رکھتے ہیں اس وقت جبکہ تعلیم صرف اعلیٰ طبقہ کے لئے ہی مختص تھی ہاتھ کی محنت کے مصروفیات ناموزوں اور باعث عار تصور کئے جاتے تھے۔ مگر اب جبکہ تعلیم امرار کی اجارہ داری سے آزاد ہو کر ہر کس و ناکس یعنی عوام کے لئے کھل گئی ہے تو زائد نصاب مصروفیات کی اہمیت بھی بہت بڑھ گئی ہے۔ بلکہ نری کتابی تعلیم کی خامیوں کو دور کرنے کے لئے یہ ازبس ضروری ہیں چنانچہ وردھا اسکیم، میکنزی اسکیم اور سارجنٹ اسکیم میں زائد نصاب مصروفیات کو خاص مقام حاصل ہے۔

نصابی مصروفیات میں طالب علم صرف کتابی مواد کو اپنے دماغ میں جگہ دیتا ہے جو دراصل خیالی دنیا ہوتی ہے، اس سے باہر نکل کر جب وہ عملی دنیا میں داخل ہوتا ہے، اور کارزارِ حیات سے سابقہ پڑتا ہے تو اس کو قدم قدم پر ٹھوکریں کھانا پڑتا ہے اور ان ٹھوکروں کی اذیت سے وہ سب کچھ بھی بھول جاتا ہے جو کتابی دنیا میں حاصل کیا تھا اور عملی دنیا میں اپنے کو ناکارہ اور نا اہل تصور کرنے لگتا ہے۔ برخلاف اس کے جو طالب علم زائد نصاب مصروفیات میں حصہ لیتے ہیں، اور جب عملی دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو ان کو یہ دنیا کوئی نئی دنیا معلوم نہیں ہوتی بلکہ وہ بے خطر راہِ ترقی پر گامزن ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی زندگی کو بامراد بنانے میں کامیاب رہتے ہیں۔

نصابی معروفیات میں طلبار کو بنا بنایا ہوا مواد مل جاتا ہے اور مدرس اپنی کارگذاری کو ظاہر کرنے کے لئے ایسے مواد کی فراہمی میں اپنی ساری صلاحیت اور توانائی صرف کر دیتا ہے جس کی وجہ سے طالب علم کی فطری صلاحیتوں کو اجاگر ہونے کا موقع ہی نہیں ملتا اور وہ تمام صلاحیتیں عدم استعمال کے باعث بے کار ہو کر مردہ ہو جاتی ہیں اور طالب علم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دوسروں کی مدد کا محتاج رہتا ہے۔ برخلاف اس کے زائد نصاب

مصروفیات میں طالب علم خود غور اور فکر کرتا ہے ، اور خود منصوبہ تیار کرتا ہے ، اور اُس پر عمل پیرا ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس میں خود فضلیت کی عادت پڑ جاتی ہے جو کہ ایک کامیاب زندگی کا جوہر اصلی ہے ۔

نصابی مصروفیات اور زائد نصاب مصروفیات کی افادیت میں بین اور نمایاں فرق محسوس کرنے کے لئے ہم کو چاہئے کہ پہلے ایک ایسا قطعہ فرض کریں جس میں طلبار صرف نصابی مصروفیات میں فارغ التحصیل ہو کر داخل ہوئے ہیں ۔ ایسے طلبار کی یہ کیفیت ہوگی کہ چند دنوں تک تو اپنے علمی انہماک میں کارزار حیات کو بالکل بھول جائیں گے ۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی یہ بھول اُن کے علمی انہماک کو بھلادے گی ، اور روزگار کی تلاش میں یہ اپنے کو اپاہج اور ناکارہ پائیں گے اور بہت جلد ایسے قطعہ کو خیرباد کہنے پر آمادہ نظر آئیں گے ، اور بانگ دہل اعلان کر دیں گے کہ بی ۔ اے بناکے مری مٹی خراب کی ، اور معترف ہوں گے کہ ان کی نصابی تعلیم غیر مکمل ہے ۔ اور اس کی تکمیل کے لئے زائد نصاب مصروفیات ازبس ضروری اور لازمی ہیں ۔ برخلاف اس کے اگر ہم ایسے قطعہ پر نظر ڈالیں جہاں کے طلبار زائد نصاب مصروفیات میں حصہ لینے کے بعد داخل ہوئے ہیں تو ان کی یہ کیفیت ہوگی کہ اس قطعہ میں چین کے ساتھ آرام اور آسائش کی زندگی گذاریں گے کیونکہ ان غیر تدریسی مشاغل سے ان کی مخصوص دلچسپیوں کی خاطر خواہ تربیت ہوتی رہی اور اوقاتِ فرصت کی بسر بر دکے لئے موزوں لوازمہ بہم پہنچا ہے ، اور تلاش معاش میں کوئی دقت نہیں ہے ۔ کیونکہ ان کے ہاتھ پیر شل نہیں ہوگئے ہیں ۔

پس اب ہم نصاب اور زائد نصاب مصروفیات کا جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ایک دوسرے کا ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ تدریس اگر ایک ہے تو زاید نصاب مصروفیات اس کی تراش و خراش ہے جو اس کو پرستشی بت بنا دیتی ہے ۔

غلطی کا احساس

آدھی رات کے وقت جب کل کائنات سکوت اور سیاہی میں ڈوبی ہوتی ہے تو زمین کا سینہ اُبھرتا ہے اور وہ اپنے بازو پھیلا دیتی ہے اور پکارتی ہے۔" اے میرے محبوب آ۔ آ اور میرے سینے سے لگ جا۔"

ستارے ڈھلکتے ہیں، شبنم آہستہ آہستہ آسمانوں سے اترتی ہے اور زمین سے بغلگیر ہو جاتی ہے، زمین آہستہ آہستہ جھولتی ہے اور شبنم اس کے سینے پہ سر رکھ کر سو جاتی ہے۔

صبح کے وقت جب سورج افق کی چلمن ہٹا کر جھانکتا ہے اور کھیتوں میں ہوا سرسراہٹ پیدا کرتی ہوئی چلتی ہے تو شبنم اپنی نورانی آنکھ کھولتی ہے۔

"آہ میں کہاں ہوں" وہ چلاتی ہے۔ "اُف میرے اللہ! آسمان کس قدر بلند ہے! کیا میں ایسے زوال پذیر جذبے کے لئے اپنے نشیمن سے ٹوٹ گری ہوں۔" اس طرح کہتی ہوئی وہ سورج کی کرن کے ساتھ لٹک جاتی ہے۔

پھول اپنی پنکھڑیاں اس کو لینے کے لئے پھیلا دیتے ہیں۔ سمندروں کی موجیں اس کو گود میں لینے کے لئے اچھلتی ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیاں اس کی راہ روکنے کے لئے بلند ہو جاتی ہیں۔ لیکن ——— وہ اپنے گھر بلند آسمانوں کی طرف اڑ جاتی ہے۔

جیلانی

آخری رشتہ

کئی دن سے رہ رہ کر مجھے بہن کی یاد آ رہی تھی چھوٹی بہن کو بچپن سے پیار میں ہم سب بنو کہا کرتے۔ ان کا چھوٹا بچہ جب میں نے اسے دیکھا گود میں پڑا ہمکا کرتا تھا۔ اب اللہ رکھے گھر بھر میں دوڑا دوڑا پھرتا ہوگا۔ پیاری پیاری باتیں کرتا ہوگا جی چاہتا ہے کہ پر لگا کر اُڑ جاؤں اور سب کو دیکھ آؤں۔ آخر ہمیں بھی کبھی گھر کے دھندوں سے فرصت پا کر آزادی کی فضا میں سانس لینا چاہیئے۔ چار دن گھوم پھر کر جی کچھ اور سے اور ہو جاتا ہے اور پھر جب بہن کی محبت کھینچے تو بھلا کون روک سکتا ہے۔ جب میں پہنچی تو بنو "ارے بجیہ آ گئیں" کہہ کر گلے سے لپٹ گئیں۔ بچے اِدھر اُدھر سے خالہ جان خالہ جان کہتے ہوئے دوڑے اور چمٹ گئے۔ ایک دم خوشی کا ایک دریا سا اُمنڈ پڑا۔ اور وہ چھوٹا شیطان شرفو جسے دیکھنے کا مجھے سب سے زیادہ اشتیاق تھا آیا کی انگلی پکڑے بڑی شان اور آن بان سے ذرا الگ ہی کھڑا مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا اور جب میں دیکھتی تو آنکھیں چرا کر منہ پھیر لیتا۔ آیا میری طرف بڑھی اور جھک کر بڑے ادب سے "سلام بیٹا صاحب" کہا۔ چھوٹا سا قد گندمی رنگ۔ بال سفید جن میں کہیں کہیں سیاہی جھلک رہی تھی۔ مٹیالی آنکھیں پلکیں قریب قریب غائب، ڈھیلا پاجامہ لمبا کرتا پہنے تھی کرتے میں سامنے بڑا سا پیوند لگا ہوا۔ دوپٹہ کا کونا کمر میں کھسا ہوا۔ بچے کو میری طرف لاتے ہوئے بولی۔

"آداب کرو بیٹا۔ تمہاری خالہ جان ہیں۔"

میں نے گود میں اٹھا لیا۔ بس ذرا ہی دیر میں تکلف برطرف وہ مینا کی طرح چہکنے لگا میرا سات سال کا لڑکا شمو میرے ساتھ آیا تھا اسے بچے کی ہر بات اور ہر ادا پر بے اختیار ہنسی آرہی تھی وہ لوٹ پوٹ ہوا جا رہا تھا۔ سب بچے آپس میں گھل مل کر آیا کی نگہبانی میں کھیل کود رہے تھے۔ میں اطمینان کے ساتھ بہن کے پاس بیٹھ گئی۔ ادھر ادھر کی باتیں چھڑ گئیں اپنی پرائی آپ بیتی۔ بلکہ اس سے پہلے میرے بہنوئی عارف میاں بھی دلچسپی سے شریک رہے۔ پھر کتاب اٹھا لی اور انھیں دنیا و مافیہا کی خبر ہی نہ رہی۔ نئی نئی باتوں کا اتنا ذخیرہ تھا کہ کئی دن کی دلچسپی کا سامان تھا۔ ایک دم میری توجہ آیا کی طرف ہوئی میں نے کہا۔

"یہ آیا تو تمھیں خوب مل گئی۔ اس کی وجہ سے تمھیں بہت آرام ہوگا۔ بچے کے لئے ڈھنگ کا آدمی بہت ضروری ہوتا ہے"۔ ....

....

بٹن نے عجیب طرح سے مسکرا کر جواب دیا۔

"ہاں بڑی کوششوں سے ملی ہیں... مگر آرام کم اور کوفت زیادہ ہے۔

"کیوں کیا اچھی طرح نہیں رکھتی ہیں بچے کو ؟

"رکھتی ہی کتنی دیر ہیں۔ اب آپ رہ کر ان کے تماشے دیکھئے..... ایک بجا اور نماز کے لئے رخصت۔ پھر تین بجے اپنی شکل دکھاتی ہیں۔ دو پہر کو جب ذرا آرام کا وقت ہوتا ہے بچے کو مجھے سنبھالنا پڑتا ہے۔ اب تو خیر اتنا بڑا ہوا ہے جب ذرا سا تھا جب سے ان کا یہی ڈھنگ ہے۔ دو پہر سے رات کے بارہ بجے تک نماز کا سلسلہ چلتا ہے۔ اس درمیان میں شاید ہی ذرا دیر وہ کام کرسکتی ہیں۔ دو دو لوٹوں سے وضو کرتی ہیں۔ غسل ایک مرتبہ تو ضروری ہے۔ جاڑے ہوں یا گرمی اور جو ذرا سی نجاست کا شک ہو گیا تو پھر دو تین مرتبہ روزانہ اپنے کپڑے دھوتی ہیں۔ سات سات سجدے کرتی ہیں۔ گھنٹوں وظیفہ چلتا ہے۔ رات کو نیند سے جھوم

جھوم کر جائے نماز پر گرتی ہیں۔

میں بے اختیار ہنس پڑی۔ بٹن نے ہنسکر کہا۔

"اور صبح کو چار بجے، چاہے بچہ سوتا ہو یا جاگتا چھوڑ چھاڑ کر چلی جاتی ہیں اور سورج نکلنے تک اپنے یہی دھندے کرتی رہتی ہیں۔ شروع میں جب یہ رہیں ایک دن صبح کو میں نے ٹوک دیا کہ آیا نماز میں اتنی دیر نہ لگایا کرو۔ پھر ان کا غصہ کوئی دیکھتا "آپ مجھے نماز کو منع کرتی ہیں میں ایسی جگہ نوکری نہیں کرسکتی۔ میں نے بہت سے بچے کھلائے سب اسی طرح۔ کسی نے نماز کو نہیں ٹوکا۔ بڑبڑ ہو چلی تو پارہ کسی طرح اترتا ہی نہیں تھا۔ میں نے کہا خدا کے لئے مجھے گنہگار نہ کرو۔ میں تمھیں نماز کو منع نہیں کرتی میں نے تو صرف اتنی دیر لگانے پر ٹوکا۔ اب بہت، سمجھانے سے تین سجدے کرنے لگی ہیں اور وظیفہ بھی کم کر دیا ہے۔ نماز کے بہانے سے کتنا وقت، تو بھائی کے پاس گذارتی ہیں۔

"بھائی بھی ہیں کوئی؟

"لیجئے اس اقرار پر تو رہی ہیں کہ بھائی ضرور ساتھ رہیں گے۔

اتنے میں چائے آگئی اب ہمارے بہنوئی بھی چونکے اور سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"بھئی چائے بناؤ:

میں نے کتاب ان کے ہاتھ سے لے لی۔

"ہٹاؤ بھی! سے دنیا کی باتیں کرو۔"

انھوں نے ہنس کر اپنی کرسی چائے کی میز کے قریب لاتے ہوئے کہا۔

"اچھا بابی ذرا شمو کو بلوائیے یہ کہاں گئے..... ان سے بھی کچھ دنیا کی باتیں ہو جائیں۔

میں نے شمو کو آواز دی اب سب بچے ان کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ ان سب کی دل چسپ باتوں ہنسی اور چہچہوں کے ساتھ چائے کا لطف دو بالا ہو گیا...

تین دن تو بکواس ہیں ایسے گزرے کہ کچھ ہوش ہی نہیں سوائے کہ ضروری کاموں اور کچھ دیر میل ملاقات کے ہمارا محبوب مشغلہ ہی رہا۔ دن اور رات کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا یا کبھی کبھی بٹن اور آپا سے کسی ذراسی بات پر ایک جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوتا اور پھر ختم ہو جاتا۔ کبھی بچہ رو پڑتا تو وہ گھبرا کر کہتیں "ارے کیا ہوا..... یہ کیوں رو رہا ہے اندھی.... اسے یہاں لے آؤ...... بس ان کو ایسے ہی جنون کے دورے پڑا کرتے ہیں۔ آپ ہی آپ بچے کو رُلا دیتی ہیں۔ وہ بچہ کہتا ہے یہ کچھ کرتی ہیں۔ خود بھی بچہ بن جاتی ہیں۔ وہ بچے کو ان کے پاس پہنچا کر خود طیش میں بھنائی ہوئی تیزی سے بھاگ جاتی بڑبڑاتی ہوئی۔"

کیا کروں میری سنتے نہیں...... میں نے لیا کیا... ضد کرتے ہیں۔ بہت ضدی ہو گئے ہیں........

بٹن بچے کو چمکار کر کہتیں "کیا ہوا میرا چاند" یہ کہہ کر اس کے موٹے موٹے آنسو پونچھ دیتیں اور وہ چڑ غم ہو جاتا۔ صبح کو جب میں بٹن کے کمرے میں جاتی تو احمدی بچے کے پاس میٹھی باتیں کرتی ہوئی مجھے دیکھ کر "سشلام بٹیا شلام" کہتی ایک دن رو میں میرے منہ سے بھی نکل گیا۔

"شلام آپا شلام" اس پر مجھے اور بٹن دونوں کو ہنسی آگئی مگر ہم نے اپنی ہنسی روک لی۔

شام کو ہوا بیحد خوش گوار تھی۔ ایسے وقت مجھے باہر ٹہلنا بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ باغ میں چلی آئی۔ سورج درختوں کے پیچھے آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا سنہری کرنیں ہرے ہرے پتوں پر اپنا عکس ڈالتی ہوئی سبزے پر رقص کر رہی تھیں چڑیاں ہر دی نغمہ الاپ رہی تھیں۔ طرح طرح کے پھول لہرا رہے تھے۔ سامنے انار کے پیڑوں کی قطار تھی اور لیمو کے پھول کی خوشبو ہوا میں بسی تھی۔ ایک طرف گلِ ونیا کی ٹہنیاں پھولوں سے لدی جھوم رہی تھیں۔ کچھ دور پر بچے خوشی سے اچھل پھاند رہے تھے۔ اور سامنے

والے میں۔ ہسپتال کے کوارٹر بنے تھے۔ میں نے دیکھا وہیں ایک بڑے سے نیم کے پیڑ کے نیچے ایک بوڑھا کھڑا ہے۔ بچے بابا بابا کہہ کر بار بار اس کے پاس جاتے ہیں۔ وہیں احمدی بھی کھڑی باتوں کی جھڑی لگائے ہے۔ اتنے میں شمو دوڑتا ہوا میرے پاس آیا۔

"اماں اماں آپ نے بابا کو دیکھا ہے؟ اس نے انگلی کے اشارے سے کہا "وہ دیکھئے بابا کھڑے ہیں"۔

میں نے ذرا غور سے بڈھے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "یہ بابا کون ہیں؟"

ان کی نظر بھی میری طرف پڑی۔ اب وہ احمدی کے ساتھ میرے قریب آگئے اور بڑے زوردار میں سلام کیا۔ سفید داڑھی۔ لمبا منہ۔ تیز آنکھیں جن کے گرد حلقے پڑے تھے۔ ٹخنوں سے اونچا پائجامہ۔ میلا سا لمبا کرتا اس پر صدری جس کے سب بٹن ٹوٹے ہوئے تھے۔ ان کے جھکے ہوئے کندھوں اور دھنسے ہوئے پیٹ اور سینے پہ جھول رہی تھی۔ کمر میں ہلکا سا خم مگر آواز میں جوانوں کا سا دم خم۔ اور چہرے پر ایک ناقابل بیان اطمینان، بے فکری اور بشاشت کی جھلک تھی۔ احمدی نے میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر اپنا ہاتھ چوما اور مسرت بھرے لہجہ میں بولی۔

"یہ رہے میرے بھائی ہیں"۔

انھوں نے اپنی بھاری بھرکم آواز سے کہا۔

"ہم کو بڑی خوشی ہوئی آپ کے آنے سے۔ اللہ سلامت رکھے خوش رکھے بچے اچھے رہیں صاحب کی بہت ترقی ہو"۔

احمدی کی نظریں بھائی پر تھیں اس کے چہرے پر اس وقت میں نے خوشی کی ایسی کرن چمکتی دیکھی جو اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ شمو کے سر پہ ہاتھ پھیر کر بالوں کو چوما اور بولی۔

"بڑا اچھا بابا ہے۔ بالکل انگریزوں کے بابا کے مانند۔ بیٹا صاحب خوب ادب

قاعدہ سکھایا ہے۔ کتنا کہنا مانتے ہیں۔ مجھے بڑے پیارے لگتے ہیں۔"

بڈھا وہاں سے ہٹ گیا۔ میں نے پوچھا۔

"تو یہ تمہارے بھائی کیا کرتے ہیں یہاں؟"

"کچھ نہیں حضور... میرے ساتھ رہتے ہیں۔ بیمار رہتے ہیں۔ لاچار ہیں...... بدن میں درد رہتا ہے کیا کر سکتے ہیں۔ بس روزے نماز سے کام ہے۔ دن رات اللہ کی طرف دھیان رہتا ہے۔"

شمو پھر بچوں میں جا ملا۔ میں ذرا ٹھنڈی ہوا کا لطف اٹھانے وہیں ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔ احمدی بھی بیٹھ گئی۔

"حضور ہم پانچ بھائی بہنوں میں اب دو ہی دم رہ گئے ہیں۔ میں سب میں چھوٹی ہوں یہ بڑے ہیں۔ مجھے اولاد کی طرح سمجھتے ہیں۔ میں پہاڑ دل پر رہتی تھی۔ بڑے بڑے انگریزوں کے باباؤں کو کھلایا ہے۔ گرمی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔"

اس نے اپنی پیٹھ کھول دی۔ کھردری۔ مہین مہین دانے اور بھوسی۔

"یہ حال ہے میرا۔ گرمیوں میں یہ دانے مجھے بہت ستاتے ہیں۔ کھجلی اٹھتی ہے۔ میرا مرد وہیں نینی تال پہاڑ پر مر گیا۔ میرے سب بچے وہیں ختم ہو گئے۔ ایک لڑکی گیارہ برس کی تھی جب میں نے بڑی بیگم صاحب کے یہاں لکھنؤ میں نوکری کی وہ بیمار پڑی۔ انھوں نے بہتیرا علاج کیا۔ اللہ ان کے بچوں کو سکھ دے جنتی بیوی ہیں۔ بہت پیسہ لگایا۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا مگر میری قسمت پھوٹی تھی اللہ نے اسے بھی اپنے پاس بلا لیا۔"

یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی اور آنسو بھر آئے۔

"ایک دن مجھے خبر ملی کہ میرا بھائی بہت بیمار ہے۔ میں نے بڑی بیگم صاحب سے چھٹی لی اور شاہ صاحب کے مزار سے انھیں اٹھا لائی۔ کچھ پیسہ لڑکی کی بیماری میں اٹھ گیا تھا

اور جو کچھ باقی تھا ان پر اُٹھ گیا۔ سولہ روپے فیس دے کر بڑے ڈاکٹر صاحب کو میں نے دکھایا اور دس دس روپے کی دوائیاں منگا کر پلائیں تب کہیں جا کر ان کی جان بچی۔ اللہ کی مہربانی تھی اور کیا۔ کئی دفعہ بیمار ہو چکے ہیں۔ میں نے چالیس چالیس روپے مہینہ کمایا اور سب ان پر اُٹھا دیا۔ میرے پاس اب پھوٹی کوڑی نہیں...... پیٹ اچھا نہیں رہتا۔ روز کوئی نہ کوئی بیماری لگی رہتی ہے۔ پیٹ اس کا خراب رہتا ہے تیس تیس دست آجاتے ہیں...... اب میں انھیں کہاں پھینک دوں۔ یہ تو میرے دم کے ساتھ ہیں مجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے خدمت کرتی ہوں۔ جہاں نوکری کرتی ہوں اقرار لے لیتی ہوں کہ میرا بھیا میرے ساتھ رہے گا۔ اللہ بیگم صاحب کو اچھا رکھے خوش رہیں انھوں نے اسے کوارٹر دے رکھا ہے ان کے سہارے سے دن گذر رہے ہیں۔

یہ کہکر اس نے اپنے آنسو جو چھلک پڑے تھے آنچل سے سل ڈالے اس کے ہونٹ جو ہر وقت لال لال سے رہتے تھے اور لال ہو گئے۔ شرفو گر پڑا۔ وہ بھاگی۔

"ارے رے رے..... جہاں میں ہٹی بس یہی ہوتا ہے........

سورج ڈوب گیا۔ شام کی شائیں شائیں کرتی ہوئی ہوا میں اس کی فریاد بھری تھی۔ مغرب کی اذاں ہوئی میں کھڑی ہو گئی۔ احمدی کی دردناک باتوں نے میرے دل میں غم کی کسک پیدا کر دی تھی۔ اس کی دنیا مٹ چکی ہے۔ اس غریب کے لئے اب دنیا میں کیا باقی رہا۔ زندگی کا ایک ایک تار بکھر چکا۔ بوڑھی ہے بینائی کم ہو گئی پھر بھی جیتی ہے اس طرح کام کرتی ہے جیسے کوئی خاص لو لگی ہے۔ کوئی اندرونی قوت اس پرزے کو جنبش دے رہی ہے۔ جو اس کی روح کا سہارا ہے۔ جو اسے زندگی کی طاقت بخشتا ہے۔

میں نے شمو کا ہاتھ پکڑ لیا اور اندر جانے لگی۔ شمو نے کہا۔

"اماں وہ دیکھئے ادھر سڑک کے اس کونے پر مسجد بنی ہے نہ۔ بابا وہیں نماز

پڑھنے جاتے ہیں۔

میں نے سڑک کے اس پار نظر ڈالی۔ کچھ فاصلے پر مسجد کا سفید مینار جھٹ پٹے شام کی مٹیالی روشنی میں چراغ راہ کی طرح چمک رہا تھا۔

اندر آ کر بچوں کی معصوم باتوں اور اپنی سب کی گپ شپ میں سب کچھ بھول گئی۔ وہ بے چینی اور افسردگی جو ابھی طاری تھی ہٹ گئی۔

شمو کو میری تاکید تھی کہ دوپہر کو تھوڑی دیر آرام کر لیا کرے۔ وہ پلنگ پر میرے پاس آ کر لیٹ گیا۔ باتوں باتوں میں اس نے کہا۔

"اماں آج لکڑی والا آیا تھا بابا نے خوب آفت مچائی۔"

"کیا آفت مچائی۔"

"آپا سے کہا کہ لکڑی مجھے لینا ہے کہیں سے پیسے لا کر دو۔ اس نے کہا تنخواہ ساری تھیں دے چکی اب پیسے کہاں سے لاؤں۔ اس پر وہ گرج رہے تھے۔ آپا نے پانچ روپے خانساماں سے قرض لا کر دیے تب ان کی جان چھوٹی۔"

میں نے حیرت سے کہا "ارے یہ بڈھا اتنی لکڑی کیا کرتا ہے۔ باغ کی لکڑیاں بھی تو کلہاڑی لئے کاٹا کرتا ہے۔"

وہ سارا دن آگ جلاتے ہیں۔ ان کی کوٹھری تو آپ دیکھئے۔ دھواں ہی دھواں ..... ایک کیتلی ہر وقت چڑھی رہتی ہے۔ دن بھر چائے پیتے ہیں اور گرم پانی سے وضو کرتے ہیں۔

میں شمو کی باتیں غور سے سن رہی تھی اس نے ہنس کر کہا۔

"اماں بابا بڑی لمبی چوڑی بحثیں کرتے ہیں۔ کہتے ہیں جو مسلمان پانچ وقت نماز نہ پڑھے اور تیس روزے نہ رکھے وہ کافر ہے۔ جنت میں ہرگز نہیں جا سکتا..... اور اماں ان کی

کوٹھری کے پاس ایک موہری بنی ہے رات کو وہیں پیشاب کرتے ہیں اور پاخانہ دور ہے تو وہیں پاخانہ کر دیتے ہیں۔ اتنی بو آتی ہے کہ ادھر سے نکلا نہیں جاتا۔ چھی چھی۔۔۔ روز دست آتے ہیں ان کے ۔۔۔۔ مکھیاں بھنکتی ہوتی ہیں ۔۔۔۔۔ صبح کو جب مہترانی آتی ہے تو آپا صاف کراتی ہے۔ آج آپا نے دو اینٹیں رکھ کر ایک مٹی کا کونڈا وہاں رکھ دیا ہے۔ میں نے نفرت سے منہ بنا کر اس کے سنہرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"تم کیوں جاتے ہو ادھر۔۔۔ نہ جایا کرو ایسی میلی جگہ ۔۔۔۔۔

"ہاں کھیل کھیل میں کس وقت چلے جاتے ہیں"

شمو کو نیند آ گئی اس نے آنکھیں بند کر لیں ۔

آج مہینہ کی پہلی تاریخ تھی سب نوکروں کو تنخواہ بٹی۔ سہ پہر کو میں اور بٹن اکیڈمی میں بیٹھے بچوں کے لئے پکوان تل رہے تھے۔ ایک دم باہر ہلڑ مچا۔ احمدی کے بھائی زور زور سے ڈپٹ رہے تھے۔ اور کئی آوازیں تھیں۔ بیچ بیچ احمدی کے چیخنے چلانے کی نحیف آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے چونک کر کہا۔

"نہ معلوم یہ کیسا ہلڑ مچا ہے۔ شمو اور میرا بھانجا اکبر دونوں میرے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے پوچھا۔

"یہ کیا ہنگامہ ہو رہا ہے"۔

اکبر نے کہا کچھ نہیں آپا کے بھائی نے ان کی پوری تنخواہ لے لی۔۔۔۔ دونوں میں بڑا جھگڑا ہو رہا ہے۔ وہ رو رہی ہیں۔ کہتی ہیں میرے پاس پان تمباکو کے لئے بھی کچھ نہیں ہے۔ ایک روپیہ دے دو وہ نہیں دیتے"۔

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اتنے میں احمدی بڑبڑاتی اندر آئی ۔

(باقی آئندہ)

ایک اطلاع

مکتبہ جامعہ کے سرپرستوں اور ہمدردوں کو یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ سنگم پبلشرز الہ آباد کی سب مطبوعات مکتبہ جامعہ، دہلی، لکھنؤ اور بمبئی میں ہر وقت مل سکتی ہیں، سردست یہ کتابیں موجود ہیں

بہتا دریا ۔ شالاخوف کی معرکۃ الآرا تصنیف کا اردو ترجمہ ۔ سالاخوف کی اس کتاب میں انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے زمانے کے روس کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے ۔ قیمت مکمل دو جلدیں ۔ بارہ روپے (عـــہ)

آپ بیتی ۔ چیخوف کی افسانہ نگاری پر ایک مستند کتاب — قیمت عـ۸ـر

سات کھیل ۔ مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کے سات ڈراموں کا مجموعہ — للعہ

گائے جا ہندوستان ۔ دیوندر ستیارتھی کے ان غیر فانی لوک گیتوں کا مجموعہ جو انھوں نے ہندوستان گھوم کے بعد جمع کی ہیں ۔ کتاب میں متعدد تصویریں ہیں ۔ — " للعہ

چل پر ۔ چیخوف کے نفسیاتی ناول کا ترجمہ — " عہ

سحر ہونے تک ۔ چیخوف کے ایک مشہور ناول کا ترجمہ — " عہ

۱۹۴۸ء کی بہترین نظمیں ۔ جدید شعرا کی بہترین نظموں کا انتخاب — " عہ

ہیا ہیا ۔ سید مصطفیٰ فریدآبادی کی نظموں کا انتخاب — " عہ

سماج کا ارتقا ۔ از کلیم اللہ — " للعہ

شعلۂ طور

حضرت جگر مرادآبادی کا وہ دیوان جس کے مشتاقین مدت سے منتظر تھے خوبصورت جلد، پنج رنگا سنہرا گرد پوش ڈسٹ کور قیمت عـہ

گئو دان

منشی پریم چند کا شاہکار ناول، اس غیر فانی تصنیف میں ہندوستان کے کسان کی روح اس کی ذہنیت اور مشکلات کی صحیح عکاسی ہے قیمت عـہ

[illegible]

رجسٹرڈ نمبر ایل ۳۹۸۹



مکتبہ جامعہ دہلی

تلاش ہند

پنڈت جواہر لال نہرو کی تازہ تصنیف Discovery of India کا
اردو ترجمہ۔ یہ کتاب پنڈت جی نے ۱۹۴۴ء کے زمانۂ قید میں لکھی ہے زمانہ قدیم سے لے کر زمانۂ حال تک کی
ہندوستان کی معاشرتی اور سیاسی تاریخ۔ پنڈت جی کی کتاب کا ترجمہ ہندوستانی زبانوں میں سب سے
پہلے مکتبہ جامعہ نے شائع کیا ہے۔ قیمت مکمل دو حصے۔ قیمت بارہ روپے۔ (۱۲ روپے)

میری کہانی:۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی۔ یہ کتاب عرصے سے ختم تھی۔ اس کا تازہ ایڈیشن ابھی
ابھی چھپ کر آیا ہے۔ قیمت مکمل دو حصے ۹ لعہ

تلاش حق:۔ مہاتما گاندھی کی آپ بیتی۔ ترجمہ از ڈاکٹر سید عابد حسین۔ قیمت مکمل دو حصے معہ

ارتقائی اشتراکیت:۔ پروفیسر جوڈ کی کتاب "موڈرن پولی ٹیکل تھیوری" کا اردو ترجمہ۔ از
برکت علی فراق۔ اس کتاب میں کمیونزم، انارکزم، سوشلزم وغیرہ کی عالمانہ تحلیل کی گئی ہے اور بتایا گیا
ہے کہ ان میں سے کون سی شکل زیادہ قابل عمل ہے۔ قیمت مجلد عہ

خانہ جنگی:۔ شاہ جہاں کے بیٹوں کی باہمی خانہ جنگی سے مسلمانوں میں جو انتشار پھیلا، اس کی ایک
دردانگیز تصویر۔ از پروفیسر محمد مجیب۔ قیمت عہ

ہندوستانی قومیت

اور

قومی تہذیب

ڈاکٹر سید عابد حسین کی ایک معرکۃ الآرا تصنیف۔ قومیت کے مسئلے کو وقتی سیاست اور عارضی مصلحت
کی سطح سے بلند ہو کر علمی سطح پر حل کرنے کی پہلی کوشش۔ ہندو تہذیب، اسلامی تہذیب اور جدید مغربی
تہذیب کا جائزہ۔ مشترک قومیت اور مشترک تہذیب پر بے لاگ تنقیدی بحث۔ قیمت مکمل تین حصے۔ عنہ

مکتبہ جامعہ

دہلی لکھنؤ بمبئی

جامعہ

زیر ادارت:۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۴۴ نمبر ۲	بابت ماہ فروری ۴۷ء	سالانہ چندہ صہ فی پرچہ ۸

فہرست مضامین

حالی

ن۔م راشد نے اپنے مجموعہ "ماورا" کے دیباچہ میں ایک جگہ لکھا ہے:-

"وقت کے مدوجزر سے قوموں کے احساسات، جمالی تصورات اور معیارِ اخلاق میں خود بخود فرق پڑتا رہتا ہے۔ یہ تغیر قوموں کے ادبی ذوق پر بھی اسی طرح اثرانداز ہوتا ہے جس طرح اُن کی روزانہ معاشرت پر۔ ان حالات میں بعض اوقات قوم اپنے ادیبوں سے مختلف قسم کی نگارشات کی توقع کرنے لگتی ہے اور قوم کے اس خاموش مطالبے کے جواب میں ادبی تغیرات واقع ہونے لگتے ہیں۔ لیکن جب کوئی قوم اپنی ذہنی پس ماندگی کی وجہ سے یہ مطالبہ پیش کرنے کی جرأت اور بے باکی نہیں رکھتی تو کوئی جوہرِ قابل ازخود نمودار ہو کر اس جمود کو توڑ دیتا ہے۔"

حالی زمانہ کے اس اُتار چڑھاؤ اور اس سے پیدا شدہ تغیر و تبدل کے خاموش مطالبے کی صدائے بازگشت ہیں لیکن شعر و ادب کے اُفق پر اُن کا طلوع دُمدار ستارے کی طرح نہیں جو تھوڑی دیر کے لئے فضائے بسیط کو منور کر دیتا ہے اور بس۔ وہ آفتابِ تازہ ہیں جس نے شعر و ادب کی فضا کو گرمایا، ٹھنڈے جذبات اور سرد احساسات کو اپنے اشعار سے حرارت بخشی اور اس طرح بے جان زندگی کو زندگی کی گرمی عطا کی۔

حالی نے جب ہوش سنبھالا تو چاروں طرف بربادی اور زبوں حالی کا سماں نظر پڑا۔ قوم کی حالت تباہ تھی، ذہنی پستی اور عمل کی کمی نے ماحول سے جنگ کرنے اور اس پر قابو پانے کی سکت بھی نہ چھوڑی تھی، اس لئے تھکے ہوئے جی اور اُندھے ہوئے دل، بجتے ہوئے تھے اور گندی ہوئی

کہانیوں میں دل کا چین اور روح کا آرام ڈھونڈھنے۔ فلک کا شکوہ، مقدر کا گلہ، زمانے کی بیوفائی اور بخت کی نارسائی نے بگڑے کام سنوارنے اور بری حالت سدھارنے کے خیال تک سے بے نیاز کر دیا تھا۔ حالی کے دل پر چوٹ لگی، جی کڑھا، آنکھیں پُرنم ہوگئیں مگر ذہن کی رسائی اور نظر کی گہرائی نے سنبھالا، حقیقت کے صحیح ادراک نے سہارا دیا اور سچے احساس اور حقیقی جذبات نے یاس کی کفر آفرینی سے بچا کر آس کے دیے کی ٹمٹماتی روشنی میں عمل کی راہ دکھائی۔ اس راہ میں حالی کو قوم کے کھوئے ہوئے وقار، گئی ہوئی عزت اور مٹی ہوئی عظمت کو پھر حاصل کرنے کا سراغ مل گیا۔

اس میں شک نہیں کہ حالی کے ان احساسات کو گرمانے، اُن کی صلاحیتوں کو ٹھکانے لگانے میں سرسید کا بڑا ہاتھ تھا، لیکن خدا لگتی بات یہ ہے کہ سرسید کی ذات میں حالی کو وہ "محرم" اور "دل سوز" مل گیا جس کی انھیں تلاش تھی۔ اُن کے ابتدائی کلام کو کھنگولیے تو آپ کو حالی کی ذہنی کیفیات اور قلبی واردات کا ٹھیک ٹھیک پتہ چلے گا۔ اسی میں کہیں کہیں مستقبل کا حالی آپ کو اپنی جھلکیاں دکھاتا ہے مگر بالکل اس طرح جیسے صبح کا روشن ستارہ طلوعِ خورشید کے قریب جھلملا جھلملا کر دامنِ آفتاب میں اپنا چہرہ چھپالے۔ دیکھیے:۔

اب باریابِ انجمنِ عام بھی نہیں — وہ دل کہ خاص محرمِ بزمِ حضور تھا

تھکے ذہن اور ماندی طبیعتیں اگر شعر کے لطیف اشاروں کو نہ پاسکیں تو اور ذرا کھل کر کہتے ہیں:۔

سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد — ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہوگیا

اب بھی اگر نالہ پُر اعتبارِ نغمہ ہو تو دونوں شعروں کی تفصیل جدید رنگ میں یوں کرتے ہیں۔

پہلے شعر کی تصریح:۔

وہ قوم جو جہاں میں کل صدرِ انجمن تھی — تم نے سنا بھی اس پر کیا گذری انجمن میں
پائینِ بزم بھی اب ملتی نہیں اُسے جا — روندن میں ہے وہ گلبن پھولا تھا جو چمن میں

دوسرے شعر کی تفصیل:۔

ہم نے یہ مانا کہ گلشن میں ہو جب فصلِ خزاں — بے محل ہے چھیڑنا داں عہدِ گل کی داستاں
ہو خلف پر ابر جب چھایا ہوا ادبار کا — پھر سلف کی شان و شوکت کیجے کس منہ سے بیاں
ہیں یہ باتیں بھول جانے کی مگر کیونکر کوئی — بھول جائے رات کا سب صبح ہوتے ہی سماں
بزم کو برہم ہوئے مدت نہیں گذری بہت — اُٹھ رہا ہے گل سے شمعِ بزم کی اب تک دھواں
کہہ رہے ہیں نقشِ پائے رہرواں اے خاکِ ہند — یاں سے گذرا ہے ابھی اک باتجمل کارواں

حالی آپ اپنے سے بے زار سے ہوتے جاتے ہیں، انھیں خود سے شکایت پیدا ہوتی ہے۔
شکایت کیا ہے ؛ احساس کی کمی، جو کچھ ہو رہا ہے اُس پر قناعت، موجودہ پر اطمینان :۔

دردِ فراق و اشک عدو تک گراں نہیں — تنگ آگئے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم

احساس کی اس بیداری کے بعد اُنھیں خیال ہوتا ہے کہ جو چیزیں اب تک ان کی دلبستگی کا سامان تھیں اُن کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں :۔

ہم نے کی سیرِ چمن غور سے اے بلبلِ زار — بات جچتی ہوئی کوئی گل و ریحاں میں نہیں

پُرانی دلبستگیوں سے رشتہ توڑتے ہیں لیکن ابھی یہ واضح نہیں کہ ان کے بعد دل لگانا کہاں ہے ؟

نہیں کچھ منحصر دلبستگی زلفِ پریشاں میں — جو دل چاہے تو اُلجھے اک غبارِ وہ پیچاں میں

یہ منفی نفسیاتی کیفیت اور بڑھتی ہے۔ حالی کے ذہن میں نفسیاتی ہیجان ہے جو آہستہ آہستہ انقلابی شکل اختیار کر رہا ہے۔ ماحول کی دلبستگی اب انھیں جذب نہیں کرسکتی۔ وہ اپنی دنیا الگ بنا سکتے ہیں۔ اس کا اُنھیں احساس ہے لیکن وہ دنیا ہوگی کیا، اس کا ابھی پتہ نہیں۔ حالی پر سکوت طاری ہو جاتا ہے، وہ خیالات میں غرق، تخیل کے اتھاہ سمندر میں غوطہ زن ہیں۔ دیکھئے کیا ہو کر اُبھرتے ہیں :۔

لگ گئی چپ حالیِ رنجور کو — حال اس کا کس سے پوچھا چاہیے

پھر سکوت ٹوٹتی ہے، حالی خواب سے بیدار ہوتے ہیں مگر عالم یہ ہے کہ ہیں خواب میں

ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں۔ کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر کہہ نہیں سکتے، رخصتِ گفتار عطا نہیں ہوتی، شاید ابھی تلقینِ ضبط ہے :-

کل خرابات میں اک گوشے سے آتی تھی صدا دل میں سب کچھ ہے مگر رخصتِ گفتار نہیں

مگر اب دشوار یہ ہے کہ جو بات دل میں چھپائے نہیں بنتی اس کا اظہار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ رخصتِ گفتار ہے مگر زبان نہیں کھلتی، ساز نغمے سے پُر مگر اس کا چھیڑنا سخت مشکل۔ شاید مصلحت دستِ جنوں کو تھامے ہوئے ہے :-

بات جو دل میں چھپائے نہیں بنتی حالیؔ سخت مشکل ہے کہ وہ قابلِ اظہار نہیں

گومگو کا عالم ہے، دل کی بات زبان تک آتی ہے، آکر رک جاتی ہے، کس سے کہیں، کیسے کہیں، آس، یاس، امید، بیم، کبھی تاریکی، کبھی روشنی، لیکن حالیؔ اس منزل سے بھی گذر جاتے ہیں۔ اب دل کی بات زبان سے کہے بغیر چارہ نہیں مگر عشق گرہ کشائی کا فیض ابھی عام نہیں، اس لئے انھیں محرمِ راز کی تلاش ہے :-

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

مقصد کا تعین، حصولِ مقصد کے ذرائع کچھ دھندلے دھندلے سے تھے تو ضبطِ راز دشوار نہ تھا۔ اب اُن کے نقوش اُبھر کر واضح ہو چکے ہیں تو شورشِ پنہاں چہرے سے عیاں ہونے لگتی ہے :-

وہ دن گئے کہ حوصلۂ ضبطِ راز تھا چہرے سے اپنے شورشِ پنہاں عیاں ہے اب

غمِ دل اور شورشِ پنہاں دونوں نے مل کر حالیؔ کے جنوں کو کارفرمائی اور قدم کو دشت پیمائی پر اُبھارا، آمادہ کیا :-

جنوں کارفرما ہوا چاہتا ہے قدم دشت پیما ہوا چاہتا ہے

مگر جنوں کی کارفرمائی اور قدم کی دشت پیمائی کچھ آسان کام نہیں۔ راہ کی دشواریاں، منزل کی سختیاں جی چھڑا دیتی ہیں، ہمت توڑ دیتی ہیں، ارادوں کا رُخ موڑ دیتی ہیں۔ حالیؔ پر

یہ کیفیت بھی گذری۔ جب ہی تو لکھتے ہیں :-

رہروِ تشنہ لب نہ گھبرانا   اب لیا چشمۂ بقا تو نے

حالات بتاتے اور واقعات پتہ دیتے ہیں کہ قدرت نے بھی حالی کو اس کام کے لئے چن لیا تھا۔ شیفتہ کا انتقال ہوا اور حالی تلاشِ معاش میں کشاں کشاں لاہور پہنچے۔ وہاں انھیں نئے شوق اور بدلے ہوئے ذوق کے اظہار کا گو ذرا سا اور بہت ہی تھوڑا موقع ہاتھ آیا، مگر مثنوی "حب وطن" دیکھیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے زخم پر نمک چھڑک دیا، یا پرانے ناسور کا منہ کھل گیا جو بے اختیار بہہ نکلا ہو۔ اس زمانے کے اور خود لکھنے والے کے حالات کو پیش نظر رکھئے اور پھر ان احساسات، جذبات، خیالات اور واقعات کی پُرجوش مگر سچی عکاسی پر غور کیجئے تو یہ نظم معجزہ معلوم ہوگی۔ خیالات ایسے کہ آج بھی بڑے سے بڑا وطن دوست اور محب قوم ان اصطلاحوں کا مفہوم اس سے بہتر نہیں سمجھا جا سکتا اور سچ پوچھئے تو آج شاید سمجھا بھی نہ سکے گا۔

غزل کے تنگ اور محدود دائرے میں "تیلی کے بیل کی طرح" برسوں گذار دینے والا شاعر جب نظم کہنے پر آئے اور وہ بھی ایسے موضوع پر جس کا صحیح تصور بھی اس کے ماحول میں نہ ہو اور پھر نظم بھی ایسی کہے، تو اسے کیا کہا جائے؟

یہاں سے حالی کی شاعری کا اصلاحی دور شروع ہوتا ہے، عروسِ سخن نیا چولا بدلتی اور گیسوئے اردو کو نیا شانہ نصیب ہوتا ہے۔ حالات مساعدت اور واقعات اسباب فراہم کرتے ہیں۔ دلی کا یہ روڑا لاہور میں زیادہ دن پڑا نہ رہ سکا۔ حالی دہلی آگئے، یہاں اُن کی ملاقات سرسید سے کیا ہوئی گویا گنگا جمنا مل گئیں۔ اِدھر دِل کی واردات اپنی زبان میں کہنے کا وقت بھی آگیا تھا، ساون بھادوں کے میل نے خونِ جگر کا خوب مینہہ برسایا، اشکوں کی وہ جھڑی لگی کہ کوئی حصہ اور کوئی طبقہ نہ بچا۔

سرسید نے مسلمانوں میں جس تحریک کو پھیلایا، حالی نے شعر کی زبان میں اُسے عوام

تک پہنچایا۔ سرسید تحریک کا دماغ تھے تو حالی اس کی زبانِ گویا بن گئے۔

یہ کچھ ایسا آسان کام نہ تھا۔ ہرکس و ناکس نخوت کے نشے میں چور، سحر سامری سے مسحور، کہیے تو کس سے اور سنائیے تو کسے۔ حالی نے یہ افسوں توڑا، طلسم سامری پر شعر کے منتر سے ایسی کاری ضرب لگائی کہ سارے طلسمات میں تہلکہ مچ گیا اور عین مرکز میں تو آگ سی لگ گئی، بڑے بڑے پیل تن، دیوہیکل اپنے اپنے ہتھیاروں سے سج کر میدان میں اُتر آئے، لفظی بازی گری اور فنی قلابازیوں کے خوب خوب جوہر دکھائے مگر نتیجہ وہی جو جن کے منہ آئے منہ کی کھائے۔

رسوائیوں کی آندھیاں آئیں اور چھٹیں، بدنامیوں کی گھٹائیں چھائیں اور چھٹیں، دشنام کی بارش ہوئی اور کھلی، حالی کا قصد مستحکم اور ارادہ اٹل تھا، یاس کی اندھیاری میں آس کا دامن کبھی نہ چھوٹا، پائے ثبات کو لغزش نہ ہوئی اور قدم جو ایک دفعہ دشت پیمائی اور آبلہ پائی کے لئے اٹھ گئے تھے، نہ رُکے۔ مخالفین کے منہ کس طرح بند ہوئے، حالی کی زبان سے سنیے

کیا پوچھتے ہو کیوں کر سب نکتہ چیں ہوئے چپ سب کچھ کہا انھوں نے اور ہم نے دم نہ مارا

حالی کے اصلاحی پروگرام میں گیرائی بھی تھی اور گہرائی بھی، تنوع بھی اور پہنائی بھی۔ قوم کی چھوٹی سے چھوٹی اور حقیر سے حقیر خامی، کمزوری اور کمی ان کی بالغ نظر اور دور رس نگاہ سے نہ بچ سکی۔ تعلیم کی ترغیب، عمل کی تلقین اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی تعلیم اُن کے کلام میں جہاں تہاں کافی ملتی ہے، لیکن اصلاحِ معاشرت اور رسموں کی ترمیم پر توجہ دلانے سے بھی وہ غافل نہیں۔

شمشیر و سناں کی منزل سے گذر کر جب ان کی قوم طاؤس و رباب کی محفل میں داخل ہوئی، بہت سی بے جا رسوم، مذموم عادتیں اور مسموم رواج جگہ پا گئے جن سے مسلمانوں کی ملی سیرت مسخ اور مذہبی صورت داغ دار ہو گئی۔ یہ عیوب ایسے راسخ اور ان کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ زمانے کے بدلنے، ہوا کا رخ پلٹنے اور مالی حالت کمزور ہو جانے پر بھی، ترک کرنا تو کیا، وہ اُن میں

کسی ردوبدل، ترمیم و تنسیخ اور کمی اور زیادتی کے لئے بھی تیار نہ تھے۔ عورتوں کے حقوق سلب ہیں
ان کی اعتباری جگہ اسلام نے دنیا کے اس تاریک عہد میں متعین کئے تھے جب عورتوں کو انسان
سمجھنا پاپ اور ان کے ساتھ انسانوں کا سا برتاؤ گناہِ عظیم سمجھا جاتا تھا، مگر اسلام کے یہ سپوت
اسلام کا دم بھرنے کے باوجود، اس کی کھلم کھلا اہانت کرتے رہے۔ اسلام نے عقد بیوگان کی
اجازت دی۔ بانیِ اسلام نے اپنی مثال سے اسے رواج دیا مگر ہندوستانی مسلمانوں نے ہمایوں
کی رس میں اسے ممنوع کر لیا۔ حالی کے اس کے مضر اثرات اور زہریلے امکانات کا اندازہ کیا، قوم
کو اس معصیت کوشی اور انسان کشی سے بچانے کے لئے "مناجاتِ بیوہ" لکھی اور ایسی لکھی کہ سچ پوچھئے
تو یہ حالی کا شاہکار ہے مگر مسدس کی گرم اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والی آفتابی روشنی نے اس نظم
کی ٹھنڈی اور میٹھی چاندنی کو ماند کر دیا۔

حالی کی شخصیت کی نامکمل ہی نہیں بلکہ بے روح سی عکاسی ہوگی اگر اُن کی وطن کی
محبت، ابنائے وطن کی الفت اور ان سب سے بڑھ کر ان کی انسان دوستی کا ذکر نہ کیا جائے۔
مرثیے میں انھوں نے غالب کو "معنیٔ لفظ آدمیت" کہا ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ خود اُن پر زیادہ
صادق آتا ہے۔ وہ زندگی کی اعلیٰ قدروں کے سیوک تھے، انھی کی سیوا میں زندگی کا بڑا حصّہ
صرف کر دیا۔ ان کی تعلیم، ان کی تلقین اور ان کی حمایت میں رسوائیاں سہیں، بدنامیاں اٹھائیں،
گالیاں سنیں مگر نہ اُن سے منہ موڑا، نہ پیٹھ دکھائی۔ انھیں وطن کی بربادی، ابنائے وطن کی بے بسی
اور حق تلفی اور ان سب سے بڑھ کر انسانی شرافت کی تذلیل کا شدید احساس تھا۔ "کالے اور گورے
کی صحت کا میڈیکل امتحان" والا قطعہ اس کا ترجمان ہے۔ ایک اور قطعے میں حکومت کے عدل و
انصاف کو واضح کرتے ہیں لیکن اس شعر میں اس تاریخی حقیقت کو کتنے اچھے انداز میں بیان کیا ہے:-

داد طلب سب غیر ہوں جب تو اُن میں کسی کا پاس نہ ہو
بتلائی ہے زمانے نے انصاف کی یہ پہچان ہمیں

بیرونی حکومت کی "پردۂ تہذیب میں غارت گری اور آدم کشی" کی تصویر کشی یوں کی ہے:-

صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا
دیکھ کر اس کو سارے تمہارے آگئے یاد احسان ہیں

حالی بیرونی حکومت کی مالی اور اقتصادی لوٹ برداشت کرسکتے تھے، لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ حکومت نے ملک کے باشندوں کے علم و اخلاق پر ڈاکہ زنی شروع کر دی تو وہ بے چین ہوگئے۔ اب اُن سے نہ رہا گیا:۔

نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن — حذر اس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی
نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں — یہ گل چینی ہے یا لٹس ہر گلچیں یا ہے قزاقی

حالی کی شخصیت کا سب سے بڑا جوہر جو ان کی زندگی میں کندن کی طرح دمکتا رہا، اور اُن کے کلام میں آج بھی چمکتا ہے ان کی انسانیت اور انسانی محبت ہے۔ ان کی زبان، ان کے قلم، ان کے افعال، ان کے کردار سے کبھی کوئی چیز ایسی عمل میں نہ آئی جس سے کسی کا دل دکھتا یا کسی کو صدمہ پہنچتا۔ انسانی خدمت ان کی زندگی کا نصب العین تھا اور یہی دین و ایمان۔

وہ مسلمانوں کو اسلام کا سبق یاد دلاتے ہیں:۔

سکھائی انھیں نوعِ انساں پہ شفقت — کہا ہے یہ اسلامیوں کی علامت
کہ ہمسائے سے رکھتے ہیں وہ محبت — شب و روز پہنچاتے ہیں اُس کو راحت

وہ جو حق سے اپنے لئے چاہتے ہیں
وہی ہر بشر کے لئے چاہتے ہیں

انسانی وحدت و محبت جو قرآنِ حکیم کا اہم ترین سبق ہے یوں دہراتے ہیں:۔

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ کا — کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالقِ دوسرا کا — خلائق سے ہے جس کو رشتہ ولا کا

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

حالی کی خدمات کا نچوڑ ذاکر صاحب ایک جگہ یوں فرماتے ہیں:-

"انھیں (مسلمانوں کو) جگانے میں ساری زندگی کھپا دی، اُن میں اجتماعی زندگی کا احساس پیدا کرنا چاہا، اخلاقی قدروں کی اہمیت انھیں سجھائی، ان کی معاشرت پر نکتہ چینی کی، ان کے تمدن پر اعتراض کئے، ان کے امیروں کو شرمایا ہے اور ڈرایا ہے، اُن کے غریبوں کو ہمت دلائی ہے، اُن کے علما کو اپنے فرائض یاد دلائے ہیں، ان کے شاعروں کی بے مغز بکواس کا تمسخر کیا ہے، انھیں تحصیلِ علم کی رغبت دلائی ہے، تجارت کا شوق دلایا ہے، محنت اور مشقت پر آمادہ کیا ہے، ننگِ بندگی کا احساس پیدا کیا ہے، غیرت دلائی ہے، ہمت بندھائی ہے، خود خون کے آنسو بہائے ہیں اور انھیں بھی رُلایا ہے، پھر محبت کے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھے ہیں اور یہ سب کچھ اس تاثیر کے ساتھ کیا ہے کہ ان کی تاریخِ سیاسی میں، تاریخِ تعلیمی میں، تاریخِ معاشرت میں، تاریخِ ادب میں جہاں کہیں پچھلی نصف صدی میں کسی صحیح حرکت کی روانی دکھائی دے تو اس کا سلسلہ اس ادیب، شاعر، مصلح، محبِ وطن اور سب سے زیادہ اُس صاف دل اور فرشتہ خصائل انسان کی کاوشِ ذہنی کے چشمۂ صافی سے جا ملتا ہے۔"

اس سب کے بعد اگر کوئی یہ کہے کہ "یہ بھی زمانے کا کتنا بڑا ظلم ہے کہ حالی جیسا شاعر سرسید کا 'تابع مہمل' یا زیادہ سے زیادہ ضمیمہ ہو کر رہ جائے اور سجاد حسین مرحوم کے تمسخر اور استہزا کا نشانہ بنے" تو آپ اُسے کیا کہیں گے؟!

سید سفارش حسین

طلبہ میں پس افتادگی اور اس کو دور کرنے کے طریقے

پس افتادگی کا مفہوم | اگر ایک جماعت کے طلبہ کو کوئی سوال حل کرنے کی غرض سے دیا جائے تو بعض طلبہ ایسے ہوں گے جو جلد اور صحیح طور پر اُس کا جواب بتلادیں گے' ان کو ذہین کہا جائے گا اور بعض طلبہ ایسے ہوں گے جو جواب تو صحیح طریقے پر ادا کریں گے مگر دیر سے' اور کچھ تعداد ایسے طلبہ کی بھی ہوگی جو جواب غلط طور پر ادا کریں گے۔ ایسے طلبہ کو جو قابلیت میں جماعت کے اوسط سے کم ہوں پس افتادہ کہیں گے یعنی ایسے طلبہ جن کی ذہنی حالت اوسط سے کمتر ہو یا جن کی ذہنی عمر طبعی عمر سے کم ہو پس افتادہ کہلاتے ہیں۔ مسٹر برٹ نے پس افتادہ طلبہ کے متعلق لکھا ہے کہ پس افتادہ طالب علم وہ ہیں جو اپنی جماعت سے ایک درجہ کم میں بھی کام کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

پس افتادگی کے اسباب | طلبہ میں پس افتادگی کے اسباب دو طرح کے ہوتے ہیں۔ بعض اسباب ایسے ہیں جو طلبہ پر بیرونی طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ بعض اسباب ایسے ہوتے ہیں جن کا باعث خود مدرسہ ہوتا ہے۔ پہلے ہم بیرونی اسباب کا جائزہ لیں گے۔

(۱) سماجی خرابیاں | ماہرین نے تحقیق کی ہے کہ جن ممالک کی اقتصادی حالت خراب ہے وہاں طلبہ زیادہ تعداد میں پس افتادہ ہوتے ہیں اور عموماً دیکھا گیا ہے کہ پس افتادہ طلبہ پست اور مفلس خاندان کے ہی ہوتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ پس افتادگی اور افلاس میں کوئی خاص ربط ہو۔

(۲) جسمانی نقائص | جسمانی نقائص اور صحت کی خرابی پس افتادگی کا باعث ہوتی ہے جن طلبہ کے سرپرست اصول حفظانِ صحت سے ناواقف ہوتے ہیں اُن کے بچے عموماً پس افتادہ ہوتے ہیں۔ بعض ماہرین نے تحقیق کی ہے کہ پس افتادہ طلبہ چار سال سے قبل مخدوش امراض میں مُبتلا

ہو سکتے ہیں، مثلاً نمونیا، ٹائیفائیڈ اور لال بخار وغیرہ۔ یہ امراض نہ صرف بچے کی نفسی کیفیت ہی پر اثر ڈالتے ہیں بلکہ مدرسے سے اُن کی طویل غیر حاضری کا باعث ہو کر پس افتادگی میں مزید پستی پیدا کر دیتے ہیں۔

(۳) نامناسب غذا | معقول اور مناسب غذا نہ ملنے کے باعث بھی پس افتادگی پیدا ہوتی ہے۔ پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ معقول اور مناسب غذا نہ ملنے کے باعث دماغ سب سے اخیر میں متاثر ہوتا ہے لیکن حالیہ تحقیق کی روشنی میں یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ ناکافی اور ناقص غذا سے نظامِ عصبی پہلے اور بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ کوئی دماغی محنت کرنے والا ہو کافی غذا نہ ملنے کی وجہ سے اپنی پوری توانائی اور توجہ سے کام انجام نہیں دے سکتا۔ یہی حال بچوں کا بھی ہے۔ علاوہ ازیں جن بچوں کے خون میں شکر اور لحمیہ کے اجزا غیر معمولی طور پر پائے جاتے ہیں ان میں بسا اوقات اعصابی اضمحلال یا کمزوری کا رجحان دیکھنے میں آیا ہے۔

(۴) نیند کی کمی | نیند کی کمی کی وجہ سے بھی پس افتادگی پیدا ہوتی ہے۔ نیند ناکافی ہونے کی صورت میں ایک قسم کی تکان محسوس ہوتی ہے اور یہ تکان رفتہ رفتہ پس افتادہ بنا دیتی ہے۔

(۵) محنت مزدوری | اوقاتِ مدرسہ کے بعد بعض طلبہ کو محنت مزدوری یا ملازمت کرنی پڑتی ہے جس کی وجہ سے جب وہ مدرسے آتے ہیں تو بہت تھکے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کا دماغ اسباق کے سمجھنے اور پڑھنے کی اہلیت کھو بیٹھتا ہے اور بتدریج پس افتادگی پیدا ہو جاتی ہے۔

(۶) اخلاق سوز ادب | اخلاق سوز ادب کی خواندگی بھی طلبہ میں پس افتادگی کا باعث ہوتی ہے۔ بُری کتاب ایک بہت بڑا چور ہے کیونکہ اس سے طلبہ کا وقت ضائع ہوتا ہے۔ اکثر نوجوانوں کی بربادی کا باعث وہ غیر مہذب لٹریچر ہے جو ملک میں نہایت سرعت سے پھیل رہا ہے۔ بُری کتاب طلبہ کے خیالات، وقت اور دولت کو ضائع کرتی ہے اور ان کے خیالات میں قبل از وقت پختگی اور انتشار پیدا کرتی ہے۔ یہ انتشار کسب علم سے دوری اور ذہنی پستی کا باعث ہوتا ہے۔

(۷) احساس کمتری | ہندوستان ایک عرصے سے آزادی کی فضا سے محروم ہے۔ یہ محرومی عام طور پر

احساس کمتری کے مہلک مرض میں مبتلا کر دیتی ہے جس کے اثرات شعوری اور غیر شعوری دونوں طرح بچوں پر پڑتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی ذہنیت بھی پس افتادہ ہو جاتی ہے۔

(۸) ادراکی ذخیرے کی عدم میسری — ایسے زبوں حال خاندان کے بچے جہاں افراد کی کثرت ہے، ماں باپ غیر تعلیم یافتہ ہیں اُن میں وہ تمام خصوصیات پیدا نہیں ہو سکتیں جو مدرسے کی تعلیم کی اساس ہیں۔ ان کے معلومات نہایت مختصر بالفاظ دیگر ادراکی ذخیرہ اس قدر محدود ہوگا کہ کسی طرح ان کا نفس جدید معلومات کے قبول کرنے کی اہلیت نہ رکھے گا۔ چنانچہ ایک ماہر تعلیم نے ایک مغربی دیہی علاقے کے ۵۰۳ طلبہ کے معلومات کی تحقیق کی تو یہ معلوم ہوا کہ اُن میں ۶۴ فی صد ایسے طلبہ تھے جنھوں نے گھوڑا، بیل اور کتے کے سوا کوئی دوسرا جانور نہیں دیکھا تھا۔ ۱۶ فی صد ایسے طلبہ پائے گئے جو بھیڑ کو گائے سے بڑا سمجھتے تھے۔ ۴۶ فی صد ایسے طلبہ تھے جنھوں نے کبھی ریل کا سفر نہیں کیا تھا۔ ۹۸ فی صد بچوں نے کبھی سمندر نہیں دیکھا تھا۔ جب اُن کی ذہنی کیفیت کا پس منظر ایسا ہوگا تو وہ مدرس کی درسیات کے نقشے کو جو اس پس منظر کا خیال کئے بغیر بنایا گیا ہے اپنے دماغ میں کس طرح پوری جگہ دے سکیں گے؟

(۹) والدین کا بے جا لاڈ پیار — والدین کا بے جا لاڈ پیار بھی بچوں میں ذہنی پستی یا پس افتادگی پیدا کر دیتا ہے، مثلاً جو ماں باپ اپنے بچوں سے زیادہ محبت کرتے ہیں وہ زیادہ عمر تک اُن سے کوئی کام نہیں لیتے جس کی وجہ سے ان کی اندرونی صلاحیتوں کو اُبھرنے کا موقع نہیں ملتا اس لئے وہ ناکارہ ہو کر پس افتادہ ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں سیگڈوگل کا خیال ہے کہ والدین کی آپس میں ناچاقی بھی اولاد میں پس افتادگی پیدا کرتی ہے۔

(۱۰) ایک سے زائد زبان کی تعلیم — اکثر والدین بچوں کو ابتدا میں مادری زبان میں عبور حاصل کرنے سے قبل دوسری یا تیسری زبان سکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چونکہ بچوں کے قوائے عقلیہ اس کے متحمل نہیں ہو سکتے اس لئے اُن میں ایک قسم کی بیماری پیدا ہو جاتی ہے جس کو طب میں Dementia Praecox کے نام سے موسوم کرتے ہیں جو طالب علم میں پس افتادگی پیدا کر دیتی ہے۔

اب ہم ان اسباب پر غور کریں گے جن کا تعلق مدرسے سے ہے۔

(۱) مسلسل غیر حاضری | وہ طالب علم بھی پس افتادہ ہو جاتے ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے ایک عرصے تک غیر حاضر ہوتے ہیں یا ایک سال کے دوران میں مختلف مدارس میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

(۲) غیر موزوں مدرسین | جامعات کی پیداوار میں بہترین دل و دماغ کے افراد دیگر زیادہ آمدنی یا جاہ وحشم والے محکموں میں چلے جاتے ہیں اور ان میں وہ جن کو دوسرے محکموں میں غیر موزوں قرار دیا گیا ہے وہ محکمۂ تعلیمات کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ ایسے ناقص اور غیر تربیت یافتہ مدرسین ہونے کے باعث مضامین کی خاطر خواہ تدریس نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں مدرسین کے تبادلے کے وقت مدرسے کے حالات کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی مدرسے میں ایک مضمون کا کوئی مدرس باقی نہیں رہتا تو دوسرے مدرسے میں اُس مضمون کے چار مدرسین جمع ہو جاتے ہیں۔ اُن مدارس میں جہاں ایک ہی مدرس رہ جاتا ہے دوسرے مدرسین کو بادلِ ناخواستہ اس مضمون کو پڑھانے دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تدریس کس طرح ہوتی ہوگی۔ اس لئے طلبہ میں پس افتادگی پیدا ہو جاتی ہے۔ عموماً اساتذہ کی ترقی میں بلا وجہ تاخیر یا ان کو محروم کیا جاتا ہے جس سے اُن میں خود پس افتادگی پیدا ہوتی ہے جس کا لازمی نتیجہ طلبہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اقبال نے اس حقیقت کو یوں واضح کیا ہے ؎

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہین بچّوں کو دے رہے ہیں خاک بازی کا

(۳) بے وقت اور ناموزوں ترقی | بعض اوقات بے وقت اور ناموزوں ترقی بھی پس افتادگی کا باعث ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ایک جماعت سے دوسری جماعت میں ایسے طلبہ کو ترقی دی جاتی ہے جو اپنی قابلیت کے لحاظ سے اس کے لئے بالکل موزوں نہیں ہوتے۔ لہٰذا وہ اُس جماعت میں پس افتادہ ہو جاتے ہیں۔

(۴) طلبہ کی زیادتی | اسکولوں میں چھوٹی عمر کے تیس چالیس طلبہ ایک معلم کے سپرد کر دئے جاتے ہیں اور توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان کو ضبط کے اندر رکھے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مدرس مار مار کے طلبہ کے فطری

قوی کو برباد کردیتا ہے اور وہ پس افتادہ ہوجاتے ہیں۔

(۵) جماعتی نظام | جماعتی نظام بھی پس افتادگی کا باعث ہوتا ہے۔ اگر ہم کو ایک ایسے طعام خانے میں رہنے کے لئے مجبور کیا جائے جہاں سب کو ایک ہی مقدار میں اور ایک ہی جیسی غذا دی جائے اور حکم ہو کہ تمام اشخاص ساری غذا کھا جائیں، اس بات کی پرواہ نہ کی جائے گی کہ بعض کے لئے یہ غذا کم اور بعض کے لئے بہت زیادہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے طعام خانے کے افراد کبھی صحت مند نہ رہیں گے بالکل اسی طرح جماعتی نظامِ تعلیم میں ایک ہی وقت، ایک تعداد میں ایک جیسی تعلیمی غذا ذہین اور کند ذہن سب لڑکوں کو پیش کی جاتی ہے اور اُمید کی جاتی ہے کہ سب اس کو ہضم کرلیں گے اور اگر کوئی ہضم نہ کرے تو ڈنڈے مار مار کر ہضم کرائی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذہین طلبہ کی ذہنی پیاس تشنہ رہتی ہے جس کی وجہ سے وہ پس افتادہ ہوجاتے ہیں اور کمزور طلبہ تو پورے پس افتادہ ہوجاتے ہیں کیوں کہ اُن کی ذہنی قابلیت ایسی تعلیم کو قبول کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ علاوہ ازیں جماعتی نظامِ تعلیم میں درس اور تدریس میں ہی ربط حاصل کیا جاتا ہے۔ مطالعہ کیوں کر کیا جائے یہ نہیں بتلایا جاتا جس سے خود اعتمادی پیدا ہو۔ اس لئے طالب علم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دوسروں کا دست نگر ہوجاتا ہے۔ یہ دست نگری پس افتادگی کے لئے بہت کافی ہے۔

(۶) مدرسے میں چاک کی گرد | مدرسے میں چاک کی گرد سے نزلہ زکام کی بہت ہی شکایتیں پیدا ہوتی ہیں چنانچہ ڈاکٹر فرانڈیل پوسٹس باشندۂ لنکا شائر نے لکھا ہے کہ چاک کی گرد جو تختۂ سیاہ پر چاک کے بکثرت استعمال ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے مسلسل نزلہ زکام کا باعث ہوتی ہے جس سے اعصابی کمزوری پیدا ہوکر طلبہ پس افتادہ ہوجاتے ہیں۔

پس افتادگی کے اسباب کا اس طرح جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اکثر اسباب ایسے ہیں جن پر مدرس کا کوئی اختیار نہیں، مثلاً سماجی حالت، جسمانی کمزوری، اعداد ذہانت کی ذخیرے کی کمی وغیرہ۔ لیکن باوجود اس کے طلبہ کی پس افتادگی کا ذمہ دار مدرسے ہی کو قرار دیا جاتا ہے حالانکہ یہ کام سماجی مصلح اور بڑے بڑے مدبروں کا ہے لیکن وہ اپنے اس اہم فریضے کو بالکل فراموش کئے ہوئے

ہیں لہٰذا مدرسے ہی کو مدرسے کی تنظیم، طریقۂ تدریس اور مضامین کے ارتباط وغیرہ کی ایسی عملی تجاویز اختیار کرنی پڑتی ہیں جس کے ذریعے پس افتادگی میں کمی اور ان کی تعلیم مفید اور آسان ہو۔ اس مطلب کے لئے حسب ذیل تجاویز پیش کی جاتی ہیں -

(۱) مخصوص مدرسہ | موجودہ صورت میں پس افتادہ طالب علم اس جماعت میں تعلیم پاتا ہے جہاں اس سے زیادہ ذہین اور معمر طلبہ تعلیم پاتے ہیں یا اس سے کم سن طلبہ۔ چونکہ وہ ذہین طلبہ کا مقابلہ نہیں کرسکتا اس لئے ہمیشہ ناکام رہتا ہے۔ کمسن طلبہ کا مخصوص طریقۂ تعلیم اور ضبط وغیرہ اس کو پسند نہیں آتا اور کم سن طلبہ جلد جلد ترقی کے منازل طے کرتے ہیں اس لئے اس کی خودداری اور خوداعتمادی کو زبردست دھکا لگتا ہے۔ علاوہ ازیں اجتماعی تدریس میں پس افتادہ طلبہ کی مثال فوجی دستے کی رفتارِ مارچنگ کے ان معذور اور سست سپاہیوں کی سی ہے جو پورے دستے کی رفتار سے مطابقت نہیں کرسکتے۔ جس طرح اُن معذور اور سست سپاہیوں کو صف سے نکال دیتے ہیں اسی طرح پس افتادہ طلبہ کو بھی جماعت کی رفتار کو متاثر نہ کرنے کی خاطر علیحدہ کردینا ضروری ہے -

علاوہ ازیں اگر کوئی مدرس بیک وقت جماعت کے ساتھ ساتھ پس افتادہ طلبہ کے لئے بھی ایسے ہی تدریسی طریقے اختیار کرتا ہے جو اُن کے لئے مفید ہوسکتے ہیں تو گویا وہ دو فرائض کے انجام دینے کی کوشش کرتا ہے جس سے بہت جلد پریشانی اور تکان محسوس کرے گا اور یہ کیفیت اس میں چڑچڑاپن پیدا کردے گی جس سے پس افتادہ طلبہ بہت جلد متاثر ہوں گے۔ پس ان حالات کے مدنظر پس افتادہ طلبہ کو جماعت سے علیحدہ رکھنا ہی ضروری ہے۔ جہاں اُن کے لئے مخصوص نظام اوقات اور مخصوص طریقۂ تعلیم اختیار کرنا ہوگا۔ ان مدارس کے توہین آمیز نام نہ رکھے جائیں بلکہ عملی جماعت وغیرہ جیسے نام مقرر کئے جائیں۔ جرمنی کے ایک شہر مان ہائیم میں اس قسم کا ایک مخصوص مدرسہ کھولا گیا تھا جہاں ہر جماعت میں صرف پچیس طلبہ تھے تاکہ انفرادی توجہ دی جاسکے۔ اس جماعت میں تعلیم سابقہ جماعت کی دی جاتی تھی۔ اگر طالب علم نے ختم سال تک کافی ترقی کرلی تو آئندہ درجہ میں ترقی دی جاتی تھی ورنہ اُسی درجے میں جہاں سے وہ آیا تھا بھیج دیا جاتا تھا۔ مخصوص مدارس

کے قیام میں حسب ذیل نقائص پائے جاتے ہیں:-

(۱) موزوں اور مناسب مدرسین کی کمیابی۔

(۲) اگر کوئی طالب علم عارضی طور پر پس افتادہ ہوگیا تو زیادہ توجہ سے اپنی اصلی جماعت میں جاسکتا ہے مگر حقیقی پس افتادہ طالب علم وہاں کے موزوں نصاب کی وجہ سے اسی مدرسے میں رہنے کا رجحان رکھتا ہے۔

(۳) مدرسے کے نام کو توہین آمیز ناموں سے کتنا ہی بچائیے مگر یہ مدارس طلبہ کے ذاتی وقار کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

(۴) پس افتادہ طلبہ کو طبعی بچوں سے ملنے جلنے کا موقع نہیں ملتا اس سے اُن کی آیندہ زندگی میں نقصان پہنچنے کا احتمال پیدا ہوتا ہے۔

(۵) انگلستان میں "ہیڈو کمیٹی" نے ایسے مدارس کی مخالفت کی ہے۔

پس ان نقائص کی روشنی میں مخصوص مدارس کا قیام نامناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۲) **مخصوص جماعت** اکثر ماہرین تعلیم مخصوص جماعتوں کے قیام پر زور دیتے ہیں اور اس کا نام مرکزی جماعت تجویز کرتے ہیں۔ امریکہ میں پس افتادہ طلبہ کے لئے ایک مخصوص جماعت غیر تدریجی کے نام سے کھولی گئی تھی۔ اس جماعت کے طلبہ کو صحیح الحال طلبہ کے ساتھ کھیلنے اور تفریحی مشاغل میں حصہ لینے کا موقع دیا جاتا تھا لیکن اس کا نصاب جسّی امتیاز، بیرونی ہیجانات مماثل، کنڈرگارٹن اور طریقۂ مانٹی سوری کا سا ہوتا تھا اور طلبہ کی تعداد پندرہ ہوتی تھی تاکہ انفرادی توجہ دی جاسکے۔ اسی طرح انگلستان میں بھی ایک مخصوص جماعت کا قیام عمل میں آیا تھا۔ یہاں کے بچے دعا کے وقت اور مدرسے کے آغاز و برخاست کے وقت ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے۔ اس کا نصاب دستی مشاغل، گرامر، حسابی سوالات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس طرح کے تجربے ہر ایک ملک میں ہو رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ آئندہ اس میں ترقی ہو مگر میرے خیال میں ان مخصوص جماعتوں کی تدریس اور قیام میں کم و بیش وہی نقائص پائے جاتے ہیں جو مخصوص مدارس کے سلسلے میں پیش کئے گئے ہیں۔

(۳) نظام بٹا دیا | اس نظام کے تحت ایک مدرس تمام جماعت کو درس دیتا ہے اور دوسرا مدرس ہر طالب علم کو انفرادی توجہ دینے کے لئے مقرر کیا جاتا ہے۔ وہ طلبہ جو غیر حاضری کی وجہ سے سبق کے سلسلے کو قائم نہیں رکھ سکتے ان کے لئے اوراکی ذخیرہ فراہم کرتا ہے۔ اگر خلوص دلی سے اس طریقے پر عمل کیا جائے تو اچھے نتائج کی توقع ہوسکتی ہے۔ مگر اس میں بڑی خرابی یہ ہے کہ ہر جماعت کے لئے بجائے ایک مدرس کے دو مدرس کی ضرورت ہے چہ جائیکہ اکثر مدارس میں اصل کوٹے ہی میں کچھ اساتذہ عموماً کم رہتے ہیں۔

(۴) سہ راہی نظام | اس نظام تعلیم کے تحت مدرسے میں متعدد جماعتیں بہت تیز اور ہوشیار لڑکوں کے لئے قائم کی جاتی ہیں جن کو "الف" جماعتیں کہتے ہیں۔ متعدد جماعتیں ایسے طلبہ کی قائم کی جاتی ہیں جو پس افتادہ اور سست ہوتے ہیں، انھیں "ج" جماعتیں کہتے ہیں۔ اوسط قابلیت کے طلبہ کی علیحدہ جماعتیں ہوتی ہیں جن کو "ب" جماعتیں کہتے ہیں۔ اس سہ راہی نظام کے تحت پس افتادہ طلبہ کا ایک جماعت سے دوسری جماعت میں منتقل کرنا آسان ہے۔ لیکن دوسری خرابیاں وہی موجود ہیں جو مخصوص مدارس میں پائی جاتی ہیں۔

(۵) دو فریقوں کا قیام | بعض مدارس میں ایک جماعت کے طلبہ کو بہ لحاظ قابلیت دو فریقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک فریق میں ذہین طلبہ رکھے جاتے ہیں دوسرے میں کمزور طلبہ۔ اس کے بعد مزید جماعت بندی کرکے کمزور طلبہ کو اُن مضامین کی تعلیم کے لئے جن میں وہ کمزور ہیں نیچے کے درجے میں بھیجا جاتا ہے۔ یہ نظام اُن مدارس کے لئے موزوں ہے جہاں طلبہ کی تعداد کم ہے۔

اوپر جو تجاویز پیش کی گئی ہیں اُن سب کا تعلق اجتماعی طریق تعلیم سے ہے۔ اس قسم کے طریقِ تعلیم میں کامیابی اس وقت ہوسکتی ہے جبکہ پس افتادہ طلبہ میں ذہنی اختلافات یکساں ہوں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ پس افتادہ طلبہ میں ذہنی اختلافات اس قدر وسیع ہوتے ہیں کہ ان تدابیر کی کامیابی مشکوک نظر آتی ہے۔ اس لئے پس افتادگی کو دور کرنے کے لئے موثر طریقے وہ ہوسکتے ہیں جن میں پہلے پس افتادگی کی اصل وجہ معلوم کرکے اس کے مطابق تدبیر نکالی جائے۔ جس طرح ایک حکیم مرض کی تشخیص کیا کرتا ہے

کرنے تو علاج آسان ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح پس افتادہ طلبہ کے لئے وہ طریقے ہی مفید ہو سکتے ہیں جو پس افتادگی کی وجہ معلوم کرکے اختیار کئے جاتے ہیں۔ اس مطلب کے لئے مندرجہ ذیل تجاویز پیش کی جاتی ہیں:-

(۱) اعزازی خدمات | اگر کوئی طالب علم ذہنی حیثیت سے پست واقع ہوا ہے تو اس کی تلافی اس طرح کی جائے کہ کچھ اعزازی فرائض اسے تفویض کئے جائیں، مثلاً ایسے لڑکوں کو عریف بنایا جائے اور ترغیب دلائی جائے کہ وہ اس کام کو خوبی کے ساتھ انجام دیں۔ اس سے نہ صرف اُس کی خود اعتمادی اور ذاتی وقار میں اضافہ ہوگا بلکہ وہ احساسِ کمتری کے بُرے نتائج سے محفوظ رہے گا۔

(۲) تعلیمی طبّی ادارہ | ہر مدرسے میں ایک تعلیمی طبّی ادارہ قائم کیا جائے جہاں پس افتادہ طلبہ کی ذہنی جانچ کی جائے اور اس سے متعلق مفید مشورے دئے جائیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ طلبہ کی ذہنی پستی ذہنی نقائص کے بجائے مزاجی خرابی (تلوّن مزاجی) کی وجہ سے ہوا کرتی ہے۔ یہ اسی وقت دور ہو سکتی ہے جبکہ ایسے طلبہ تعلیمی طبّی ادارہ کی طرف رجوع کریں۔ مسٹر برٹ محکمۂ تعلیمات لندن کاؤنٹی کاؤنسل کے ماہرِ نفسیات نے اپنے تجربے کی بنا پر لکھا ہے کہ "میں نے بار بار تجربہ کیا ہے کہ ایسے طلبہ جن کو مدرسین نہایت پس افتادہ خیال کرتے ہیں تعلیمی کلینک کے مشورے کے بعد جب خاص طور پر اُن کو تعلیم دی گئی تو وہ صرف ۶ ماہ کے اندر طبعی عمر کے لحاظ سے جماعت میں کام کرنے کے قابل ہو گئے۔"

(۳) ماہرِ تعلیمی نفسیات سے مشورہ | مدرسے میں ایک ماہرِ تعلیمی نفسیات ہونا چاہئے جو عملی تعلیمی تجربہ رکھنے کے ساتھ نفسیاتی تربیت یافتہ ہو۔ یہ شخص اجتماعی آزمائشوں کے ذریعے ہر طبقے کا معائنہ کرنے کے بعد قابل اصلاح طلبہ کا انتخاب کرے اور مدرس کو ان کے لئے مخصوص طریقہ ہائے تعلیم کے اختیار کرنے کا مشورہ دے۔ دیگر متمدن ممالک میں تعلیمی طبی ادارہ ماہرِ تعلیمی نفسیات سے لازماً استفادہ کرتا ہے۔ میرے خیال میں مناسب ہے کہ اس مفید مطلب کے لئے ہر مدرسے کے کسی تجربہ کار مدرس یا ٹرینڈ گریجویٹ کو طبی تعلیم دلاکر اس کام کے لئے مختص کیا جائے کیونکہ ایسے شخص سے تعلیمی طبی خدمات اور ماہرِ نفسیات تعلیمی کے فرائض کے ساتھ ساتھ تدریس کا بھی کام لیا جا سکتا ہے۔

(۴) اقامتی مدرسہ | ہر مدرسہ اقامتی ہونا چاہیے جہاں کا طرۂ امتیاز یہ نہ ہونا چاہیے کہ عمارت شاندار اور خوبصورت ہے بلکہ وہاں کے طلبہ کی نگہداشت کا لائحہ عمل ایسا ہونا چاہیے کہ طلبہ میں گھروں کی زندگی بسر کرنے سے جس قسم کی پس افتادگی پیدا ہوتی ہے دور ہوتی رہے، مثلاً معقول غذا نہ ملنے کے باعث، نیند برابر نہ ہونے کے باعث یا ادراکی ذخیرے کی عدم موجودگی کے باعث یا غیر حاضری کے باعث غرض تدریس اور اقامتی زندگی میں حقیقی ربط اور ایک دوسرے کے اثر سے طلبہ کے نقائص دور ہوتے رہیں

(۵) ڈالٹن پلان | جماعتی تدریس میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان کو دور کرنے کے لئے جو طریق ڈالٹن پیش کیا گیا ہے اس میں بھی ہم بڑی حد تک پس افتادگی کو دور ہوتا دیکھتے ہیں کیونکہ جو طلبہ غیر حاضری کی وجہ سے جماعتی تدریس میں پس افتادہ ہوجاتے ہیں وہ طریق ڈالٹن میں پس افتادہ ہونے نہیں پاتے کیونکہ اس میں ان کو سبق کی تکمیل انفرادی طور پر کرنی پڑتی ہے اور یہ اپنی کمزوری انفرادی طور پر مدرس پر ظاہر کرکے دور کرسکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کو اجتماعی طور پر مشورے بھی حاصل ہوتے رہتے ہیں۔

(۶) مدرس اور صدر مدرس | ایک تجربہ کار اور نفسیات داں مدرس بھی جماعت ہی میں غائب دماغی اور عدم توجہی جیسے نقائص دور کرسکتا ہے۔ پہلے زمانے میں صدر مدرس اپنے فرصت کے اوقات میں مخصوص بچوں کو بذات خود تعلیم و تربیت دیا کرتا تھا اور یہ طریقہ بہت کامیاب رہا کیونکہ صدر مدرس مدرس کے مقابلے میں اکثر تجربہ کار اور جہاں دیدہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ایسے نادر اور غیر رسمی طریقے اختیار کرسکتے ہیں جن کو مدرس استعمال کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔

(۷) اتالیقی نظام | اتالیقی نظام بھی پس افتادگی دور کرنے میں بڑی حد تک ممد و معاون ہوسکتا ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ بعض طلبہ ایک مضمون میں پس افتادہ ہوئے ہیں تو دوسرے مضمون میں ان کی حالت اچھی ہوتی ہے۔ ہر جماعت مثلاً دہم کے جملہ فریقوں کے ایک مضمون کے کمزور اور پس افتادہ طلبہ کا ایک گروہ اور زیادہ ہوں تو دو گروہ بناکر مدرس متعلقہ کے زیر اتالیقی کردیا جائے کیونکہ ایسا اتالیق جماعتی تدریس کے علاوہ طلبہ سے ملاقات کے موقع پر ان کی اُس مضمون کی مشکلات اور کمزوریاں انفرادی طور پر معلوم کرکے اُن کو رفع کرسکے گا اور طلبہ

مفید مشوروں سے استفادہ کرسکیں گے۔ نیز اتالیقی نظام کے مقاصد سیرت و کردار کی درستی، سیر و تفریح وغیرہ بھی ضمناً پورے ہوتے جائیں گے۔

مختار احمد

سلامِ بہار بہ ہندِ بزرگ

(ہندوستان کی تاریخ میں شاید پہلی بار تمام ایشیائی ممالک کے مشاہیر اس کے پایۂ تخت دہلی میں جمع ہونے والے ہیں۔ ایران سے بھی، جس کے ساتھ ہمارے ملک کا قدیم الایام سے نہایت گہرا تمدنی تعلق رہا ہے، ایک وفد ہز اکسلنسی آقا اصغر علی حکمت کی سرکردگی میں اس ایشیائی کانفرنس میں شرکت کے لئے آیا ہے۔ اس موقع پر ہم ایرانی ملک الشعراء بہار کی ایک نظم شائع کرتے ہیں جس میں نہایت دلنشیں انداز میں ایران اور ہندوستان کے تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مدیر)

باز جنگِ فکرتم جولاں گرفت — باز فیلم یادِ ہندستاں گرفت
تا خیالم نقشِ روئے ہند بست — یافت ذوقم جلوۂ طاؤسِ مست
بلبلِ فکرم خوش آوائی نمود — طوطیِ طبعم شکرخائی نمود
بستہ ام پاتاوہ بر پائے نیاز — تا شود در ہند آں پاتاوہ باز
دل اسیرِ حلقۂ زنجیرِ ہند — جاں فدائے خاکِ دامن گیرِ ہند
بس ملاحتہا در آں خاکِ ہواست — ہند را کانِ نمک خواندن رواست
آں نمک زارے کہ خاکش عنبراست — خارِ او چپا خسش نیلوفراست
محکرہا رنگین و رنگیں خوی ہا — رنگِ بے رنگی عیاں بر روی ہا
لشکرِ یوناں ازآں جا دم گرفت — عبرت از کارِ بنی آدم گرفت

شد عرب در ہند وحدت پے فکند — عاقبت آں جا عرب ہم لے فکند
ترک آں جا ترکی از سر وا گرفت — فارسی بود آنکہ آں جا پا گرفت
ایزدی بود آشنائی ہائے ما — آشنا داند صدائے آشنا
ہند و ایراں آشنایان ہمند — گر نہ ہم رنگند از یک عالمند
آنکہ گندم خورد و دور از خلد ماند — در سراندیب آمد و گندم فشاند
خاکِ ہند از خلد دارد بہرہ ہا — رنگ آں گندم عیاں بر چہرہ ہا
گرچہ گندم گوں و سیگوں آدمیم — ہر دو از یک خمرہ بیروں آمدیم
چوں فلاطوں خم نشینانِ حکیم — واز فلاطون و دیوجن استقیم
ساغرے گیر از مئے عرفانِ ہند — نوش بادِ پارسی گویانِ ہند
یاوے از مسعود سعد راد کن — بعد یاد رونیِ استاد کن
آنکہ چوں سعدی سخنگوئے نواست[1] — بلبلِ گلزارِ دہلی خسرو است
طبعِ پاکش مایہ دارِ فکر بود — صد ہزاراں بچہ زاد و بکر بود
با حسن صد لطف و گرمی توام است — در کلامش آتش و گل باہم است
بزمِ اکبر شد ز فیضی فیض یاب — پادشاہِ شاعراں بودش خطاب
طبعِ عرفی خوش بہ مضموں راہ بُرد — نہ کز ایں پیرا ہم پا چالاہ بُرد
با کلیمش ساحراں را نیست تاب — کس نگفت آخر سہ بیتش را جواب[1]

۱؎ اشارہ بہ بیت زیر است:-

طبعے بہم رساں کہ بسازی بعالمے — یا ہمتے کہ از سرِ عالم توان گذشت
[illegible] — آنہم کلیم با تو بگویم چساں گذشت
[illegible] — [illegible]

از نظیری و ظہوری دم مزن — ہند و ایراں را دگر برہم مزن
گر ز تبریز است یا از اصفہاں — ہست صائب طوطیِ ہندی زباں
خاکِ آمل دامنش از دست داد — لاجرم طالب بہ ہندوستاں فتاد
از ہمایوں گیر تا شاہِ جہاں — شاعراں را ہند بود آرامِ جاں
ہند بازارِ خریدِ ذوق بود — ہند یکسر عشق و شور و شوق بود
صنعت و ذوق و ہنر ترکیب یافت — در صفاہان دہری ترتیب یافت
بس رواں شد کارواں در کارواں — تنگہائے دل سر از کالائے جاں
رشکِ غزنیں گشت بزمِ اکبری — نغمہ خواں ہر سو ہزاراں عنصری
بزمِ نورالدیں گلستانے دگر — در گہِ نورِ جہاں جانے دگر
ہزلہ گو از شاہ تا بانو ہمہ — پیشِ یک مصرع زدہ زانو ہمہ
جوشِ ایہام و مثل چوں موجِ آب — نکتہ بر ہر موج خنداں چوں حباب
کارِ تاریخ و تتبع تازہ گشت — صنعتِ انشار بلند آوازہ گشت
در لغت فرہنگ ہا پرداختند — لعبہا در دین و حکمت باختند
کارِ نقاشی بسے بالا گرفت — خوش نویسی پایۂ والا گرفت
صنعِ معماری بسے پیرایہ یافت — ذوقِ تجاری فراواں مایہ یافت
ثروت و جاہ و رفاہ و خرمی — صلح و عیش و خوشدلی و بیغمی
گرچہ امروز آں جلال و جاہ نیست — ہیچ کس از رازِ دہر آگاہ نیست
نیست گر آں کرّ و فر لطفے بجاست — رفت اگر آں کیف کیفیت بجاست
نیست گر دہلی ز اکبر پُر خروش — میزند ہر گوشہ دیگ علم جوش
ور نمی خندد بہر گل صد ہزار — باز نالد قمریے بر شاخسار
نائبے کند اگر شد غالبے — شبلیٔ ہست ار نباشد طالبے

بیدلے گر رفت اقبالے رسید ‏ بیدلاں را نوبتِ حالے رسید
بیدلے گشت ز سخن گوئی بیا ‏ گفت کل الصید فی جوف الفرا
قرنِ حاضر خاصۂ اقبال گشت ‏ واحدے کاز صد ہزاراں برگذشت
شاعراں گشتند جیشے تار و مار ‏ ویں مبارز کرد کارِ صد سوار
اے بہار از ہند دم با من مزن ‏ بیش ازیں بر آتشم دامن مزن
طوطیِ بازارگانم من مُدام[1] ‏ طوطیانِ ہند را گویم سلام
ز آرزوئے دیدنِ یارانِ ہند ‏ می چکد از دیدہ ام بارانِ ہند
عمرِ من در زحمت و محنت گذشت ‏ میروم حالے بسوئے پنجاہ و ہشت
در چنیں ہنگامہ چالاکی سزاست ‏ می نیم چالاک و دوراں بیوفاست
لا علاج از دور بوسم روئے ہند ‏ گر خدا خواہد بپرم سوئے ہند
ہاں سلامے می فرستم سوئے یار ‏ بے ریا تر از نسیمِ نوبہار
گویم اے ہندِ گرامی شاد زی ‏ سال و ماہ از بندِ غم آزاد زی
جز یکے نبود سراپائے وجود ‏ قطرہ قطرہ محوِ دریائے وجود
از جدائی بگذر و مانوس باش ‏ قطرگی بگذار و اقیانوس باش
جز برائے یک دلے سالک مباش ‏ محوِ یکتائی شو و مشرک مباش
زیں قناعت پیشگی پرہیز کن ‏ مرکبِ ہمت بجولاں تیز کن
ہمت از آمالِ کوچک باز گیر ‏ تا فرازِ کہکشاں پرواز گیر

---

[1] اشارہ است بہ حکایت مثنوی مولوی "بود بازرگانے و او را طوطیٔ"

فقر و درویشی تباہت می کند | در دو عالم رُو سیاہت می کند[1]

با بزرگی و غنی درویش باش | با تواضع پادشاہِ خویش باش

صنعت و علم و اُمید و اتحاد | کسب کن تا وا رہی از انفراد

شمۂ گویم ز استقبالِ تو | ایں نہ من گویم کہ گفت اقبال تو

"زندگی جہد است و استحقاق نیست | جز بہ علمِ انفس و آفاق نیست

گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر | ہر کجا ایں خیر را دیدی بگیر

فارغ از اندیشۂ اغیار شو
قوتِ خوابیدۂ بیدار شو"

م۔ بہتار

---

[1] اشارہ است بہ حدیث " الفقر سواد الوجہ فی الدارین "

آخری رشتہ

(گذشتہ سے پیوستہ)

"مجھے موت بھی نہیں آجاتی کہاں سے لاؤں اور پورا کروں۔ مجھے تو کپڑے بھی نصیب نہیں ہوتے۔ میرے توسارے کپڑے پھٹ گئے۔ تن ڈھکنا بھی تو ہے۔"

وہ بلکتی اور آنسو پوچھتی کوٹھری میں گھس گئی۔ میں نے کہا۔

"بیچاری رو رہی ہے۔ یہ کیسے ظالم بھائی ہیں۔ ان کو شرم نہیں آتی بہن کی کمائی پر بیٹھے ہیں اور پھر یہ زور ضابطہ ساری تنخواہ ضبط کر لی۔"

مُنّن جل کر بولیں " ان کے یہاں روز یہی قصے رہتے ہیں۔ پہلی تاریخ کو یہ ہنگامہ ضرور ہوتا ہے۔ جاکر تنخواہ بھائی کے ہاتھ میں رکھ دیتی ہیں۔ کبھی وہ رحم کھا کر ایک آدھ روپیہ دے دیتے ہیں ورنہ ساری ہضم کر لیتے ہیں۔ پھر کمانے سے مطلب نہیں۔ خشک جنس میں ان کو دیتی ہوں۔ صبح کی چائے دیتی ہوں۔ بس اوپر ہی اوپر میں اڑاتے ہیں چائے، گڑ، بیڑی، ایندھن۔ گرانی کا زمانہ اس پر شاہانہ اخراجات۔ ان کو کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ اور سمجھاؤ تو نہ بہن کی کچھ سمجھ میں آتا ہے نہ بھائی کی۔ یہ دئے جاتی ہیں مرمر کے وہ اپنے اٹھائے جاتے ہیں۔ قرض اتنا ہو گیا ہے اس کی انھیں فکر نہیں۔ جب یہاں کھانے جاتی ہیں میں دو چار آنے اوپر سے دیا کرتی ہوں۔ کپڑے بنا ہی کرتے ہیں۔ کہاں تک کوئی ان بہن بھائی کا پورا کرے۔ رکھ کر جان عذاب میں پڑ گئی۔"

اس وقت عارف میاں آگئے اور بیوی سے مخاطب ہو کر بولے۔

"کہو بیگم یہ کس پر عتاب ہے۔ کیا ہوا"

میں [illegible] منّن نے کہا۔

"ارے کچھ نہیں احمدی کا قصہ ہے۔ ساری تنخواہ بھائی نے لے لی اب سر پیٹ رہی ہے"
"اُنہہ یہ تو ہوتا ہی رہے گا۔ کچھ مہمان آگئے ہیں جلدی سے چائے باہر بھیجو۔ اور باجی آپ نے یہ سموسے جو تلے ہیں ہمیں بھی ملیں گے؟"
"کیوں نہیں۔ تم چلو جب تک چائے لگے میں ابھی گرم گرم اتار کر بھیجتی ہوں" وہ چلے گئے ہم لوگ چائے کے انتظام میں مصروف ہو گئے۔

احمدی ذرا دیر میں بدستور اپنے کام میں لگ گئی معلوم ہوتا تھا کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس کے معمول میں کوئی فرق نہیں۔ بھائی کی ہر وقت فکر رہتی۔ صبح کو جب چائے ملتی وہ پہلے بھائی کو پلا آتی۔ جیسے کھانا ملتا لپک کر جاتی اور سالن ترکاری دے آتی۔ کبھی اس کے منہ کا مزہ خراب ہو رہا ہے۔ خود دال چاول اور روٹی بھر لیتی۔

رات کا وقت تھا چاندنی چھٹکی تھی۔ نیلے صاف آسمان پر جھلملاتے ہوئے تارے بڑے پیارے لگ رہے تھے۔ زمین، درخت در و دیوار ہر چیز پر مہین چادر سی بچھی تھی۔ ٹھنڈی ہوا دامن میں خوشبو بھرے اڑتی پھرتی تھی۔ احمدی دالان میں بچے کو لوریاں دے رہی تھی اور بچے چاندنی میں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ میں صحن کی دیوار کے پاس کھڑی قدرت کا دل کش تماشہ دیکھ رہی تھی۔ شمو لپک کر میرے پاس آیا۔

"اماں ذرا چلئے دیکھئے وہاں کیا ہو رہا ہے۔
"کہاں؟" "آیئے جلدی سے۔ ایک تماشہ دیکھئے"
شمو کے اصرار سے میں اس کے ساتھ ہو لی وہ مجھے احمدی کے بھائی کی کوٹھری کے پاس لے گیا۔

اندر ایک چراغ روشن تھا۔ ایک کھاٹ پر میلا سا بستر گدڑی کی طرح الجھا پڑا تھا۔ الگنی پر پھٹے پھٹے کپڑے لٹک رہے تھے۔ کچھ برتن، پانی کا گھڑا، ہانڈیاں سب چیزیں بے ترتیب پڑی تھیں۔ بیچ میں بوری پر جائے نماز بچھائے احمدی کے بھائی بیٹھے تھے

دونوں ہاتھ اونچے اٹھائے ہوئے وہ زور زور سے کہہ رہے تھے۔

"اے خدائے جل شانہٗ تو بڑا رحیم ہے۔ میری بہن پر رحم کر۔ اس نے جو گناہ کیا ہو وہ بخش دے۔ اس نے کبھی چوری کی ہو تو معاف کر۔ کبھی جھوٹ بولی ہو تو معاف کر۔ اس کے سب گناہ معاف کر دے۔ اسے نیکی کی توفیق دے۔ اسے خوش اور تندرست رکھ اور اسے جنت نصیب کر۔ اے اللہ تو ہی میری غریب بہن کا مالک ہے ....

یہ کہہ کر وہ سجدے میں گر پڑے، پھر کچھ پڑھ پڑھ کر اپنے اوپر اور چاروں طرف دم کرنے لگے۔

شمو اور سب بچوں سے ہنسی ضبط نہیں ہو رہی تھی۔ میں فوراً وہاں سے ہٹی اور سب کو بھگا لائی۔

ایک دن سہ پہر کو احمدی دھوپ میں دروازے سے لگی کھڑی تھی اس کی نظریں باہر ہی پھاٹک پر تھیں۔

میں ادھر سے نکلی تو اسے کھویا کھویا سا دیکھ کر پوچھا

"کیوں کھڑی ہو احمدی ؟"

"بھیا ابھی تک نہیں آیا .... صبح کے گئے ہیں ...."

"کہاں گئے ہیں ؟"

"حضور بات یہ ہے کہ روز تو سودا یہیں سے لے لیتے تھے۔ کئی دن سے مجھ سے کہہ رہے تھے کہ یہاں کی دوکان پر سودا بڑا مہنگا ملتا ہے شہر سے جاکر لاؤں گا۔ میں نے منع بھی کیا نہیں مانے .... دور بہت ہے کہا کہ کیا ہے پیدل ہی چلا جاؤں گا کرائے کے پیسے بچیں گے۔ میں نے اتنا کہا کہ تانگا کر لینا مگر پیدل ہی چلے گئے۔

شام ہونے کو ہے ابھی تک نہیں آئے۔ جانے کیا بات ہے !"

یہ کہتی ہوئی وہ میرے ساتھ چلی آئی۔ چہرہ پریشان کملایا سا۔ جوں جوں وقت گزرتا اس کی پریشانی بڑھتی جاتی، کبھی اندر آتی، کبھی باہر جاتی، کہیں چین نہیں تھا۔

مغرب سے ذرا دیر پہلے وہ خوش خوش اندر آئی۔

نبیا آگیا؟ ہاتھ میں کچھ پان لئے ہوئے۔ پڑیا میں کوئی اور چیز۔ اس وقت اس کے چہرے پر روحانی مسرت جلوہ گر تھی جیسے سوکھے دھانوں میں پانی پڑگیا۔ ہاتھ پاؤں میں جیسے نئی قوت اور توانائی آگئی۔ بجلی کی سی رفتار سے وہ چلنے پھرنے لگی۔ بات بات پر ہنسی آرہی تھی۔

زلفن بوا نے پوچھا :۔

"آگئے تمہارے بھائی ؟"

اس نے بچے کا بستر جھاڑتے ہوئے جواب دیا

"ہاں، اللہ کا شکر ہے۔ آگئے، طاقت تو ہے نہیں۔ اس پر پیدل گئے پیدل ہی آئے........"

تھک گیا ہے۔ چور چور ہو گیا........ میں نے کہا" اب مسجد نہ جاؤ گھر ہی پر نماز پڑھ لو، مگر نہیں مانا۔

میری تو سنتا ہی نہیں ؟

یہ کہہ کر کٹورے سے ہرے ہرے پان نکالتے ہوئے بولی

"یہ دیکھو کیسے اچھے پان لایا ہے۔ بھلا یہاں ایسے ملتے ہیں کہیں ؟

اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"نہیں........ اپنے لئے لایا ہے، اس کو شوق ہے جب اچھل جاتے میں کھا لیتا ہے۔ مجھے بتا کر بے دون گی۔ ہاں ہاں سے لون گی میں بھی

وہ ایک کپڑے میں نہیں، میرے پاس پیسہ ہی نہیں تھا جو منگاتی۔ جتیا رہے نے
آپا ہی کھا لوں گی۔

آصف مجیب

انتظار

ایک افسردہ مسافر ہے سرِ راہ گذار
جس کے، واماندہ نگاہی نے قدم تھام لئے
تابِ یک گام بھی جیسے نہ رہی ہو اُس میں
دور ہی دور سے آسودگیٔ ذوقِ سفر
سامنے جنت و فردوسِ نظر ہے منزل
سوچ لیتا ہے کہ "تکنا ہے سفر کا حاصل"
"یہ بھی ہو سکتا ہے منزل ہی چلی آئے یہاں"
کون سمجھائے ؟ کہ، خودداریٔ منزل ہے یہی
ایسے راہی سے بہت دور چلی جاتی ہے

... ...

کھیت کی ڈول پہ بیٹھا ہے تنومند کساں
ہل کی پھالی ہے چمکتے ہوئے سورج کے طفیل
آئینہ فصلِ بہاراں کی فراوانی کا
خود فریبی کی قسم لب پہ ہے دہقاں کے مگر
"رازِ فطرت مجھے سمجھا گیا بختِ بیدار"
"کس لئے ہل کی مصیبت کا اٹھاؤں میں بار"
"خود اُگل دے گی زمیں آج تو خرمن خرمن"
کون سمجھائے ؟ کہ، امیدِ بہاراں ہے عبث
ہل کی پھالی پہ لگا زنگ۔ اُبھر آئے ببول

اک جواں ہاتھ میں کشکولِ گدائی لے کر
ہر گذرتے ہوئے راہی کو تکا کرتا ہے
اُس کی چتون میں تڑپ جاتے ہیں ایسے جوہر
جن سے آبا کی شرافت کا پتہ چلتا ہے
ذہن میں جیسے اُبھر آئے بہ عنوانِ حزیں
دورِ ماضی کا فراموش شدہ خوابِ حسیں
یہ تعیش کا تصور بھی ہے دریوزہ گری
کون سمجھائے؟ کہ، رہزن ہے جہانِ گذراں
لوٹ لیتا ہے مگر لا کے نہیں دیتا ہے

... ...

کوئی افسردہ مسافر سے یہ جا کر کہہ دے
"وادیٔ شوق میں منزل تو کوئی چیز نہیں"
"جادہ، مدت سے تری راہ تکا کرتا ہے"
بھولے دہقان کے شانے کو پکڑ کر کہہ دے
"سادہ لوحی پہ تری سطحِ زمیں خنداں ہے"
رشکِ یوسف ہو جواں اور گدائی پیشہ
مصر کے تخت سے آوازِ فغاں آتی ہے
اپنے کشکولِ گدائی کو زمیں پر پھینکے
گرمیٔ خوں کے تقاضے کوئی مبہم تو نہیں

... ...

ابوالکاظم قیصر زیدی

تعلیمی دنیا

نئے تعلیمی قانون کی رو سے انگلستان میں لازمی تعلیم کی عمر اسی سال پندرہ برس کی جانی ہے یہ تبدیلی یکم اپریل ۴۷ء سے ہونی تھی اندرونی مشکلات کے باعث ایسا کرنے میں کچھ تامل سا تھا۔ مکانات کی کمی تھی، استادوں کی کمی تھی، صنعت میں کام کرنے والوں کی کمی تھی۔ ۳ سے ۴ لاکھ کی تعداد میں نوجوانوں کو کام سے الگ اور مدرسوں سے زیر تعلیم رکھنا کچھ سہل نہ تھا۔ کچھ افواہ سی پھیلی کہ لازمی تعلیم کی مدت میں اضافہ یکم اپریل سے نہ ہو سکے گا۔ تو ملک کے تعلیمی کام کرنے والوں نے ایک شور بپا کر دیا۔ استادوں نے تعلیمی انجمنوں نے، اخباروں نے، اس احتمال پر ہی سخت تنقید شروع کر دی۔ مسئلہ وزرا کے سامنے گیا اور فیصلہ یہ ہوا کہ باوجود تمام دشواریوں کے لازمی تعلیم کی عمر یکم اپریل ۴۷ء ہی سے بڑھائی جائے! برطانوی وزیر اعظم کا قول اس سلسلہ میں قابل توجہ ہے۔ انھوں نے کہا "بے شک ہمارے پاس آدمیوں کی کمی ہے کمیت کی تلافی ہمیں کیفیت سے کرنی ہوگی۔ اسی لئے ہم لازمی تعلیم کی مدت کو بڑھا رہے ہیں"! سچ ہے زندہ انسانوں کے لئے مشکلیں سہل کرنے کے لئے ہوتی ہیں۔ بے عملی کے عذر فراہم کرنے کے لئے نہیں۔

(۲)

شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ انگلستان کے نئے قانون تعلیمی کی روح سب طبقوں کے لئے تعلیمی مواقع کی مساوات پیدا کرنا ہے۔ لیکن سب مجرد خیالات کی طرح اس کو بھی حد مناسب سے آگے لے جانا ممکن ہے انگریزی قومی زندگی کی امتیازی خصوصیات میں اس کا توازن بڑی اہمیت رکھتا ہے یعنی د

نیسار میں بیچ کی سرا ہ ۔ چنانچہ مساوات کے رائج عام خیال کی چند خامیوں کی طرف آکسفورڈ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر رچارڈ لیونگسٹن نے تعلیمی انجمنوں کی کانفرنس منعقدہ لندن میں ایک خطبہ دیا جس پر انگلستان کے تعلیمی حلقوں میں بحث ہو رہی ہے۔ ذیل میں کچھ اقتباس درج کئے جاتے ہیں۔

مساوات مطلق کی دشواریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا "اگر ہمارے سامنے ایک صاف نئی تختی ہوتی تو ممکن ہے اس میں ذرا آسانی ہوتی۔ مگر ہماری تختی تو بہت پرانی اور اس پر بہت کچھ لکھا ہوا بھی ہے۔ اسے مٹانا ممکن بھی ہوتا تو اس پر جو لکھا ہے اس میں بہت کچھ ایسا اچھا اور قیمتی ہے کہ ہم اسے کبھی نہ مٹاتے۔ دو مثالیں لیجئے۔ ہمارے اقامتی مدرسے شاید دنیا بھر میں عام تمدنی شہری تعلیم کے بہترین مرکز ہیں اور ہم ان کی پوری پوری قدر کریں یا نہ کریں دنیا ان کی قدر کرتی ہے لیکن مصارف کی وجہ سے یہ چند ہی طلبہ کی تربیت کرسکتے ہیں اور اگر ہم انھیں امیروں کے لئے نہ رکھیں بلکہ وسائل فراہم کرکے کسی دن ان کے طالب علموں کو صرف انکی قابلیت اور خوبی کے لحاظ سے چن بھی سکیں تب بھی ان میں اتنا صرف ہوتا ہے کہ یہاں تعلیم کا موقع سب کو نہ دیا جاسکے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہی حال پرانی اور نئی یونیورسٹیوں کا ہے میں نے نئی یونیورسٹیوں کے کام کو خود دیکھا ہے اور اس کی قدر کرتا ہوں لیکن اگر آپ ان میں اچھے اچھے اقامت گاہ بھی بنا دیں اتالیقی کا طریقہ بھی رائج کردیں تب بھی انھیں بوڈلین جیسا کتب خانہ کہاں سے دے سکیں گے؟ یا آن کی آن میں وہ عمارتیں اور روایات کیسے فراہم کردیں گے جو سات سو برس میں آہستہ آہستہ بن پائی ہیں اور آکسفورڈ کیمبرج میں تو بہرحال تھوڑے ہی سے لوگوں کو تعلیم دی جاسکے گی!"

ثانوی اور ابتدائی مدرسوں میں استادوں کی تنخواہوں کو یکساں کرنے کے متعلق فرمایا "یہ کوئی دلیل نہیں کہ کنڈرگارٹن اور ابتدائی مدرسوں کا کام اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ ثانوی مدرسے کے معلم کا کام اور اس لئے تنخواہ میں تفاوت بیجا ہے۔ اس دلیل کے نتیجے مشتبہ ہیں اور اس کا نتیجہ غلط۔ بےشک سادہ اور ابتدائی تعلیمی کام اہم کام ہے۔ ہسپتال میں بھی تیمارداروں کا کام بہت اہم ہوتا ہے لیکن ڈاکٹر یا سرجن اور تیماردار کو کوئی ایک سا معاوضہ دینے کی تجویز نہیں کرتا یہ سیدھی بات ہے

کہ اچھا ڈاکٹر بننا اچھے تیار دار بننے سے مشکل ہے اور کم لوگ اس کام کو کما حقہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کی خدمات حاصل کرنے کے لئے انھیں زیادہ معاوضہ دینا پڑتا ہے۔ یہی حال تعلیم میں ہے۔۔۔۔۔۔
مساوات پر اصرار کے معنی کہیں یہ نہ ہو جائیں کہ ایک پست سطح پر مساوات قائم ہو جائے۔
۔۔۔۔۔۔ اگر ہم ایک جمہوری تہذیب قائم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ایک اور چیز بھی ہے جو مساوات سے کسی طرح کم اہم نہیں ہے وہ چیز خوبی اور کیفیت ہے یعنی ہر چیز کا اول درجہ کا ہونا، فکر کا، تخیل کا، علم کا، عمل کا۔۔۔۔۔۔ آرٹ میں، افکار میں، عمل میں قوم کے پاس جتنے درجہ اول کے لوگ ہوں گے اتنی ہی اس کی زندگی زیادہ پُر ہو گی۔ ہم آہنگی یک آہنگی سے بلند مرتبہ چیز ہے۔ اس کیفیت سے نظر ہٹا لیجئے اس کو پس پشت ڈال دیجئے، اس کی ہمت افزائی نہ کیجئے اسے سہارا نہ دیجئے۔ اور ساری قوم نقصان اٹھائے گی۔ اوسط مذاق اور قابلیت کی سطح پر جمہوریت پست قسم کی جمہوریت ہو گی اس جمہوریت کو دیکھنا ہو تو اپنے مرغوب عوام فلم اور روزانہ اخباروں کو دیکھئے۔ اس کا حاصل کرنا سہل ہے لیکن یہ کوئی حاصل کرنے کی چیز ہے نہیں۔ یہ تنقید کو چپ کر سکتی ہے اور اپنی تعریف آپ کر سکتی ہے لیکن اس کی کوئی قدر نہ ہم عصروں کی دنیا کے لئے ہے نہ کوئی اہمیت مستقبل کے واسطے۔ اگر ہم نے بروقت خبر نہ لی تو ہم اس قسم کی جمہوریت قائم کر سکیں گے۔ لیکن یہ وہ قسم نہیں جس کے قائم کرنے کی خواہش ہمیں کرنی چاہئے"

(۳)

روس نے اپنے اشتراکی انقلاب کے بعد سے معیشت، معاشرت، تعلیم میں جو غیر معمولی کامیابیاں حاصل کی ہیں اور پچھلی جنگ میں جس مردانگی اور بے جگری سے ایک زبردست دشمن کو شکست دے کر اپنی قومی زندگی کی حفاظت کی ہے اس نے تمام بیدار لوگوں کو اس کے تعمیری کاموں کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔ تعلیم میں بھی اس نے بہت کچھ کیا ہے لیکن اس میں حالات کے تغیر کے ساتھ ساتھ برابر تغیر بھی ہوتا رہا ہے۔ حال ہی میں ایک انگریز معلم ڈونالڈ سیگ نے چند ماہ کے دورے کے بعد روس کے تعلیمی حالات پر ایک مضمون جرنل آف ایجوکیشن میں لکھا ہے جس سے وہاں کے

موجودہ تعلیمی رجحانات پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ سیگر کا خیال ہے کہ روسی مدارس کے درس میں ایک ہیجان سی رسمیت اور یکسانیت بہت پیدا ہو گئی ہے۔ جس پر خود اچھے روسی معلم شورش نظر آتے ہیں۔ دوسرا رجحان یہ نظر آتا ہے کہ روس کی جماعتی زندگی کے دوسرے شعبوں میں جس طرح ترغیبات اور انعامات کا رواج بڑھ رہا ہے اسی طرح تعلیم میں بھی ہے اور روز بروز بڑھتا جاتا ہے تیز اور ذہین بچوں کے لئے خاص سہولتیں بہم پہنچانے کے رجحان کو بھی برابر ترقی ہو رہی ہے۔ چوتھی چیز جو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے یہ ہے کہ مدرسے کی زندگی اور قومی زندگی کے واقعی مسائل میں ربط پیدا کرنے کی کوشش شدت سے جاری ہے۔

یکسانیت اور رسمیت مدرسوں کی عمارتوں سے بھی ظاہر ہوتی ہے اور جماعتوں کے درس سے بھی۔ اسٹالن گراڈ کے ویرانوں میں دیکھتے دیکھتے ۵۶ نئے مدرسے کھڑے ہو گئے ہیں۔ ان کی عمارتیں ہر چند کہ بہت اچھی عمارتیں ہیں لیکن سب ایک سی بڑی بڑی عمارتیں ہیں یہ روسی بچوں کی کارگاہیں ہیں۔ ان کے کھیل کود کی جگہیں نہیں معلوم ہوتیں۔

بالکل چھوٹے چھوٹے بچوں کے مدرسوں میں بھی ضبط و نظم بہت سخت قسم کا ہے۔ بچے بیٹھتے ہیں تو کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے۔ جواب دینا ہوتا ہے تو اس طرح کھڑے ہوتے ہیں جیسے کوئی فوج کا نوسکھ سپاہی! سامان تعلیم کا استعمال مقابلتہً کم ہے۔ درسی کتابوں کی بھی بہت کمی ہے کمزور اور پس افتادہ بچوں کی طرف زیادہ توجہ نہیں ہے۔ یہ پیچھے رہنے والے پیچھے ہی چھوٹ جاتے ہیں۔ زیادہ توجہ ذہین ہونہار بچوں کی طرف ہے انھیں یونیورسٹی تک مفت تعلیم دلائی جاتی ہے اور ملک کے لئے اچھے سے اچھے انجینیر، ڈاکٹر، آرٹسٹ اور سائنس داں فراہم کرنے کی سبیل کی جارہی ہے۔ پس افتادوں کو آگے بڑھا سکنے کے لئے وسائل کی فراوانی کا انتظار ہے۔

تعلیمات کی تحقیقاتی اکادمی اس وقت خاص طور پر مدرسوں کے کام کو کارخانوں اور کاروبار سے مربوط کرنے کے وسائل دریافت کرنے میں مصروف ہے مثلاً حیاتیات کے نصاب کو مدرسے کے باغ اور ترکاری کی کاشت سے مربوط کیا جارہا ہے۔ اسٹالن گراڈ کے مضافات کے بجلی

کے ٹریننگ اسکول میں ابھی یتیم بچیوں نے چھ سو مکانوں میں بجلی کے تار خود لگائے ہیں آس پاس
کی زندگی میں کام کے مواقع نکالنے کے لئے مدرسے کے نظام اوقات کو بدل دینے کا رواج عام
ہوتا جا رہا ہے

(۴)

چکوسلواکیا پر گذشتہ جنگ میں جرمنوں کے ہاتھوں جو گذری وہ سب کو معلوم ہے۔ اب یہ
قوم پھر اپنی زندگی کی تعمیر نو میں مشغول ہے اور اس کام میں تعلیم کو اس کا صحیح درجہ دے رہی ہے۔
نئی وزارت تعلیم نے جو نیا نظام بنایا ہے اس کا خاکہ یہ ہے۔

۱۔ تعلیم تمام تر بلا معاوضہ ہوگی۔ ریاست انتظام کرے گی، ریاست ہی نگراں ہوگی۔

۲۔ مدارس مندرجہ ذیل اقسام کے ہوں گے۔

(الف) بانک باڑیاں، چھ ہفتے سے تین سال تک کے بچوں کے لئے؛

(ب) ننھوں کے مدرسے، ۳ سے ۶ سال تک کے بچوں کے لئے؛

(ج) لازمی مدارس قسم اول، ۶ یا ۷ سال سے ۱۱ سال تک کے بچوں کے لئے انھیں ابتدائی مدرسہ یا سلواکیا میں بنیادی مدرسہ کہا جائے گا؛

(د) لازمی مدارس قسم دوم، ۱۱ سے ۱۵ سال تک کے بچوں کے لئے۔ انھیں ثانوی مدرسے کہیں گے؛

(ہ) پس افتادہ بچوں کے مدرسے؛

(و) لازمی مدارس قسم سوم، ۱۵ سال سے اوپر کے طلبہ کے لئے؛

(ز) مدارس قسم چہارم۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے؛

۳۔ سامان تعلیم اور اساتذہ کے معاوضہ کا صرف سب ریاست برداشت کرے گی۔

۴۔ بعض مدارس کو تجربہ کی خاطر بالکل آزاد کر دیا جائے گا؛

چیک زبان کو نظام اوقات میں پہلے سے زیادہ وقت دیا جائے گا۔ ابتدائی مدارس کی دو آخری جماعتوں

میں روسی زبان کا درس بھی دیا جائے گا۔ نئے طریقہائے تعلیم پر بھی خاصا کام ہو رہا ہے اور کوشش یہ ہے کہ ایسے طریقے رائج کئے جائیں جن سے سوچنے کی قوت، تنقید کی صلاحیت، باہمی تعاون کی عادت کو فروغ ہو۔ طلبا اساتذہ اور سرپرستوں میں تعاون کے مواقع فراہم کرنے کی خاص کوشش جاری ہے۔

سنہ ۳۵ء والی کتابیں پھر سے چھاپی جا رہی ہیں اور نئی کتابیں تیار ہو رہی ہیں درسی کتابیں سب ریاست کی طرف سے شائع کی جا رہی ہیں۔ نجی ناشرین کو حق نہیں دیا گیا ہے۔ تعلیمی تحقیقاتی ادارہ ان کتابوں کی تیاری اور ان پر نظر ثانی کا ذمہ دار ہے۔ ہر مضمون کے لئے دو اور زیادہ سے زیادہ تین متن تیار کی جا رہی ہیں۔ استادوں کی تربیت کے کام کے متعلق فیصلہ ہوا ہے کہ تمام تر یونیورسٹیوں میں ہوا کرے گا۔ ہر یونیورسٹی میں شعبۂ تعلیمات کے قیام کے انتظامات ہو رہے ہیں۔

مدارس میں نگرانی صحت کا اہتمام خاص طور پر کیا جا رہا ہے کم آباد علاقوں کے بچوں کو مدرسے میں لانے کے لئے اقامت گاہوں کا قیام عمل میں آ رہا ہے۔

غرض طرح طرح کے منصوبے بن رہے ہیں لیکن یہی نہیں کچھ کام بھی ہو رہا ہے۔

(۵)

میکسکو میں دیہی تعلیم کے تجربہ کو جامعہ ملیہ کے استادوں کے مدرسہ کے پرنسپل سعید انصاری صاحب نے اردو پڑھنے والوں سے اپنی کتاب "تعلیم اور سماج" کے ذریعے متعارف کرا دیا ہے۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں کوئی ۱۰۰ ان سکھ استاد میکسکو کے تھوڑے سے دیہی مدرسوں کو جیسے تیسے چلاتے تھے سنہ ۲۳ء میں پہلا تمدنی مشن میکسکو شہر سے ملک کے شمالی علاقوں میں کام کرنے کے لئے نکلا تھا۔ اس مشن کے اسٹاف میں ایک صابن بنانے والا، ایک چمڑا کمانے والا۔ دو زراعت جاننے والے ایک بڑھئی اور ایک امور خانہ داری سے واقف استاد تھا۔ سنہ ۲۲ء سے ان تمدنی مشن والوں نے دیہات دیہات تعلیم کو پھیلایا کئی سال کے تجربے کے بعد سنہ ۳۳-۱۹۳۲ء میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان سفری تمدنی مشنوں کو مقیم کر دیا جائے اور یہ مستقل اداروں کی حیثیت سے اپنے ماحول کو اپنے کام سے فیضیاب کریں لیکن خوابیدہ جماعتوں کو بیدار کرنا ہو تو پابہ سا اوقات کنونیں کے پاس نہیں آتا

کنوئیں کو پیاسے کے پاس جانا ہوتا ہے۔ کچھ دن بعد ہی تجربہ نے یہ ثابت کیا کہ برکت حرکت ہی میں ہے۔ چنانچہ پھر ان تمدنی مبلغین نے سفر شروع کیا اور ملک کے چپہ چپہ میں تعلیم کا پیام پہنچایا۔ ان دو کاموں کی ایک مفید رپورٹ حال میں واشنگٹن سے شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے۔

Report on The Cultural Mission of Mexico

ہندوستان کے تعلیمی کام کرنے والے اس رپورٹ کے مطالعہ سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

(۶)

جنوبی افریقہ، جس کے وزیر اعظم جنرل اسمٹس، ہندوستان غریب کو اخلاق قومیت اور ضرورت مساوات کی تلقین سے نہیں چوکتے، اپنی رعایا میں علاوہ اور اعمال حسنہ اخلاقی کے تعلیمی سہولتوں کے باب میں جو مساوات برتا ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا کہ منجملہ ایک کروڑ ۴۰ لاکھ پونڈ سالانہ کے خرچ کے جو تعلیم کی مد میں ہوتا ہے ایک کروڑ دس لاکھ تو صرف سفید رنگ کی آبادی پر صرف ہوجاتا ہے جن کا کل شمار ۲۰ لاکھ نفوس سے زیادہ نہیں ہے۔ ۸۰ لاکھ نیٹو آبادی پر اور ۸۰ لاکھ کالی آبادی پر کل ۱۰-۱۰ لاکھ پونڈ۔ ہر سفید بچے پر مدرسے میں ۲۵ پونڈ سالانہ خرچ ہوتا ہے اور ملک کے اصلی باشندوں کے بچوں پر فی بچہ ۲ پونڈ!

(۷)

انگلستان میں ایک بورڈ آف کرنٹ افیرس ہے جو ابتک فوج کے لئے بہت مفید کام کرتی رہی ہے اب عام تعلیم کے سلسلہ میں بہت اچھا کام کر رہی ہے۔ اس نے حال میں ایک کتابچہ شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے "کوئی دو ایک سے نہیں"۔ اس میں مصنف نے ثابت کیا ہے کہ نسلی صفات اور خواص کو اٹل اور امٹ ماننے کا خیال بالکل بے بنیاد ہے۔ جڑواں بچوں پر تجربے کئے گئے ہیں ایک کو ایک ماحول میں رکھا گیا ایک کو دوسرے ماحول میں اور ان کی ذہنی نشوونما میں زمین آسمان کا فرق ہوگیا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ حالات جماعتی کو بہتر بنانے سے افراد کی ذہنی نشوونما کو صحیح طور پر متاثر کیا جاسکتا ہے ان کی ان تجربوں سے بہت کچھ امید بندھے گی۔

کہ تعلیم کا کام صرف انفرادی تربیت کا کام نہیں، دراصل جماعتی سدھار کا کام ہے۔

(۸)

جارج برنارڈ شا کی نوّیں سالگرہ منانے کے لئے مشہور انگریزی سلسلہ مطبوعات پینگوئن میں اس کی تصانیف کو شائع کیا جارہا ہے دس کتابیں منتخب کی گئی ہیں اور ہر ایک کے ایک ایک لاکھ نسخے شائع کئے جارہے ہیں۔ اس طرح شا کے خیالات انگریزی جاننے والوں کے اس طبقہ تک پہنچانے کا سامان کیا جارہا ہے جن تک ہنوز قیمتی کتابوں کے ذریعے انھیں نہ پہنچایا جاسکا تھا۔ برنارڈ شا نے اپنی اکثر کتابوں کا حق تصنیف اپنے پاس ہی رکھا ہے اس لئے غالباً اس منصوبہ کو بروئے کار لانے میں اور بھی سہولت ہوئی ہوگی ورنہ سرمایہ دار ناشروں کی نفع طلبی شاید اس کا موقع نہ نکلنے دیتی۔

(معلّم)

چند سیاسی افکار

میکیاولی کے نام سے جدید سیاست کی بے اصولی اور جدید ریاست کی بے دینی کیطرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ اقبالؔ نے اس فلارنساوی باطل پرست کے زہر سے امت کو محفوظ کرنے کی بڑی موثر کوشش کی ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس فلارنساوی نے انسانی فطرت کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا اور سیاسی اداروں کے عروج وزوال کی تاریخ کو بڑی عمیق نظر سے دیکھا تھا۔ مگر نگہ کی تیزی اگر اس کا زاویہ غلط ہو جائے تو بڑی کج روی کا باعث ہو سکتی ہے۔ یہی شاید اس فلارنساوی کے ساتھ ہوا ریاست کی قوت بڑھانے کی بے تابی اور سیاست میں باطل توانائی کے فروغ نے اسے دھوکا دیا۔ جیسے کہ اکثر اچھے اچھوں کو دیتا ہے لیکن اس کے مشاہدے سے پھر بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ذیل میں اس کی تصانیف سے مختلف اقوال درج کئے جاتے ہیں۔ شاید ہمارے اہل سیاست اور صاحبانِ فکر کے لئے عبرت یا تفکر کا پیام ان میں ملے۔

(۱)

"پہلے تو آدمیوں کی خواہش بس یہ ہوتی ہے کہ اپنا بچاؤ کریں، دوسرے کی محکومی سے اپنے کو بچائیں۔ پھر ہوتے ہوتے حوصلہ بڑھتا ہے اور جی یہ چاہنے لگتا ہے کہ ہم دوسروں پر حاکم ہو جائیں"

(مکتوب بنام فرانچسکو وٹوری ۱۵۱۳ء)

(۲)

"انسان کے جملہ معاملات میں کچھ عجب بات ہے کہ ایک برائی کو مٹاؤ تو دوسری اس کی جگہ لے لیتی ہے"

(ٹیٹس لی ویس کے پہلے دس سال، معروف بہ ڈسکورسی ۱۵۲۲ء)

(۳)

"ریاستوں میں پھوٹ کی وجہ اکثر امن اور چین ہوتے ہیں، خطرہ اور جنگ یک جہتی پیدا

کرتے ہیں " (ڈسکورسی)

(۴)

" بڑے ہی خطرہ کی بات ہے کہ کوئی ایسی مخلوق کو آزاد کرنا چاہیے جو غلامی میں رہنے کو پسند کرتی ہو " (اسٹوریا فیورنٹین، تاریخ فلارنس ۱۵۲۵ء)

(۵)

" دشمن کے متعلق حقارت کے الفاظ استعمال کرنے سے اس پر فتح پا چکنے کا دھوکا ہونے لگتا ہے یا فتح کی جھوٹی امید پیدا ہو جاتی ہے " (ڈسکورسی)

(۶)

" بدنصیب ریاستوں میں سب سے بدنصیب ریاست وہ ہے جس نے کسی طرح اپنا یہ حال بنا لیا ہو کہ نہ صلح کر سکتی ہو نہ جنگ ہی جاری رکھ سکے۔ یہ حال اس ریاست کا ہو جاتا ہے جس کو شرائط صلح سے بھی سخت نقصان پہنچنے کا ڈر ہو اور جنگ جاری رکھے تو اپنے حلیفوں یا اپنے حریفوں کے ہاتھ بک جانے کا اندیشہ ہو۔ اس حالت کو پہنچتی ہے ریاست غلط سیاست سے، غلط معاہدوں سے اور اپنی قوت کے غلط اندازہ سے " (ڈسکورسی)

(۷)

" جنگ اور محبت دونوں میں ضرورت ہوتی ہے رازداری کی، وفاداری کی اور ہمت کی " (لاسلیبا، ۱۵۱۵ء)

(۸)

" غیر جانب دار سے مفتوح نفرت کرتا ہے، فاتح اسے حقارت سے دیکھتا ہے " (مکتوب بنام فرانچسکو دلوری)

(۹)

" جسے اطاعت کی تلاش ہو اسے حکم دے سکنا چاہیے " (ڈسکورسی)

(۱۰)

"انسانوں کو نئی اجلا فریب نظر سے ابھی اتنا ہی متحرک کیا جاسکتا ہے جتنا کہ واقعات سے بلکہ اکثر حقیقت سے زیادہ دکھاوا انھیں حرکت میں لاتا ہے۔" (ڈسکورسی)

(۱۱)

"خطابوں سے آدمی کی قدر نہیں بڑھتی، آدمی سے خطابوں کی بڑھتی ہے۔" (ڈسکورسی)

(۱۲)

"انسانوں کی ایک عام خامی یہ ہے کہ سکوت بحر میں انھیں طوفان کا خیال نہیں رہتا۔"
(بادشاہ)

(۱۳)

"کسی خطرہ سے آدمی بغیر خطرہ کے اپنے کو بچا نہیں سکتا۔" (تاریخ فلورنس)

(۱۴)

"بہت لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اچھے کاموں سے انھیں شہرت نصیب نہیں ہوتی تو برے کاموں سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔" (تاریخ فلارنس)

(۱۵)

"جب یہ فکر ہو کہ فلاں معاہدہ صلح قائم رہے گا یا نہیں اسے منجملہ اور باتوں کے یہ ضرور معلوم کرنا چاہیے کہ اس سے کون غیر مطمئن ہے اور یہ بے اطمینانی کیا رنگ لاسکتی ہے۔"
(مکتوب بنام فرانچسکو وٹوری ۱۵۱۳ء)

(۱۶)

"کون بتا سکتا ہے کہ ریاست کو کن سے زیادہ نقصان پہنچتا ہے، ان سے جو وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں جو انھیں حاصل نہیں ہے یا ان سے جو اس کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں جو مدت سے ان کے پاس ہے۔"
(ڈسکورسی)

(۱۷)

" چند افراد کی خوشحالی سے ریاستیں مرتبہ عالی نہیں پاتیں۔ بلکہ ساری آبادی کی عام بہبود سے"

(ڈسکورسی)

(۱۸)

" ایسے معاہدے کرنا کبھی عقلمندی کی بات نہیں جن کا توڑنا لازمی ہو یا جن کے ٹوٹنے کا ڈر ہو"

(ڈسکورسی)

(۱۹)

" کسی کام کا آغاز آنا مشکل نہیں، کسی میں کامیابی اتنی مشتبہ نہیں، اور کوئی خطروں سے اتنا پُر نہیں۔ جتنا کہ ریاست میں کسی نئے نظام کا جاری کرنا"

(بادشاہ)

(۲۰)

" قوموں کو دشمنوں کی غارتگری سے کم اور خود اپنے شہریوں کی ہوس سے زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔ اس کی تو کوئی حد بھی مقرر ہو سکتی ہے، لیکن اس کی کوئی حد نہیں ہوتی"

(تاریخ فلورنس)

دی مغل لائن لمیٹڈ

بحر احمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافر اور مال لے جانے والے جہازوں کا بیڑہ

بمبئی سے:-

عدن۔ پورٹ سوڈان۔ جدّہ اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی
اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ہم
حسب ضرورت دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے
جہاز بھیج سکیں گے۔ مال اور مسافروں کی
بکنگ کے متعلق تفصیلات کے لئے

لکھئے

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶، بنک اسٹریٹ، بمبئی

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۸۹۳

مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

زیرادارت:- ڈاکٹر سید عابد حسین ایم، اے-پی ایچ ڈی

جلد ۴۴ نمبر ۳	بابت ماہ مارچ ۴۷ء	سالانہ چندہ صہ / فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

سماج اور نوجوان

[کارل مان ہائیم اس جرمنی کے، جسے ہٹلر نے ۱۹۳۳ء میں ختم کر دیا تھا، ممتاز علماء میں سے تھے۔ فرانک فورٹ یونیورسٹی میں استاد تھے۔ سیاسی اقتدار نے جب علمی آزادی پر حدبندیاں شروع کیں تو مان ہائیم نے ترکِ وطن کا فیصلہ کیا۔ لندن جاکر درس اور تصنیف کے کام میں مشغول ہو گئے۔ حال ہی میں لندن یونیورسٹی میں انھیں تعلیمات کا پروفیسر مقرر کیا گیا تھا۔ نوجوان انگریزوں کے طرزِ فکر پر شاید ہی کسی زندہ انگریز عالم کا اتنا اثر ہو جتنا کہ مان ہائیم کا۔ ابھی حال ہی میں ۵۳ سال کی عمر میں انتقال کیا تو تمام علمی حلقوں میں جو ماتم بپا ہوا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذہنی کام کی مملکت سیاسی حدود سے زیادہ وسیع ہے اور جسے کچھ کہنا ہوتا ہے اُس کو سننے والے ہر جگہ مل جاتے ہیں۔ ہم ذیل میں اُنکی مشہور تصنیف *Diagnosis of Our Time* کا ایک اقتباس، جس کا ترجمہ جناب حامد علی خاں صاحب نے کیا ہے، درج کرتے ہیں۔ مدیر]

جدید سماج میں نوجوانوں کے مسئلے کے دو پہلو ہیں جنھیں دو سوالوں کی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ (۱) نوجوان ہمیں کیا دے سکتے ہیں؟ (۲) نوجوان ہم سے کیا توقع کر سکتے ہیں؟ اس جگہ میں صرف پہلے سوال کا جواب دینے کی کوشش کروں گا یعنی اس کا کہ سماج میں نوجوانوں کی اہمیت کیا ہے اور نوجوان سماج کی زندگی میں کیا خاص خدمت انجام دیتے ہیں؟

ان سوالوں کے انداز ہی سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانوں کے مسئلے پر عمرانی نقطۂ نظر دو لحاظ

سے ایک نئی چیز ہے۔ ایک ماہرِ عمرانیات تعلیم اور تدریس کو وقت اور حالات سے بے تعلق چیز نہیں سمجھتا بلکہ سماج کی موجودہ حالت کا پورا پورا لحاظ رکھتا ہے اس لئے کہ نوجوان بہرحال اس میں رہتے بستے ہیں اور اسی کی زندگی کے لئے کچھ کرسکتے ہیں۔ بیشک تعلیم کی نفسیات اور عمرانیات میں بعض ایسے عناصر بھی ہیں جو عام ہیں لیکن تصویر پوری تب ہی ہوتی ہے کہ اس عام نقطۂ نظر کی تکمیل اُس تاریخی پس منظر سے کی جائے جس میں نوجوانوں کو کام کرنا ہے۔ عمرانی نقطۂ نظر کی دوسری ندرت یہ ہے کہ یہ سماج اور نوجوانوں کو پوری طرح ایک دوسرے پر اثر انداز مانتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر یہ سوال ہو کہ نوجوانوں کو کیا سکھایا جائے اور کیسے سکھایا جائے تو اس کا جواب زیادہ تر اس پر منحصر ہوگا کہ آپ نوجوانوں سے توقعات کیا رکھتے ہیں؟ سماجی احساس کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے اب یہ نہیں ہوتا کہ ہم یونہی خلا میں نوجوانوں کی ضرورتوں کا تعین کردیں بلکہ ہمیشہ کسی خاص سماج کے اغراض و مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر یہ تعین کیا جاتا ہے۔ پچھلے دس بیس سال کی تعلیمی تحریکوں میں ہرچند کہ پہلی بار ان میں نوجوانوں کے حقوق اور سچے مطالبوں کا لحاظ رکھا گیا تھا، یہ کمی پھر بھی تھی کہ وہ محدود اور یک طرفہ تھیں اور نوجوانوں کے حقوق پر زیادہ زور دیتی تھیں اور سماج کے مطالبوں اور مقصدوں پر پوری توجہ نہیں کرتی تھیں۔ جدید تعلیمی تحریک اور اس کے تجربی مدرسوں کا سلوک بچوں کے ساتھ ایسا تھا جیسے دولت مند ماں باپ کا ہوا کرتا ہے۔ انھیں بس یہ خیال رہتا ہے کہ بچے کی زندگی کو جس طرح بھی ہو سکے خوش گوار اور سہل بنایا جائے، ہر دام پر اُس کے لئے سب کچھ فراہم کردیا جائے، اور یوں وہ اپنے لاڈ پیار سے بچوں کو بگاڑتے ہیں اور ان میں ناموافق حالات سے دوچار ہونے کی صلاحیت کو کم کرتے جاتے ہیں۔ "بچے کی صدی" میں یہ عقیدہ عام تھا کہ زندگی کا ہر زمانہ خودمکتفی ہوتا ہے اور اپنے مخصوص حقوق رکھتا ہے اور اس لئے لوگوں کی نظر اس حقیقت سے ہٹی رہی کہ مختلف عمر والے طبقوں اور سماج میں عمل اور رد عمل کا باہمی رشتہ بھی ہوتا ہے جو کسی طرح ان حقوقِ مخصوص سے کم اہم نہیں ہوگا۔

حکم پر چلانے والی پرانی تعلیم بچوں کے حیاتی اور نفسیاتی تقاضوں سے ناآشنا تھی تو لبرل مکتبِ خیال "جو ہوتا ہے سو ہونے دو" کے اصول سے فرد اور جماعت کے تعلق کا باہمی توازن

بجھادیا اور اپنی نظر کو ہر طرف سے ہٹا کر بس فرد پر جما دیا، جس سماج میں فرد کو اپنا کام کرنا ہے اُس کی طرف سے نگاہ بالکل پھیر لی۔

اس ضمن میں پہلا سوال جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ سماج میں نوجوانوں کی اہمیت ہمیشہ ایک سی ہوتی ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں ہوتی۔ ایسے معاشرے بھی ہوتے ہیں جن میں عمر لوگوں کو نوجوانوں سے بہت زیادہ اثر اور اقتدار حاصل ہوتا ہے اور نوجوانوں کا مشکل ہی سے کچھ وزن مانا جاتا ہے، مثلاً قدیم چینی سماج؛ اور ایسے معاشرے بھی ہوتے ہیں، جیسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ، جس میں چالیس سال سے اوپر کا آدمی مشکل سے کسی کام کا سمجھا جاتا ہے اور اس میں جو کچھ ہیں بس نوجوان ہی ہیں۔ پھر یہی نہیں کہ نوجوانوں کی قدر و منزلت کے باب میں معاشرے باہم مختلف ہوتے ہیں بلکہ ان میں اس اعتبار سے بھی بہت اختلاف ہوتا ہے کہ آیا جماعت کے نوجوان کسی ایسی تحریک میں متحد اور مجتمع بھی ہوتے ہیں یا نہیں جو واقعات کے رخ کو متاثر کر سکے۔ پہلی جنگِ عظیم سے پہلے جرمنی میں نوجوانوں کی ایک تحریک خود بخود اُٹھی اور جو گروہ اور جو ادارے اس وقت جرمنی میں برسرِ اقتدار تھے انھوں نے نہ اس کی مدد کی نہ اسے پسند کیا۔ اس وقت انگلستان میں ایسی کوئی تحریک نہیں اُٹھی۔ البتہ فرانس میں ایک ایسی ہی تحریک شروع ہوئی لیکن مقابلۃً بہت چھوٹے پیمانے پر۔ روس میں، نازی جرمنی میں، فاشستی اٹلی میں، جاپان میں حکومت کے اجارے کی شکل میں واضح طور پر عسکری قسم کے نظام نوجوانوں کے موجود تھے۔ انگلستان اور دوسرے جمہوری ملکوں میں اس کے مقابلے کی کوئی چیز نہ تھی۔ عمرانی مسئلہ یہ ہے کہ ہر چند کہ نئی نسلیں برابر اُبھرتی ہیں یعنی کم عمر والے برابر بڑھ کر نوجوان ہوتے رہتے ہیں، پھر بھی اس کا انحصار معاشرے کی نوعیت پر ہے کہ وہ اس اُبھرتے ہوئے گروہ سے کچھ کام لیتا ہے یا نہیں لیتا اور اسی معاشرے کی عمرانی ساخت پر منحصر ہے یہ بات کہ وہ ان سے کام لیتا ہے تو کیسے لیتا ہے؛ شباب ان مخفی محفوظ قوتوں میں سے ہے جو معاشرے کے پاس ہوتی ہیں اور جن کے بروئے کار لانے پر اس کی قوت اور توانائی کا انحصار ہوتا ہے۔

اس بیان کی صحت کو سمجھنے کا موقع جنگ سے بہتر کبھی نہ تھا۔ کہ جنگ میں تو ملکوں کا بقا

اس پر منحصر تھا کہ اپنے پوشیدہ محفوظ وسائل کو کس طرح مجتمع کرکے کام میں لاتے ہیں۔ جنگ میں فتح اس پر منحصر ہوتی ہے کہ آخری بے کار آدمی کو کام سے لگادیا جائے، عورتوں کو صنعتی کام میں لگایا جائے، سرمایے کو پوری طرح استعمال میں لایا جائے۔ اسی طرح فتح اس پر بھی اتنی ہی منحصر ہے کہ انسانی دماغ میں یا قوم میں نفسیاتی قوتوں کا جو محفوظ سرمایہ ہے اس کا پورا پورا استعمال کیا جائے۔ اس سلسلے میں جسم اجتماعی اور جسم انسانی کی تمثیل کو ہم بہت دور تک لے جا سکتے ہیں۔ علم وظائف الاعضا کے ماہر بتاتے ہیں کہ کوئی عضو ہو معمولاً اپنی صلاحیت کا آٹھواں حصہ کام میں لاتا ہے، آٹھ میں سے سات حصے اس کی قوت کے محفوظ رہتے ہیں۔ معمولی حالات میں یہ سات حصے بس بالقوۃ موجود ہوتے ہیں لیکن اگر یکایک کوئی افتاد پڑ جائے یا اعضا کے باہمی روابط میں کوئی نیا توازن پیدا کرنے کی ضرورت پیدا ہو جائے تو اس وقت بدن کا زندہ رہنا اس پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ ان پوشیدہ وسائل کو صحیح طور پر اور جلد ہی کام میں لے آئے۔

اس کا اندازہ لگا لینا چنداں دشوار نہیں کہ وہ کونسے معاشرے ہیں جن میں اقتدار زیادہ عمر والوں کا ہوتا ہے اور جن میں شباب کی حیات آفریں توانائی بس بالقوۃ موجود ہوتی ہے اور کسی تحریک کی شکل میں متحد ہو کر سامنے نہیں آتی۔ میرا خیال ہے کہ جن معاشروں میں جمود ہوتا ہے، جن میں تبدیلی کی رفتار نسبتاً سست ہوتی ہے وہ زیادہ تر پکی عمر والوں کے تجربے پر بھروسہ کرتے ہیں، وہ شباب کے امکانات مضمر کی ہمت افزائی کرکے انھیں ابھارنے میں تامل کرتے ہیں، ان کے یہاں تعلیم کے معنی ہوتے ہیں روایات کو منتقل کرنا، ان کا طریقۂ تعلیم زیادہ تر تکرار اور اعادے پر مشتمل ہوتا ہے۔ شباب کے حیاتی اور روحانی وسائل کی طرف سے ان کی نظر بالارادہ ہٹی رہتی ہے اور معاشرے کے موجودہ رجحانات کا مقابلہ کرنے یا انھیں روکنے کا ارادہ بھی مفقود ہوتا ہے۔

ان جامد یا آہستہ آہستہ بدلنے والے معاشروں کے مقابلے میں وہ معاشرے ہیں جو حرکت پسند ہوتے ہیں، جو نئی منزلیں طے کرنے کے ارادے رکھتے ہیں۔ یہ معاشرے ان کا معاشری

اور سیاسی فلسفہ کچھ بھی ہو، زیادہ تر نوجوانوں کے تعاون پر بھروسہ کرتے ہیں۔ یہ اپنے سب حیاتی وسائل کو منظم کرتے ہیں اور انھیں جماعتی نشو و نما کی مقررہ سمت کے بدلنے میں کام میں لاتے ہیں۔ اس سبب میں ان جماعتوں میں جو تغیر کو انقلاب کے ذریعہ لانا چاہتے ہیں اور ان میں جو اصلاحات کے ذریعہ اس کی سبیل نکالنا چاہتے ہیں بس شدت کا فرق ہے۔ دونوں حالتوں میں جب بھی کوئی نئی راہ کھولنی ہوتی ہے تو کام نوجوانوں ہی کو کرنا ہوتا ہے۔ بوڑھے اور ادھیڑ عمر والے آنیوالے تغیرات کی ماہیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں، ان کا تعمیری تخیل نئی راہوں کے معین کرنے میں کام میں آسکتا ہے لیکن نئی زندگی کو برتنے نوجوان ہی ہیں۔ جن قدروں کو بوڑھے نظری طور پر مانتے ہیں انھیں نوجوان عملی طور پر زندگی میں پورا کرتے ہیں۔ اگر یہ سب صحیح ہے تو پھر نوجوانوں کا مخصوص وظیفہ اسی نئی زندگی کا پیدا کرنا ہے۔ شباب وہ قوت محفوظ ہے جو اس وقت سامنے آتی ہے جب تجدید حیات کی ضرورت ہوتی ہے اور جلد جلد بدلنے والے یا مطلق نئے حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے۔

اس قوتِ محفوظ کا مجتمع ہونا اور بر روئے کار آنا بھی بہت کچھ اسی طرح ہوتا ہے جیسے جسمِ انسانی میں۔ حیاتیاتِ جدید کے ماہرین کا خیال ہے کہ سب سے اہم حیاتیاتی تغیر یہ ہے کہ اضطراری عمل مستقل وظیفہ بن جائے، مثلاً بچہ طرح طرح کی بے ترتیب حرکات کرتا ہے جن میں فی نفسہ کوئی معنی نہیں ہوتے سوائے اس کے کہ اس کی فراواں قوتِ حیات کا اظہار ان سے ہوتا ہے۔ نشو و نما، تجربہ، تربیت اور تعلیم سے ربط کی منزلیں طے کرکے یہ حرکتیں مستقل وظائف کی حیثیت اختیار کرلیتی ہیں۔ یہی حال جماعت کا ہے۔ معاشری زندگی میں بھی بہت سی قوتیں پوشیدہ ہوتی ہیں جو کام میں نہیں آتیں۔ احساسات، جذبات اور خیالات معاشرے کے لئے اہمیت اس وقت حاصل کرتے ہیں جب یہ مربوط ہو کر مجتمع ہو جائیں۔ اس کی ایک مثال دوں ہم سب جانتے ہیں کہ تاریخ میں سب سے بڑا ظلم غلاموں پر نہیں ہوا، نہ زر خرید کسانوں پر، نہ مزدوروں پر بلکہ سب سے بڑا ظلم پدری نظام والی جماعتوں پر عورتوں پر ہوا ہے۔ لیکن ان عورتوں کی تمام

شکایت اور ان کی ساری ناخوشی و ناراضی ہزارہا سال تک بے معنی اور غیر اہم رہی، بعض اُس وقت تک جب تک کہ یہ لاکھوں انفرادی عورتوں کی الگ الگ تکلیفیں تھیں۔ لیکن ان کی اس بے چینی نے فوراً ایک تخلیقی معاشری اہمیت حاصل کر لی جب سفریجیٹ تحریک میں ان شکایات اور ان جذباتِ ناراضی کو مجتمع کر کے ایک مستقل حیثیت دے دی گئی اور اس تحریک نے جدید معاشرے میں عورت کے مقام اور اس کے وظیفے سے متعلق سارے تصورات کو بالکل نئے سرے سے ترتیب دیا۔ اس طرح نیم غلام کسانوں، غلاموں اور مزدوروں کے مظلوم طبقوں کی ناراضگیاں معاشری اعتبار سے ناقابلِ اعتنا رہیں جب تک وہ الگ الگ افراد کی ناراضگیاں اور مصیبتیں تھیں۔ جب یہ جذبات مجتمع ہوئے اور ایک تحریک شروع ہوئی جو صرف تلخی کا اظہار نہ کرتی تھی بلکہ تعمیری تنقید کی ایک نئی بنیاد بھی پیش کرتی تھی کہ بے ترتیب احساسات اور اعمال ایک جماعتی وظیفے کی شکل میں مبدل ہو گئے۔

اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ اجتماع اور تفرید کی معین صورتوں ہی میں مخفی قوتوں کو بروئے کار لایا جا سکتا ہے اور تخلیقی طور پر انھیں معاشرے کی زندگی میں کارفرما بنایا جا سکتا ہے۔ ہم معاشرے میں نوجوانوں کی اہمیت معلوم کرنا چاہتے ہیں تو یہ سوال کرنا بہت اہم ہے کہ نوجوان جس قوت کی نشانی ہیں اس کی اہمیت کیا ہے اور اس قوتِ محفوظ کو تفرید کی کن شکلوں کے ذریعہ ایک مستقل وظیفے میں بدلا جا سکتا ہے؟ یا اس کو ذرا سہل زبان میں کہیں تو سوال یہ ہے کہ ہم جو یہ کہتے ہیں کہ نوجوان تجدیدِ حیات کا ذریعہ ہیں تو اس سے واقعی مراد کیا ہے؟

جواب میں پہلے ہی قدم پر ایک گڑھا سامنے آتا ہے! جب میں جوان تھا تو عام طور پر یہ یقین کیا جاتا تھا کہ نوجوان فطرۃً ترقی پسند ہوتے ہیں۔ اس عرصے میں یہ خیال دھوکا ثابت ہو چکا ہے اس لئے کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ قدامت پسند بلکہ رجعت پسند جماعتیں بھی اپنی اپنی نوجوان تحریکیں منظم کر سکتی ہیں۔ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ معاشری زندگی میں نوجوانوں کا کام تجدیدِ حیات کا کام ہے تو ہمیں صاف طور پر بتانا چاہئے کہ شباب کے وہ کون عناصر ہیں جنھیں مجتمع کر لیا جائے تو وہ معاشرے کے

ایک نئی راہ کھولنے میں مدد دے سکتے ہیں؟

ہمارے نقطۂ نظر سے نوجوانوں کی جو صفت انھیں معاشرے میں جدت آفرینی کی صلاحیت بخشتی ہے وہ علاوہ ان کی حوصلہ مندی کے یہ ہے کہ وہ ابھی موجودہ نظامِ معاشرت کے ساتھ پوری طرح وابستہ نہیں ہوئے ہیں۔ جدید نفسیات نے اور عمرانیاتِ شباب نے ہمیں یہ بتا دیا ہے کہ جدید نوجوانوں کی ذہنیت کو سمجھنے کی کنجی صرف اس حیاتیاتی ہیجان میں نہیں مل سکتی جو اس منزلِ نشو ونما کا خاصہ ہے۔ یہ بات تو بہرحال عام ہے اور زمان و مکان کی حدود سے باہر ہے۔ بلوغ کی عمر کے متعلق فیصلہ کن بات یہ ہے کہ نوجوان اس وقت عام زندگی کا شریک بنتا ہے اور جدید معاشرے میں یہی وقت ہوتا ہے جب وہ پہلی مرتبہ متضاد اقدار کے انتشار سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ابتدائی قسم کے معاشروں میں ہمارے نوجوانوں کی سی ذہنی کشاکش کا وجود نہیں ہوتا، اس لئے کہ جو قاعدے قانون خاندان نے سکھائے ہیں اور جو قاعدے قانون بڑوں کی دنیا میں رائج ہیں ان میں کوئی بنیادی تفاوت یا تضاد نہیں ہوتا۔ ہمارے نوجوانوں میں تضاد کا جو شعور ہوتا ہے وہ دراصل ہماری عام زندگی کے انتشار کا عکس ہے اور جو پریشانی نوجوان کو ہوتی ہے وہ اس صورتِ حال میں ایک ناتجربہ کار ذہن کا فطری ردِ عمل ہے۔ ہماری موجودہ بحث کے لئے یہ احساسِ تضاد اس قدر اہم نہیں جتنا کہ اسی چیز کا ایک دوسرا پہلو۔ ہمارے مسائل کے لئے اہم چیز یہ ہے کہ نوجوان ہمارے معاشرے کے تضاد سے جب آگاہ ہوتے ہیں تو گویا باہر سے۔ یہی بات نوجوانوں کو معاشرے میں تبدیلی کا ہراول بناتی ہے۔

شباب فطری طور پر نہ ترقی پسند ہوتا ہے نہ قدامت پرست۔ وہ تو ایک امکان اور ایک صلاحیت ہے جو ہر نئے آغاز کے لئے آمادہ ہوتی ہے۔ بلوغ کی عمر تک بچہ زیادہ تر اپنے خاندان میں رہتا ہے اور اس کے رویے پر زیادہ تر وہ ذہنی اور جذباتی روایات اثر انداز ہوتی ہیں جو خاندان میں رائج ہوتی ہیں۔ بلوغ کے زمانے میں وہ اپنے ماحول سے پہلی بار تعلقات پیدا کرتا ہے یعنی اپنی قوم سے اور اس کی پبلک زندگی کے مختلف شعبوں سے۔ یوں نوجوان یہی نہیں کہ حیاتیاتی طور پر ایک ہیجانی کیفیت میں ہوتا ہے بلکہ عمرانی اعتبار سے بھی وہ ایک نئی دنیا میں داخل ہوتا ہے جس کے رسم

عادات اور نظام ہائے اقدار ان سے مختلف ہیں جن سے وہ اب تک آشنا تھا۔ اس کے لئے جو ایک نئی چیز ہے وہ بڑوں کے لئے عادت بن چکی ہے، اسے وہ نئے فیصلوں پر اکساتی ہے، اُن کے لئے معمولی روزمرہ ہے۔ یہ باہرے، جیسے اجنبی، معاشرے میں داخل ہوتا نوجوان کے اندر زندہ جماعتی تحریکوں سے ہمدردی پیدا کردیتا ہے جو کسی وجہ سے، اور اکثر خود اس کی وجہ سے مختلف وجوہ کی بنا پر موجودہ صورت حال سے غیر مطمئن ہوتی ہیں۔ نوجوانوں کے اغراض پہلے سے کسی کے ساتھ خاص طور پر وابستہ نہیں ہوتے، نہ معاشی اعتبار سے نہ عادات و اقدار کے لحاظ سے۔ زیادہ عمر والے لوگ جو پرانے معاشرے میں جم چکے ہیں ان کے اغراض بھی اس سے وابستہ ہوتے ہیں۔ یہی بات ہے کہ زمانۂ بلوغ اور شباب میں اتنے لوگ نہایت جوشیلے انقلابی یا مصلح ہوتے ہیں، پھر یہی لوگ جب انھیں کوئی مقررہ کام مل جاتا ہے، نیا خاندان بنا لیتے ہیں، تو ان کا رویہ مدافعانہ سا ہو جاتا ہے اور یہ موجودہ صورت حال کے مؤید بن جاتے ہیں۔ عمرانیات کی زبان میں جوان ہونے کے معنی ہیں معاشرے میں حاشیے کا انسان ہونا، اکثر اعتبارات سے باہر کا سا آدمی ہونا۔ مدرسے کے اونچے درجوں میں پڑھنے والے لڑکوں اور نوجوان طالب علموں کے رویتے میں جو بات سب سے صاف دکھائی دیتی ہے وہ یہی ہے کہ موجودہ نظام معاشرت میں ان کے کوئی وابستہ اغراض نہیں ہوتے اور اس میں انھیں جو حصہ لینا ہے وہ واضح طور پر نہیں ہوتا۔ میری رائے میں یہ باہر والا ہونا جوانی کے حیاتیاتی ہیجان سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے نوجوانوں میں ایک کھلا کھلا پن سا ہوتا ہے اور تغیّر پذیری بھی۔ اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ یہ باہر والا ہونے کی صفت دوسرے باہر والے افراد اور گروہوں کے رویتے سے مل جاتی ہے جو کسی اور وجہ سے معاشرے کے حاشیے پر ہوتے ہیں، جیسے اس کے مظلوم طبقے، اس کے اکھڑے ہوئے ذہنی طبقے، شاعر، آرٹسٹ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اس باہر والا ہونے سے بھی ایک امکانی صلاحیت ہی پیدا ہوتی ہے اور اس بات کا انحصار کہ یہ امکانی صلاحیت دب جاتی ہے یا اسے مجتمع کرکے ایک تحریک بن جاتی ہے اس پر منحصر ہے کہ باہر سے اس کو کس قسم کی ہدایت اور کیسے اثرات سے سابقہ پڑتا ہے۔

اس تمام بحث کے نتائج کا خلاصہ یہ ہے کہ نوجوان ان مخفی محفوظ قوتوں میں ایک اہم درجہ رکھتے ہیں جو ہر معاشرے میں موجود ہوتی ہیں۔ جماعت کی ساخت پر اس کا انحصار ہے کہ یہ محفوظ قوتیں یا ان میں سے کون کون سی بدل کر ایک مستقل حیثیت اختیار کرتی ہیں۔ بالغ کو جو چیز خاص طور پر ایک نئے آغاز کے لئے مفید بناتی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے ابھی موجودہ نظام کو قبول نہیں کیا ہے اور معاشی یا روحانی زندگی میں اس کے کوئی اغراض اس سے پوری طرح وابستہ نہیں ہیں۔ جامد یا آہستہ آہستہ بدلنے والی جماعتوں میں ان قوتوں کو مجتمع کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی بلکہ کبھی کبھی تو ان کو دبا دینے کی کوشش ہوتی ہے۔ متغیر معاشروں میں جلد یا بہ دیر یہ قوتیں آگے بڑھتی ہیں اور اکثر ان کو منظم کرنے کی تدبیریں کی جاتی ہیں۔

حامد علی خاں ․․․

"مشعل"

[عرصہ ہوا یہ نظم کہی تھی - ایشیائی اقوام کی کانفرنس کے موقع پر یہ پھر یاد آئی - احباب کی خواہش ہے کہ ناظرین جامعہ کی خدمت میں پیش کروں - حاضر ہے

قیصر

آندھیاں اُٹھی ہیں، طوفان بڑھے آتے ہیں
اِس لرزتی ہوئی لَو کو تہِ داماں کرلو!
قمقمے[1] ٹوٹے ہیں، مٹی کے دیئے بجھتے ہیں
اِس لرزتی ہوئی لَو کو تہِ داماں کرلو!!
یہ ایک مٹی کا دیا، بزمِ غریباں کا چراغ
اپنا کمزور لرزتا ہوا شعلہ لے کر
اپنی بے چارگیٔ غم کا گلہ کرتا ہے
اِس لرزتی ہوئی لَو کو تہِ داماں کرلو!
اِس کی سرگشتہ و لرزندہ شعاعوں کی قسم
معبدِ شرق کے کنگورے لرز جائیں گے
دیکھو عفریت وہ تہذیبِ نوی کا بڑھ کر
پشتے باندھے ہوئے کشتوں کے لئے آتا ہے
اُفقِ غرب پہ تابندہ شفق کا منظر
کبر اور ناز کے جذبات کا خونیں پرتو

---

[1] مغربی تہذیب سے کنایہ ہے۔

دھوکے معصوم نگاہوں کو دیا کرتا ہے
—قلبِ خود بیں و خودآرا کے بخاراتِ مہیب
خود ستائی کے پہاڑوں سے جو ٹکرائے ہیں
ارضِ یورپ پہ ہوا ہے وہی بارانِ لہو—
بین الاقوامی تخیل کا جنازہ بر دوش
نسل اور خون کے طاغوت بڑھے آتے ہیں
جانبِ غرب ہو کیوں قافلۂ شرق رواں
مہرِ خود ظلمتِ مغرب کا تماشائی ہے
اِس لرزتی ہوئی لَو کو تہِ داماں کرلو
آندھیاں اُٹھی ہیں مغرب کے سیہ خانوں سے

قیصر زیدی

تعلیم کی تعلیمی اصلاح

آدمی تندرست ہو تو اُسے اپنے جسم کے مختلف نظامہائے اعضا کا احساس بھی شاید نہیں ہوتا۔ جب تک سب نظام اپنا اپنا کام اچھی طرح انجام دیتے ہیں جسم کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ کون کون میرے لئے کیا کیا کر رہا ہے۔ وہ تو جب صحت بگڑتی ہے، مختلف نظاموں کے وظائف کا توازن درہم برہم ہوجاتا ہے، اُس وقت توجہ کبھی ایک نظام کی طرف جاتی ہے کبھی دوسرے کی جانب۔ یہی حال جسم اجتماعی کا ہے حیات اجتماعی میں صحیح یا غلط جیسا توازن بھی قائم ہوجاتا ہے اور عرصے سے عادت کے طور پر چلتا رہتا ہے تو اس کے مختلف اجزا پر ذہن عموماً متوجہ نہیں ہوتا۔ سب کچھ ایسا پیش پا افتادہ سا ہوجاتا ہے کہ کوئی چیز مسئلہ نہیں بن پاتی۔ ہاں، جب کسی اجتماعی ابتلا کے باعث، کسی انقلاب میں، کسی جنگ میں توازن بگڑتا ہے تو ہر چیز جو پہلے بدیہی معلوم ہوتی تھی اب محل تامل نظر آنے لگتی ہے۔ مقاصد جماعتی کی چھان بین ہوتی ہے، اداروں پر تنقید ہوتی ہے، حیاتِ اجتماعی کے نئے نئے منصوبے سوچنے پڑتے ہیں، نئے پروگرام بنائے جاتے ہیں، کہیں پرانے شیشوں میں نئی شراب، کہیں نئی بوتلوں میں پرانی شراب بھری جاتی ہے اور معیشت، سیاست، تعلیم کے نقشے خاکے تیار ہوتے ہیں۔ جماعتی زندگی میں جیسے جیسے ذہنی زندگی کی اہمیت بڑھتی ہے یہ تنقید، یہ تدبرہ، یہ منصوبہ بازی اور پروگرام سازی کا کام پھیلتا جاتا ہے۔

گذشتہ عالمی جنگ میں یہ حقیقت نہایت واضح طور پر سامنے آئی۔ عین اُس وقت کہ دنیا کی ساری متمدن قومیں باہم دست و گریباں تھیں اور جنگ میں شکست و فتح قومی موت و زیست

کے ہم معنی دکھائی دیتی تھی کوئی قوم بھی قیام امن کے بعد اپنی زندگی کی تشکیلِ نو کے منصوبوں سے غافل نہ تھی، ہر جگہ سیاسی اور فوجی ہی نہیں معاشی اور تعلیمی زندگی کی تعمیرِ نو کا مسئلہ اچھے سے اچھے دماغوں کو اپنی طرف متوجہ کئے ہوئے تھا۔ اس زمانے میں مختلف ملکوں نے جو جو تجویزیں تیار کیں ان کا مطالعہ قومی زندگی کی اصلی کارفرما قوتوں کی ماہیت اور اُن کے عمل کے رُخ کا اندازہ لگانے کے لئے بہت بصیرت افروز ہو سکتا ہے۔ ہمارے پیشِ نظر اس وقت اس قسم کا تفصیلی مطالعہ نہیں ہے، صرف ایک پہلو کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے۔

جوں جوں قومی زندگی جمہور کی زندگی سے عبارت ہوتی جاتی ہے، قومی تعلیم کا وظیفہ بھی پہلے سے بہت زیادہ جاذبِ توجہ ہوتا جاتا ہے۔ یہ واقعہ بہت قابلِ لحاظ ہے کہ عین اُس وقت کہ انگلستان موت و حیات کی کشاکش میں مبتلا تھا اس کی پارلیمنٹ نے ۱۹۴۴ء میں ایک نیا قانونِ تعلیم منظور کیا جس کی وجہ سے انگلستان کے مصارفِ تعلیمی میں، کہ پہلے سے بھی کچھ کم نہ تھے، کوئی ڈیڑھ ارب روپیہ سالانہ کا اضافہ ہو جائے گا، ملک کا تعلیمی نظام ایک قومی نظام بن جائے گا اور زمانۂ طفولیت سے لے کر بالغوں کی تعلیم تک کے جملہ انتظامات کا کفیل ہوگا۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی تعلیمی تعمیرِ نو کے منصوبے بنائے گئے ہیں۔ یہاں کے حالات دوسرے خود مختار ملکوں سے مختلف تھے۔ مگر جنگِ عمومی کے بعد دنیا کا پھر سے انھیں پرانی بنیادوں پر قائم رہنا جن پر وہ اُس وقت تک قائم تھی سب کو ناممکن سی بات معلوم ہو رہی تھی۔ شاید کچھ یہ بھی ہو کہ آزادی کو ترسنے والی ہندوستانی مخلوق اگر بعد از جنگ کے خوش آیند منصوبوں پر بحث مباحثے میں زمانۂ جنگ کی تشنہ کام گھڑیاں کاٹ دینے پر آمادہ کی جا سکتی تو ایسا کرنا بھی دانش مندی ہی تھا۔ غرض سارجنٹ اسکیم کے نام سے ہندوستان میں تعلیمی تعمیر کا ایک جامع منصوبہ کئی سال سے ملک کے سامنے ہے۔ اس پر لوگوں نے شبہ بھی کیا ہے کہ یہ بس طفل تسلی ہے اور دل کا بہلاوا۔ کسی نے اسے سراہا ہے کسی نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ یہ بالکل وہ نہیں ہے جو ہم چاہتے ہیں۔ نیت کا علم تو خدا کو ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس منصوبے نے شاید پہلی بار ملک میں اس کی تعلیمی ذمہ داریوں کا پورا احساس

پیدا کیا، اس لئے کہ اس میں پہلی بار پورے قومی نظام تعلیم کا خاکہ سامنے آیا، جس کو پورا کئے بغیر ہندوستان متمدن قوموں کی صف میں جگہ پانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ اس نے تعلیم کے سارے کاروبار میں معلم کی اہمیت پر اور اس کی گذر اوقات کے معقول انتظام پر بجا اصرار کیا اور ان اعتبارات سے اس تجویز کو ہماری تعلیمی تاریخ میں ہمیشہ ایک اہم دستاویز کی حیثیت ملے گی۔ اس میں لازمی بنیادی تعلیم، تنوع ثانوی تعلیم وسیع پیمانے پر بلند معیار کی اعلیٰ تعلیم، استادوں کی تربیت، بالغوں کی تعلیم، معذوروں کی تعلیم سب ہی کا ذکر ہے۔ لیکن ہم اس وقت جس چیز کی طرف خاص طور سے توجہ دلانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگرچہ تعلیمی ترقی کے لئے انتظامی اصلاحات اور اداروں کے قیام کا مسئلہ بہت ضروری ہے تاہم ساری آئینی اور انتظامی تبدیلیوں کا بنیادی مقصد، اس کی غرض وغایت، صحیح معنی میں تعلیم دینا ہے، تعلیم کو ٹھیک اسلوب پر ڈالنا ہے یعنی خود مغز تعلیم کا سدھار ہے۔ تعلیمی قانونوں کے ذریعے تعلیم کو لازم اور مفت کر دینے سے بہتر انسان تیار نہیں ہوں گے، اصل تعلیم کو بہتر بنانے سے اس کی توقع کی جا سکے گی۔ اس وقت جو بحث ہمارے ملک میں تعلیمی مسائل پر ہوتی ہے اس میں اس پہلو کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ منصوبے بازی کے اس دور میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدت تعلیم کو تعلیم پر، اداروں کو نصاب اور طریق تعلیم پر، صورت کو معنی پر فضیلت سی حاصل ہو گئی ہے! تعلیم کے ہر سچے حامی کو اس غلط نقطۂ نظر کی اصلاح میں کوشاں ہونا چاہئے اور ذریعے اور مقصد کو اپنی اپنی صحیح اعتباری اہمیت دینے کی کوشش کرنی چاہئے۔

حال ہی میں انگریزی میں ایک کتاب ایک انگریز معلم کے قلم سے شائع ہوئی ہے جس کا نام The Educational Reconstruction of Education ہے جس میں اس نے اس بات کو مختصر مگر واضح طور پر پیش کیا ہے کہ تعلیمی تبدیلیوں کے معنی صرف تعلیم کے مواقع فراہم کرنا نہیں بلکہ صحیح تعلیم کا انتظام کرنا ہے۔ تعلیمی تنظیم صرف جماعتی مسئلہ نہیں تعلیمی مسئلہ بھی ہے! اس معلم (C. Black) نے اپنی کتاب میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ ہمارے موجودہ مدارس سے متعلمین کی اکثریت کچھ بھی حاصل نہیں کرتی! اس نے ایک ثانوی مدرسے کی تفصیلی جانچ سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس

وجدانی اندازے کی تائید تفصیلی مشاہدے سے بھی ہوتی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ ثانوی مدرسے میں ۸۰ فی صدی طالب علم درس کو ذرا "جذب" نہیں کرتے۔ ان ۸۰ فی صدی میں ۵ فی صدی کے قریب تو ایسے ہیں کہ جذب کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ جو لڑکے ذرا کمزور ہوتے ہیں اور جنہیں ثانوی مدرسے میں ۴ کی جگہ ۵ سال گذارنے ہوتے ہیں ان میں تو ۹۴ فی صد تو جذب نہیں کرتے اور ان میں سے ۸۰ فی صد وہ ہیں جو اس کی کوشش بھی نہیں کرتے؛ جب یہ حال انگریزی ثانوی مدرسوں کا ہے تو ہمارے مدرسوں میں کہ غالباً فی الجملہ ان کا معیار درس وضبط انگریزی مدارس سے کچھ کم ہی ہوگا کیا حال سمجھنا چاہیے؟ ضرورت ہے کہ ہمارے تعلیم کے محکمے، استادوں کی انجمنیں، یا تعلیمی محققین اس طرف توجہ فرمائیں اور تفصیلی تحقیق سے اپنے مدرسوں کی حالت کو جانچیں اور اگر صورت حال ایسی ہی یا شاید اس سے بھی بدتر ہو تو اصلاح کی کچھ نہ کچھ تدبیر کریں۔

بلیک نے اپنی تحقیق میں یہ بتایا ہے کہ ان اعداد کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہمارے ثانوی مدرسوں میں بچوں کی اکثریت کچھ حاصل نہیں کرتی! یعنی نہ انھیں کوئی ایسا علم حاصل ہوتا ہے جسے وہ بعد میں برت سکیں اور نہ کوئی ذہنی تربیت ہی ہوتی ہے اور اس سے بھی زیادہ بُری بات یہ ہے کہ چار یا پانچ سال تک لڑکے لڑکیاں ایسے بے نتیجے کام میں مصروف رکھے جاتے ہیں جس سے اُن میں روحانی، اجتماعی اور ذہنی خرابیوں کا پیدا ہونا بہت قرینِ قیاس ہے۔ اس بے نتیجہ عبث مصروفیت سے لڑکے لڑکیاں جماعت کے مخالف، غیر ذمہ دار، باغی بنتے ہیں اور کیا عجب ہے کہ اگر بعد کی زندگی میں دوسری قوتیں دستگیری نہ کریں تو یہ اس مضر کیفیت پر کبھی غالب نہ آسکتے ہوں۔ ذہنی لحاظ سے اس بے نتیجہ مشغولیت کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ ایک احساسِ کمتری پیدا ہو جاتا ہے اور متعلمین کو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ نکمے ہیں اور خود سوچ بھی نہیں سکتے۔ عام تعلیم یافتہ لوگوں میں جماعتی بہبود اور سیاسی اصلاح کی طرف سے جو بے اعتنائی بالعموم پائی جاتی ہے عجب نہیں کہ وہ اسی نامبارک تعلیم کا ثمر ہو۔

بلیک نے اپنی اس کتاب میں مرض کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ

(۱) سب سے بڑی وجہ دلچسپی کا فقدان ہے جو یا تو طبیعت میں پختگی کی کمی کی وجہ سے رونما ہوتا ہے یا صلاحیت کی کمی کے باعث۔ صلاحیت کی کمی کے ساتھ بھی کبھی کبھی ایک خاص قسم کی دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ دلچسپی خود مضمون سے نہیں ہوتی بلکہ اس کے متوقع نتائج کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ کاش اُستاد اس دلچسپی کو ایسا میدان دے سکیں جس میں ان کا کام بے نتیجہ نہ رہے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ مضامین کا بوجھ تقریباً سب متعلمین پر بہت ہوتا ہے۔ جو طلبہ اچھے نتیجے بھی دکھاتے ہیں ان پر بھی یہ بوجھ بہت دباؤ ڈالتا ہے۔ خیال کے متعدد سلسلے بیک وقت برقرار رکھنے ہوتے ہیں اور کسی میں بھی اتنی کامیابی نہیں ہوتی جتنی کم بوجھ کی صورت میں ممکن ہوتی۔

(۳) پھر کام کا بیشتر حصہ ایسا ہوتا ہے کہ اس میں کامیابی زبان میں مہارت پر منحصر ہے۔ مضامین کی کثرت زبان کی تحصیل کی طرف کافی توجہ نہیں کرنے دیتی۔

(۴) ثانوی مدرسے میں بچوں کو بھیجنے کا موجودہ طریقہ بھی اس ناکامی کا بہت کچھ ذمہ دار ہے۔ اگر اس انتخاب میں استاد کی رائے کو پورا دخل دیا جائے تو شاید نتائج بہتر نکلیں۔

اس تشخیص کے بعد بلیک نے مندرجہ ذیل علاج تجویز کیا ہے:۔

(۱) بچوں کو ثانوی مدرسے میں ۱۱ برس کی عمر میں بھیجنے کی جگہ ۱۲ برس کی عمر میں بھیجنا چاہئے۔ امریکہ، روس اور اسکاٹ لینڈ میں لڑکے ۱۲ برس کی عمر میں ثانوی مدرسے میں جاتے ہیں۔ بلیک کا خیال ہے اور وہ اپنی تائید میں سیکھنے کی قابلیت اور عمر کے درمیان جو ربط تھارن ڈائک نے اپنے تجربوں سے قائم کیا ہے اُسے پیش کرتا ہے کہ اگر بچے ۱۳ برس کی عمر میں مدرسہ ثانوی میں جائیں تو غالباً تین سال میں آسانی سے وہ سب کچھ سیکھ سکیں گے جو اب ۴ یا ۵ سال میں بھی نہیں سیکھ پاتے۔

مضامین کے بوجھ کے متعلق بلیک کا خیال ہے کہ بچے ۱۰-۱۲ مختلف سلسلہ ہائے خیال سے ایک وقت میں عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔ اس لئے عمر کے ۱۳ سال ختم ہونے تک پردیسی زبانوں کو نصاب سے نکال دینا چاہئے۔ یہ خیال درست نہیں ہے کہ پردیسی زبانیں اگر شروع عمر میں نہ سیکھی جائیں

تو بعد میں سیکھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ پردیسی زبانوں سے جو وقت بچے اس میں خود اپنی زبان کی واقفیت کو پختہ کرنا چاہیے۔

پھر ایک صورت اس بوجھ کو ہلکا کرنے کی بلیک کے نزدیک یہ ہے کہ ہم مضامین میں یہ فرق کریں کہ عام ذہنی پس منظر پیدا کرنے کے لئے کون سے ہیں اور کام کے لئے مہارت کن میں درکار ہے۔ اگر زندگی کے مختلف پہلوؤں سے واقفیت پیدا کرنے کے لئے سبقاً سبقاً مضامین کا پڑھانا ہی لازم ٹھہرے تو پھر تو یہ کام ناممکن سا ہے۔ اس لئے کہ آئے دن درس کے مضامین میں اضافہ ہی کرتے جانا ہوگا اور مضامین کا بوجھ دن بدن بڑھتا ہی جائے گا۔ اور سچ پوچھیے تو اب تک یہی ہوتا بھی رہا ہے۔ آج یہ مضمون بڑھا دیا گیا کل ایک اور۔ اس دشواری کا حل یہ ہے کہ علم کو دو قسم کا مانا جائے۔ ایک وہ جس سے ایک ذہنی پس منظر پیدا ہوتا ہے، ایک وہ جس کا حاضر ہونا ضروری ہے جس سے بار بار کام لینا پڑتا ہے جس میں مہارت شرط ہے، جسے پہچاننا نہیں برتنا ہے۔ امتحان کے غیر فطری طریقے کی وجہ سے ہر مضمون جو پڑھایا جاتا ہے اُسے یہی دوسری حیثیت دے دی جاتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بہت سا سماجی اور سائنسی علم اس طرح پڑھایا جا سکتا ہے کہ جب بعض واقعات سامنے آئیں تو آدمی ان کے روابط کو سمجھ سکے لیکن یہ ضرور نہیں کہ سارا علم حاضر ہو اور دہرایا جا سکے۔ سائنس کا جو علم کسی صناع یا طبیبی کو درکار ہوتا ہے وہ دوسری قسم کا ہے اور جو ایک معمولی شہری کو درکار ہوتا ہے وہ پہلی قسم کا ہوتا ہے۔

مدرسے کے سارے نظام اوقات کو درس ہی درس سے پُر کر دینا اور سب مضمونوں کو امتحان میں دہرانے کے لئے پڑھانا بڑی غلطی ہے اور متعلم کے بوجھ کو بے وجہ بڑھانا ہے۔ نظام اوقات کو مندرجہ بالا تقسیم کو سامنے رکھ کر مرتب کرنا چاہیے۔ یہ نہ کیا گیا تو مدرسے میں بہت سی چیزیں بالکل ہی نہ بتائی جا سکیں گی اور وہ وہ چیزیں ہوں گی جن سے لکھے پڑھے خوش حال گھرانوں کے بچے اپنے بہتر ماحول کی وجہ سے کچھ واقف بھی ہوتے ہیں لیکن غریب مزدوروں کے بچے بالکل نابلد ہوتے ہیں۔ یوں تعلیم کو عام اور مفت کرنے کے باوجود حقیقی تعلیم میں امیر و غریب کے لئے مساوات پیدا نہ ہوگی۔ بلیک کی رائے

میں تعلیم کی مختلف منزلوں میں مضامین کی یہ تقسیم کس طرح ہو سکتی ہے۔ اس کا خلاصہ انشاءاللہ ہم آئندہ اشاعت میں پیش کریں گے۔

اس کتاب کی طرف خاص طور پر متوجہ کرنے کی اصل غرض یہ ہے کہ ہم بھی اپنے تعلیمی تغیرات میں تعلیمی مسائل کو محض تنظیمی تدابیر کے مقابلے میں قابل اعتنا سمجھیں اور ان پر غور و بحث سے تعلیم کی تعلیمی اصلاح کا دروازہ کھولیں۔

سید مجتبیٰ زیدی

جواں مرگ سپاہی

[ارچیبلڈ میک لیش امریکہ کے مشہور شاعر اور تمثیل نگار ہیں۔ عرصے تک امریکن کانگریس کے مرکزی کتب خانہ کے نگراں تھے اور پریسیڈنٹ روزولٹ کے ادبی مشیر۔ کہتے ہیں کہ روزولٹ کی بہت سی معرکۃ الآرا تقریروں کے مسودے ان کے تیار کیے ہوئے تھے۔ نومبر ۱۹۴۵ء میں جب ایک بین الاقوامی تمدنی اور تعلیمی ادارہ کے قیام کا مسئلہ لندن میں زیر بحث تھا تو یہ امریکن وفد کے صدر بنا کر بھیجے گئے تھے۔ پچھلے سال "یونسکو" کی پیرس والی کانفرنس میں بھی ان کا بہت ممتاز حصہ تھا۔ ہم ذیل میں ان کی ایک نظم کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔]

یہ جواں مرگ سپاہی باتیں نہیں کرتے،
لیکن ہر خاموش غمکدہ میں اُن کی آواز سنائی دیتی ہے۔
کون ہے جس نے یہ آواز نہیں سُنی؟
جب گھڑی رات کی گھڑیاں گنتی ہے۔
تو ان کی خاموشی ہی گفتگو بن جاتی ہے۔

وہ کہتے ہیں:

" ہم جوان تھے۔ جوانی ہی میں تم سے رخصت ہو گئے۔ ہمیں یاد رکھنا

وہ کہتے ہیں :
" ہم سے جو بن پڑا ہم نے کیا
پر کام جب تک پورا نہ ہو تو سمجھو کچھ نہیں ہوا "

وہ کہتے ہیں :
" ہم نے اپنی جانیں تو دے دیں۔
پر جب تک کام کی تکمیل نہ ہوگی کون جانے گا کہ ہم نے جان
دے کر تمھیں کیا دیا؟ "

وہ کہتے ہیں :
" ہماری زندگی اور ہماری موت، امن کے لیے تھی اور ایک نئی
امید کی خاطر،
یا بس یونہی عبث ؟
یہ ہم کیا بتائیں، کیسے بتائیں !
اس کا جواب تو اب تمہیں دینا ہوگا "

وہ کہتے ہیں :
" ہم تو مر چکے، ہم نے اپنی موت تمھارے سپرد کر دی:
اب اس موت کو معنی دو،
اسے جنگ کے خاتمہ اور سچے امن کا مرادف بنادو،
اسے اس فتح سے ملا دو جو جنگ کو ہمیشہ کے لئے مٹا دے۔

اور امن کو ہمیشہ کے لیے قائم کر دے
اسے صحیح معنی بخش دو، صحیح معنی

ہم جوان تھے،
جوانی ہی میں تم سے رخصت ہو گئے
ہمیں یاد رکھنا،

(زار چیلڈ میک لیش)

تبصرے

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک: از مولوی مسعود عالم صاحب ندوی۔ **ملنے کا پتہ:** دارالاشاعت نشاۃ ثانیہ، حیدرآباد۔ صفحات: ۱۸۲۔ قیمت عہ

فاضل مؤلف نے حضرت سید احمد شہید اور اُن کے رفقاء کے کارناموں پر تبصرہ و تنقید کے علاوہ سفید فام مورخوں کی غلطیوں اور فروگزاشتوں کی نشان دہی اور تردید بھی کی ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب بڑی قابل قدر ہے۔ حضرت سید شہید کی تحریک تجدید وجہاد کو عام طور پر وہابیت کا مترادف سمجھا جاتا ہے۔ مؤلف نے ہندوستان کی اس پہلی اسلامی تحریک اور نجد کی دعوتِ توحید واصلاح کا فرق واضح کیا ہے اور لکھا ہے کہ

"نجد کے بعد وہابیت کا لیبل سید شہید کے ماننے والے ہندوستانی مجاہدوں پر بھی لگایا گیا، جو بار بار کی تردید کے باوجود آج بھی قائم ہے اور یہ "گالی" اتنی مشہور ہو چکی ہے کہ بعض اچھے خاصے مخلص مسلمان بھی مجاہدین کو وہابی ہی کے نام سے جانتے ہیں"

مؤلف نے تاریخی شواہد سے یہ ثابت کیا ہے کہ سید صاحب کے نجدی وہابیوں سے ملنے اور متاثر ہونے کا واقعہ محض افسانہ ہے اس لیے کہ سید صاحب حج سے پیشتر ہی جہاد کا عزم کر چکے تھے۔

"حقیقت یہ ہے کہ سید شہید کی تحریک، تجدید و احیائے دین کی ایک مستقل تحریک تھی اور ان کی دعوت میں ترکِ بدعات سے زیادہ جہاد فی سبیل اللہ پر زور دیا گیا تھا۔"

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی مفید اور ضروری تحریک کیوں ناکام ہوئی۔ فاضل مؤلف نے آخری باب میں "ظاہری" ناکامی کے مندرجہ ذیل اسباب بتلائے ہیں:

(۱) قانونِ اسلامی کے نفاذ کے لئے مسلمان رعایا بھی مطلوب ہے۔ لیکن سرحد اور اطراف

سرحد کے باشندوں کی تعلیم و تربیت کا کوئی معقول انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ ان کی قبائلی عصبیت اور جاہلیت بدستور قائم رہی۔ ان لوگوں کو سرحد سے زیادہ خود ہندوستان میں فکری اور عملی انقلاب کی دعوت دینا چاہئے تھی۔

(۲) حامیان تحریک نے امیر کی حیثیت میں غلو کیا اور سید صاحب کی غیبوبیت کا شاخسانہ کھڑا ہو گیا۔

(۳) تیسرا سبب عَلم برادرانِ تحریک متصوفانہ طریق عمل ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ سید صاحب کی ذاتِ گرامی کے ساتھ کرامات و مکاشفات اور خرقِ عادات کا ایک لامتناہی سلسلہ وابستہ ہو گیا۔ خود سید شہیدؒ نے بھی حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ابن عربیؒ کے درمیان مطابقت قائم کر کے عقیدہ وحدت الوجود کو سندِ جواز عطا کر دی۔

مولف نے پانچویں باب میں اسی تحریک کے نظام عمل کی بھی تشریح کی ہے اور ان دونوں سوالوں کا مختصر طور پر جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ حامیان تحریک کیا کرتے تھے اور کیسے کرتے تھے۔ اسی سلسلہ میں مولف نے چند تبلیغی رسالوں اور جہادی نظموں کا بھی ذکر کیا ہے جو بڑی تعداد میں چھاپ کر تقسیم کی گئی تھیں۔ اس جماعت نے اردو کی طباعت واشاعت کی جو خدمات ضمنی طور پر انجام دی ہیں اُن کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی قسم کے حیات پرور ترانے اسی تحریک کی بدولت اردو میں پیدا ہوئے

ے فرض ہے تم پر مسلمانو جہاد کفار — اس کا ساماں کر د جلد اگر ہو دیں دار

حد یہ ہے کہ مومن جیسا غزل گو بھی مثنوی جہادیہ لکھنے پر مجبور ہوا۔

کتاب کی ترتیب صاف اور واضح نہیں ہے اس تحریک کی مکمل تصویر ہمارے سامنے نہیں آتی۔ مولف نے واقعات بھی شاید یہ سمجھ کر بیان کئے ہیں کہ قاری کو تمام جزئیات پہلے سے معلوم ہیں۔ اور ان کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ اس تحریک کے پس منظر پر پورا ایک باب لکھنے کی ضرورت تھی لیکن مولف نے ان حالات کی طرف صرف اشارہ کیا ہے جنھوں نے جہاد

وزی اور ناگزیر بنا دیا تھا۔

اس کتاب کی زبان صاف اور سادہ ہے لیکن طرز بیان کا کوئی لطف نہیں بعض جگہ اسلوب بیان عامیانہ ہے ؟ مثلاً

"اچھا صاحب . . . . . ہم وہابی ہی بھلے چھٹی ہوئی"

مولف نے اس موضوع خاص پر تقریباً تمام مواد کو پڑھا، جانچا اور پرکھا ہے لیکن اچھا ہوتا کہ تمام حوالے حاشیہ پر ہی دے دیے جاتے اور سنین ہجری کے ساتھ ہر جگہ عیسوی سن بھی لکھ دیے جاتے۔

مسعود عالم ندوی صاحب کی یہ تالیف ہمارے تاریخی لٹریچر میں گراں قدر اضافہ ہے۔ اگر ہندوستان کی تاریخ آزادی کبھی ایمان داری کے ساتھ مرتب کی گئی تو اس کی ترتیب میں اس کتاب کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس میں کتابت اور طباعت کی بے شمار غلطیاں ہیں۔

محمد بن عبدالوہاب : از مولوی مسعود عالم صاحب ندوی ۔ **ملنے کا پتہ** : دارالاشاعت نشاۃ ثانیہ، حیدرآباد دکن ۔ صفحات : ۱۲۴ ۔ قیمت ۱۲/

اس کتاب میں بارہویں صدی ہجری کے مشہور لیکن مظلوم اور بدنام مصلح شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدی کی سیرت، سوانح، اور دعوت اصلاح پر تحقیقی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولف نے مشرق و مغرب کے تقریباً متعلقہ ماخذ کو جانچا اور پرکھا ہے اور اس پر بے لاگ تنقید کی ہے

شروع میں موصوف نے دنیائے اسلام کی حالت کو بیان کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ وقت دعوت و تجدید کے لئے نہایت مناسب تھا اور یہ تحریک اپنے مخصوص ماحول اور مقتضا کے مطابق خوب پھولی اور پھلی۔

مولف نے یہ بھی بتلایا ہے کہ اس تحریک کو "وہابی" کہنا سرتاسر غلط ہے۔ شیخ الاسلام کے والد سے اس کو کوئی نسبت نہیں اور نہ یہ اسلام سے علیحدہ کوئی چیز تھی۔

مولانا مسعود عالم ندوی نے بڑی محنت اور قابلیت سے اُن الزامات کی بھی تردید کی ہے

جو عام طور پر اس تحریک کے خلاف لگائے جاتے ہیں مثلاً ادعائے نبوت، انکارِ حدیث، تکفیر و قتالِ مسلمین۔

اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مولف کی نظر وسیع ہے اور تلاش ہر گز اس نے اس موضوع سے متعلق تقریباً تمام ضروری لٹریچر کا بہ غور مطالعہ کیا ہے اور یہ کتاب پوری ذمہ داری اور تحقیق کے بعد مرتب کی ہے۔

مولف نے ہر جگہ علمی انداز بیان قائم رکھنے کی کوشش کی ہے اور علمبردارانِ تحریک کو معصوم اور منزہ عن الخطا نہیں سمجھا۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کتاب کا طریقِ املا نہایت ناقص اور فرسودہ ہے اور اغلاطِ کتابت بھی اتنی ہیں کہ اُن کا حصر و شمار بھی آسانی سے ممکن نہیں۔

مبادیات تنقید : مولفہ خلیل الرب صاحب - ملنے کا پتہ : انڈین پریس - الہ آباد صفحات : ۱۶۵ - قیمت : درج نہیں -

یہ خلیل الرب صاحب لکچرار بیسک ٹریننگ کالج الہ آباد کی تالیف ہے اس میں غیر ضروری تفصیل سے گریز کر کے فنِ تنقید کے مقاصد، اصول اور نقاد کے اوصاف و فرائض سے بحث کی گئی ہے افسوس ہے کہ اس میں تاریخ تنقید پر کوئی علیحدہ باب قائم نہیں کیا گیا جس سے ان اصول کی اہمیت دلنشین ہو جاتی، "اردو ادب میں تنقید" پر چند کلمات لکھے گئے ہیں لیکن وہ بھی لب تشنگی تقریر کو رفع نہیں کرتے۔ مولف

مؤلف، اردو تذکروں سے بہت ناراض ہیں۔ لکھا ہے "ان میں کسی تنقید کی جستجو بیکار ہے" ان کے نزدیک یہ تذکرے محض تذکرے ہیں اور وہ صحیح تنقید سے یکسر عاری ہیں۔ یہ رائے غالباً اس دور کے طریق سے قطع نظر کر کے قائم کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ "میر کے نکات الشعرا" اور شیفتہ کے "گلشن بے خار" کی اہمیت اور تنقیدی بصیرت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

میر کی نازک مزاجی کو بھی وہ اصلیت پر مبنی نہیں سمجھے حالانکہ اس باب میں خود میر اور

اُن کے معاصرین کی شہادت موجود ہے۔ آزاد کی اگرچہ چند رائیں غلط بھی ہیں تب بھی اس تذکرہ کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ اردو کی فضا کو جیسا آزاد نے پیش کیا ہے، دوسرے نے پیش نہیں کیا۔

یہ چند جزوی خامیاں ہیں۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی کتاب دلچسپ اور مفید ہے انہوں نے دوسروں کے خیالات اور نظریات کو جوں کا توں نقل کر کے پیش نہیں کیا ہے۔ ان کو خود سمجھا ہے اور سمجھ کر صاف اور دلکش زبان میں منتقل کیا ہے اصول اور مبادیات کے سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ فائدہ اور دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

خ - ا - ف

معاشی دنیا

ایشیائی ملکوں کی کانفرنس کے سلسلے میں پچھلے دنوں دہلی میں منجملہ دوسرے تمدنی اور علمی مسائل کے معاشی مسائل پر بہت کچھ بحث وگفتگو ہوئی۔ بہت سے مفید مقالے بھی معاشی مسائل پر پیش کیے گئے۔ شاید بعض مباحث ناظرین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

(۱)

کسی ملک کے معاشی وسائل میں سب سے اہم اس کے باشندے ہوتے ہیں۔ اس لئے ملک کی آبادی کا علمی مطالعہ بہت سے مسائل پر روشنی ڈالتا ہے۔ زمین کی تقسیم، سرمایے کی ضرورت، بچوں کی تربیت، بوڑھوں کی دیکھ بھال، بین الاقوامی تجارت غرض بے شمار مسائل کے سمجھنے اور ان کے متعلق حکمتِ عملی کے فیصلے میں آبادی کے اعداد و شمار سے خاصی مدد ملتی ہے۔ چنانچہ ایشیائی ممالک کی آبادی پر اس حیثیت سے اس کانفرنس میں بھی نظر ڈالی گئی ہے۔ ذیل کی معلومات ایک مقالے سے مقتبس ہیں جو حکومتِ ہند کے محکمۂ صنعت کے ماہرِ اعداد و شمار مسٹر ب۔ رام مورتی نے کانفرنس میں پیش کیا تھا۔

دنیا کی آبادی کی تقسیم براعظموں میں:-

براعظم	آبادی (تین صفر اور لگا لیجئے)
ایشیا	۱,۱۵۴,۰۰۰
یورپ	۴۰۲,۰۰۰
روسی جمہوریتیں	۱۷۲,۰۰۰

براعظم	آبادی (تین صفر اور لگا لیجئے)
امریکہ	۲۷۳،۴۰۰
افریقہ	۱۵۸،۰۰۰
دنیا	۲،۱۷۰،۲۰۰

ایشیا کی کل آبادی دنیا کی کل آبادی میں آدمی سے زیادہ ہے۔ ۳۵ فی صدی دنیا کی آبادی پچھلی تین صدیوں میں برابر روز افزوں رفتار سے بڑھتی گئی ہے۔

مختلف ملکوں کی آبادی میں کم عمر اور زیادہ عمر والوں کی باہمی نسبت بھی معاشی حکمت عملی کے لئے قابلِ لحاظ چیز ہے۔ ذیل میں بعض ملکوں کی آبادی پر اس حیثیت سے نظر ڈالئے۔

ملک	۱۵ سال سے کم عمر والے فیصد	۶۵ سال سے اوپر والے فیصد
برطانیہ	۲۱٫۹	۹
شمالی یورپ	۲۳	۸٫۶
مغربی یورپ	۲۳٫۶	۸٫۴
جنوبی یورپ	۲۹٫۴	۷٫۱
مشرقی یورپ	۳۲٫۵	۴٫۸
روسی جمہوریتیں	۳۶	۴٫۲
ریاستہائے متحدہ امریکہ	۲۵	۹٫۹
ہندوستان	۳۹٫۹	۲٫۳

ہندوستان کی آبادی تو آپ جانتے ہیں کہ کوئی ۴۰۰ ملین (۴۰ کروڑ) ہے۔ چین کی اس سے بھی زیادہ ہے تقریباً ۵۰۰ ملین۔

جنوبی مشرقی ایشیا کے ممالک میں بھی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں زیادہ نہیں ہے۔

ترکی میں کوئی ۱۶½ ملین، عراق میں چار ملین سے کم، ایران میں ۱۵ ملین، عرب اور افغانستان میں ۷، ۷ ملین، شام میں ۷ر۳ اور فلسطین میں ۱½ ملین۔

فلسطین کی آبادی میں مسلم اور یہودی کی نسبت ذیل کے اعداد سے واضح ہو جائے گی:۔

	مسلم	یہودی
آبادی کا فیصد	۷۳	۲۷
زرعی آبادی میں فیصد	۶۹	۱۵
صنعت میں فیصد	۱۱	۳۱
خواندگی میں فیصد	۱۲	۸۶
شرح ولادت	۴۹	۲۲ر۶
شرح اموات	۲۲	۸

---

(۲)

ممالک ایشیا میں نوآبادی معیشت سے قومی معیشت کی طرف جو ارتقا ہو رہا ہے اُس کے مسائل بھی زیر بحث آئے۔ یہ مسئلہ ایک مدت سے یورپ کے معاشیین کے لئے بھی جاذب نظر ہے اس لئے کہ ان کے معاشی مستقبل کا اس سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس سلسلے میں جنوب مشرقی ایشیا کی معیشتوں پر خاص توجہ رہی۔ پونا کے گوکھلے انسٹی ٹیوٹ نے ایک معین یادداشت اس مضمون پر کانفرنس کے لئے تیار کی تھی جس سے ذیل کی معلومات اخذ کی گئی ہے۔ ان ممالک میں ہندوستان، سیلون، ملایا، برما، انڈونیشیا، سیام، فرانسیسی انڈوچائنا، چین اور جزائر فلپائن کو شامل کیجئے۔ یہ ممالک مل کر دنیا کی نوآبادی معیشتوں کے نصف سے زائد ہوتے ہیں۔ شمالی چین کو چھوڑ دیجئے تو بھی جنوبی اور مشرقی ایشیا میں ۹۳۵ ملین انسان بستے ہیں یعنی دنیا کی آبادی کے ۴۲ فیصد۔ پچھلے ڈیڑھ سو سال سے یہ حصہ دنیا کی معاشی دوڑ میں پچھڑ گیا ہے اور

ان میں اور مغربی قوموں کے معاشی نشوونما میں تفاوت انیسویں صدی کے شروع میں بہت بڑھ گیا ہے۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ "امریکہ، برطانیہ، فرانس اور دیا دنش (بحیرہ) جرمنی، جن میں دنیا کی صرف ۱۲ فیصدی آبادی بستی ہے وہ دنیا کے مال کا نصف اپنے تصرف میں رکھتے ہیں اور ساری دنیا کی آمدنی کا دو تہائی اس کی آبادی کے ایک تہائی سے کم کے حصے میں آ جانا چاہیے" لیکن باوجود اپنی پسماندگی کے یہ حصہ دنیا کی معاشی نشوونما کے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا اس لئے کہ خام مال یہی فراہم کرتا رہا۔ اور اب بھی یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ دنیا کی معاشی خوشحالی اسی حصے کی خوشحالی سے وابستہ ہے۔ مشہور معاشی کولن کلارک نے ۱۹۶۰ء کے معاشی پیش منظر کا خاکہ پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ "اس زمانے میں دنیا کی معیشت کا سارا توازن ایشیائی ملکوں کے معاشی نشوونما پر منحصر ہے خصوصاً ہندوستان اور چین کے کہ یہ غذا کے طلب گار اور سرمایے کے درآمد کرنے والوں کی حیثیت سے میدان میں آئیں گے۔ ۱۹۴۵ء اور ۱۹۶۰ء کے درمیان ایشیا کو کوئی ۵۹ ملین بین الاقوامی اکائیاں (ڈالر) سرمایے کی چاہیے گا۔ یہ ضرور ہے کہ بہت سے حقیقی یا فرضی فرقہ وارانہ اغراض اس میں مانع ہوں گے لیکن جو ایسا کریں گے انھیں سوچنا چاہیے کہ قطع نظر اس اثر کے جو ایشیائی ملکوں پر پڑے گا اگر بچت کا یہ طاقت ور دھارا یورپ اور امریکہ ہی کی طرف مڑ گیا تو بے کاری اور بے روزگاری اور کساد بازاری کی مصیبت اس پیمانے پر نازل ہوگی کہ اس کا تخیل بھی مشکل ہے۔"

ان ممالک میں سرمایہ دارانہ مغربی معیشت کے چند اہم اثرات مرتب ہوئے:۔ (۱) معیشت زر کا عام رواج۔ اس نے زراعت کا رخ اپنے استعمال کی چیزوں سے ہٹا کر تجارتی اجناس کی طرف کر دیا۔ بعض تجارتی اجناس کا رقبہ کاشت بڑھا، بعض نئی اجناس کی کاشت شروع ہوئی۔ مثلاً امریکن خانہ جنگی (۶۵-۱۸۶۰ء) کے زمانے میں جب کپاس کی قیمت بڑھی تو اس وقت سے ہندوستان میں کپاس کی پیداوار کو بڑھایا گیا۔ یہاں چائے کی کاشت اکثر انگریزوں نے ہی

شروع کی۔ ۱۸۵۰ء میں چائے کا رقبہ زیر کاشت دو ہزار ایکڑ بھی نہ تھا، ۱۸۸۰ء میں ۳۰ ہزار سے اوپر ہو گیا تھا۔ سن کی برآمد بھی بڑھی۔ ۳۷-۱۸۳۶ء میں مشکل سے ۹ ہزار ٹن سن باہر گیا تھا، ۵۱-۱۸۵۰ء میں تقریباً ۳۰ ہزار ٹن گیا اور ۶۱-۱۸۶۰ء میں کوئی ۵۵ ہزار ٹن۔ یہی حال نیل کا تھا۔ چین میں بھی چائے کی کاشت کو بڑی وسعت دی گئی۔ ملایا میں ۱۸۹۶ء تک ربر کی کاشت نہ ہوتی تھی اور ۱۹۳۷ء میں جب کل رقبہ زیر کاشت ۵۰ لاکھ ایکڑ تھا تو اس میں سے ۳۲ لاکھ ایکڑ پر ربر کی کاشت ہوتی تھی، گویا ۶۵ فیصدی رقبہ ربر کی کاشت کے کام آتا تھا اور اس کے مقابلے میں ۱۵ فیصد پر چاول بویا جاتا تھا اور کھانے کے لئے جو چاول درکار تھا اس کا ۶۰ فیصد باہر سے منگایا جاتا تھا۔

جزائر مشرقِ ہند میں چائے، کافی، ربڑ، شکر کی پیداوار ڈچ حکومت کے زیرِ اثر بڑھی۔ ۱۸۲۵ء سے ۱۸۳۰ء تک کافی کی پیداوار سہ چند سے زیادہ بڑھ گئی۔ ۱۸۵۳ء سے ۱۸۸۰ء تک نیشکر کی پیداوار ۱۶ لاکھ سے ۴۰ لاکھ پکل ہو گئی۔ ۱۸۶۵ء سے چائے کی کاشت بھی بڑھ گئی۔ ۱۹۳۰ء میں ۳½ لاکھ ایکڑ زمین پر کافی کی کاشت بڑے پیمانے پر ہوتی تھی، ۴½ لاکھ ایکڑ سے اوپر پر نیشکر کی، کوئی ۵ لاکھ ایکڑ پر چائے کی، ۴ لاکھ ایکڑ پر تمباکو کی، اور کوئی ۳۲ لاکھ ایکڑ پر ربر کی۔

فرانسیسی انڈو چائنا میں بھی چاول کو تجارتی مال کی حیثیت سے بڑھایا گیا۔ اور ۱۸۸۰ء سے ۱۹۳۵ء تک رقبہ زیر کاشت میں ۴۳۱ فیصد اور برآمد میں ۵۴۵ فیصد کا اضافہ ہوا۔ بیسویں صدی کے شروع میں یہاں ربڑ کو بھی فروغ دیا جانے لگا۔ ملک کے لوگ ۱۹۱۴ء میں کوئی ۲۰۰-۱۵۰ ٹن ربڑ نکالتے تھے۔ بڑے پیمانے پر مغربی سرمایہ داروں نے اسے بڑھایا تو ۱۹۲۹ء میں ۱۰ ہزار ٹن سے اوپر پہنچا دیا اور ۱۹۳۸ء میں ۶۰ ہزار ٹن تک۔ کوئلہ، ٹین اور جست نکالنے کا کام بھی اسی صدی میں شروع ہوا۔ ۱۹۰۶ء میں اس کام میں کل ۴۰۰۰ آدمی لگے تھے، ۱۹۱۳ء میں ۱۲۰۰۰ ہو گئے اور ۱۹۳۸ء میں ۴۷۰۰۰۔

سیام میں بھی چاول کی کاشت برآمد کے لئے بڑھی۔ ۱۸۵۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی

کے ایک عہدہ دار نے لکھا تھا کہ سیام کی برآمد میں چاول اور ساگون کا بہت کم حصہ ہے لیکن ہوتے ہوتے سیام کی آبادی میں ۸۰ فی صد لوگ چاول کی کاشت میں لگ گئے۔ پچھلی جنگ سے پہلے کے دس سال میں سیام سالانہ ۱۶ لاکھ ٹن برآمد کے لئے پیدا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ سیام ٹین کی پیداوار میں دنیا میں چوتھے نمبر پر اور ربر میں پانچویں نمبر پر پہنچ گیا تھا۔

اسی طرح برما سے بھی چاول کی برآمد بہت بڑھی۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان سالانہ اوسط برآمد کا کوئی ۳۵ لاکھ ٹن تھا۔ ۱۹۱۴ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیانی زمانے میں برما کے اندر لگا ہوا پردیسی سرمایہ خصوصاً برطانوی سرمایہ سہ چند ہو گیا۔ ۱۹۴۰ء میں کوئی ۵۰ ملین ڈالر لگے ہوئے تھے، ۱۶ ملین تیل کے کاروبار میں، ۵ ملین دوسری کانوں میں، ۱½ ملین ربڑ، چاء اور دوسری خام زرعی اجناس کے کام میں۔

جزائر فلپائن میں نیشکر، سنی، کھوپرے اور تمباکو کی کاشت کو فروغ ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں کوئی ۶½ لاکھ ایکڑ پر نیشکر کی کاشت ہوتی تھی اور اس میں ۴½ لاکھ ایکڑ سے زیادہ سرمایہ داری زرعی کمپنیوں کے ہاتھ میں تھی۔ کھوپرا ۱۴ لاکھ ایکڑ سے زیادہ پر پیدا کیا جاتا تھا، تمباکو تقریباً ۲ لاکھ ایکڑ پر۔

سیلون میں چاء کی کاشت ۱۸۶۰ء کے بعد سے بڑھی۔ ۱۸۷۵ء میں کل ۳۰۰ ایکڑ پر چاء کی کاشت ہوتی تھی۔ ۱۸۹۵ء میں یہ رقبہ بڑھ کر ۳ لاکھ ایکڑ سے زیادہ ہو گیا تھا اور ۱۹۱۲ء میں ۴½ لاکھ ایکڑ تک پہنچ گیا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں ۵½ لاکھ ایکڑ پر ربر کی کاشت ہوتی تھی، منجملہ اس کے ۳½ لاکھ سے زیادہ پر بڑے پیمانے کی سرمایہ دارانہ کاشت۔ کھوپرے کا رقبہ ۱۰ لاکھ ایکڑ سے زیادہ تھا۔ غرض ہر جگہ تجارتی اجناس کی پیداوار نہایت تیزی سے بڑھی۔

(۲) ان ملکوں کی زراعت میں اکثر یہ ہوا کہ پرانے مالکوں کے ہاتھ سے زمین نکل کر نئے لوگوں کے ہاتھ میں پہنچی، بسا اوقات پردیسیوں کے ہاتھ میں۔ مثلاً جزائر شرق الہند میں تمام وہ رقبہ جو مشترک مملکت میں تھا بکتا گیا اور یورپین سرمایہ داروں نے زمین کے بڑے بڑے رقبے خرید لئے۔

کروڑ ½، ۱۱ لاکھ جس کے رقبے میں سے ½ ۳۱ لاکھ کمپنیوں کے یعنی اکثر یورپینوں کے ہاتھ میں تھا۔ انڈوچائنا میں بھی یورپین جائدادیں اور بڑے پیمانے کی دیسی جائدادیں غالب ہوگئیں۔ ملایا میں بھی ربڑ کا رقبہ زیادہ تر (تقریباً ½) ۱۰۰ ایکڑ سے زیادہ رقبے کی جائدادوں میں تھا۔ ہندوستان میں بھی ساہوکار اور روپیے والے طبقوں کے ہاتھ میں زمینیں بڑی تیزی سے منتقل ہوئیں اور جہاں زمین منتقل نہیں ہوئی وہاں کاشت کار کو سرمایہ دار نے تسمہ پا بن کر ایسا دبوچا کہ رہائی کی صورت مشکل ہوگئی۔ چین کے متعلق اعداد نہیں ملتے۔ لیکن وہاں بھی صورت کچھ ایسی ہی ہے۔ کوان ٹنگ کے صوبے میں زمین کے رقبے کا ۵۳ فیصد ۲ فیصد آبادی کے تصرف میں ہے۔ پھر ان کے نیچے مالدار کاشتکاروں کے ہاتھ میں جن کی تعداد ۴ فیصد ہے ۱۳ فیصد رقبہ ہے، پھر اوسط قسم کے خوشحال کاشتکاروں کے ہاتھ میں جن کی تعداد ۲۰ فیصد ہے ۱۵ فیصد زمین ہے اور باقی ۷۴ فیصد آبادی کے پاس ۱۹ فیصد زمین ہے۔

(۳) وسائل نقل وحمل کی ترقی نے تجارتِ برآمد و درآمد کو بہت بڑھایا۔ لیکن تجارتِ خارجہ پر ہمیشہ نظر خاص رہی۔ خام جنس باہر جاتی رہی اور مصنوعات باہر سے آتی رہیں۔ ۱۹۴۰ء میں برما سے کل برآمد کا ۷۳ فیصد چاول اور پٹرول پر مشتمل تھا۔ انڈوچین کی برآمد میں ۷۰ فیصد چاول کئی اور ربڑ پر، جزائر شرق الہند میں ۵۶ فیصد برآمد ربڑ اور پٹرول کی تھی، سیام کی برآمد کا ۹۰ فیصد چاول اور ربڑ پر مشتمل تھا۔ فلپائن سے کوئی ۷۰ فیصد برآمد شکر، کھوپرے، تمباکو اور سنئی کی تھی۔

(۴) دیسی صنعتیں اور دستکاریاں برباد ہوگئیں۔ ہندوستان اور چین میں کپڑے کی صنعت بالکل ختم ہوگئی۔ دیہی دستکاریاں کچھ دن چلیں مگر تابکے۔

(۵) ایک اور خاص اثر اس معاشی تعلق کا یہ ہوا کہ پردیسی سرمایہ ان ملکوں کی کانوں میں اور ریلوں میں اور ابتدائی صنعتوں میں لگا۔ ہر صاحبِ اقتدار ملک نے اپنے حلقۂ اثر کا اجارہ سا اپنے سرمایے کو دے دیا تھا۔ برطانوی اور فرانسیسی سرمایہ ۱۹۱۴ء میں نوآبادیوں میں یوں لگا ہوا تھا۔

برطانیہ :	ہندوستان اور سیلون میں	۸ء۳۷۸	ملین ڈالر
	ملایا میں	۳ء۲۸	" "
	چین میں	۹ء۴۳	" "
	دوسری نوآبادیوں میں تقریباً	۳۰	" "
فرانس :	فرانسیسی نوآبادیوں میں	۴	ملین فرانک
	ایشیا میں	۲ء۲	" "

ان معیشتوں میں جو تبدیلی سیاسی حالات کے تغیر سے رونما ہو رہی ہے وہ دو نوع کی ہے ایک تو آزاد سیاسی اداروں کی نشوونما، دوسرے معاشی زندگی کی ترتیب نو۔ معاشی تغیر کا پہلا مسئلہ ہے کہ ان کو معیشت جو تابع معیشت ہونے کی وجہ سے ایک ہی طرف کو جھک گئی تھی اس میں تنوع پیدا کیا جائے۔ تجارتی اجناس خام پر ان کی زندگی کا انحصار نہ رہے۔ غذائی پیداوار کی طرف سے پھر توجہ ہو۔ اور یہ ملک کم سے کم غذا کے معاملے میں حتی الوسع دوسروں کے دست نگر نہ رہیں۔ غالباً بڑی بڑی سرمایہ دار کمپنیوں کی جائدادوں کو تقسیم کرنا ہوگا اور کسانوں یا امدادِ باہمی کی انجمنوں کے سپرد کرنا ہوگا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد اس قسم کا ایک زرعی انقلاب مشرقی یورپ میں ہو چکا ہے۔

دوسرا مسئلہ صنعت کو پھیلانے کا ہوگا۔ یہ ممالک زیادہ تر زرعی ہیں۔ آبادی کے معتدبہ حصے کو زراعت سے صنعت میں منتقل کر کے ہم آہنگ اور متوازن معیشتیں بنانی ہوں گی۔

صنعت کی توسیع میں سب سے زیادہ مشکل سرمایے کی ہوگی ورنہ قدرتی وسائل اور محنت کی ان ممالک میں فی الجملہ کمی نہیں ہے۔ خود ان میں سے اکثر کی آبادی بہت غریب ہے اور بچت کا امکان بعید۔ غالباً ان علاقوں میں باہر کا سرمایہ آئے گا اور براہ راست سیاسی اقتدار کی جگہ درپردہ معاشی تعاون کا راستہ کھلے گا۔ آنے والے سیاسی تغیرات میں یہ نکتہ سامنے رہے تو بہت کچھ جو ویسے سمجھ میں نہیں آتا شاید زیادہ آسانی سے سمجھ میں آنے لگے۔

(۳)

جنوبی مشرقی ایشیا کے بعض ممالک میں سرمایے کی طلب کا ایک اندازہ ایوگین اسٹالی نے اپنی کتاب World Economic Development میں کیا ہے۔ یہ اندازہ اس مفروضے پر مبنی ہے کہ صنعت کے پھیلنے کی رفتار وہ ہوگی جو جاپان میں ۱۹۱۰ء سے ۱۹۳۶ء تک تھی اور سرمایہ لگانے کی شرح آبادی اور رقبے کے اعتبار سے بھی وہی ہوگی۔ اس مفروضے پر مختلف ممالک کی طلبِ سرمایہ کا اندازہ ذیل کے نقشے سے ہوگا:۔

اتنے ہزار ملین سرمایہ دس دس سال کے عرصے میں درکار ہوگا

ملک	پہلے دس سال میں	دوسرے دس سال میں	تیسرے دس سال میں	چوتھے دس سال میں
چین	۱۳ر۶	۲۳ر۱	۴۴ر۹	۵۱ر۶
ہندوستان	۷ر۲	۱۴ر۶	۲۷ر۷	۳۱ر۴
انڈونیشیا	۲ر۲	۳ر۷	۷ر۲	۸ر۳
دوسرے علاقے	۳ر۵	۶	۱۱ر۵	۱۳ر۳
میزان	۲۶ر۵	۴۷ر۴	۹۱ر۳	۱۰۴ر۶
سالانہ	۲ر۷	۴ر۷	۹ر۱	۱۰ر۵

سیاسی دنیا

روس اور متحدہ ریاستوں کی کشمکش

جس زمانے سے کہ مغرب کی جمہوری ریاستیں روس سے مدد لینے اور اس کی مدد کرنے پر مجبور ہوئی ہیں انھیں یہ شکایت رہی ہے کہ روسی پوری بات نہیں کہتے اور غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ سیاست میں پوری بات کہنا کہیں کا دستور نہیں ہے، اور جنگ کے زمانے میں جرمنی اور جاپان کو شکست دینے کی ضرورت ایسی تھی کہ اس کے مقابلے میں آپس کی غلط فہمیاں دور کرنا بھی کچھ بہت اہم نہ معلوم ہوتا تھا۔ مارشل سٹالن، پریزیڈنٹ روزولٹ اور مسٹر چرچل کی ملاقاتوں میں ظاہر ہو گیا ہوگا کہ ان کے منصوبے کیا ہیں، اور شاید غلط فہمی کا لفظ بہت سے اختلافات کو چھپانے کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔ جنگ کے بعد پردہ داری کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی، اور روسیوں پر یہ الزام لگایا جاتا رہا کہ یالٹا اور پوٹس دام میں جو کچھ طے ہوا تھا اس کی وہ خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ روسیوں کو سیاسی گفتگو کرنے کی ابھی اچھی مشق نہیں ہے، اور بحثوں میں اکثر یہ محسوس ہوا کہ وہ بے تکی ضد کرتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ اپنا کام کرتے رہے، اور دوسری طرف برطانیہ اور متحدہ ریاستوں نے اپنے کسی ارادے کو نہیں بدلا۔ اب کوئی دو برس کی صحبت کے بعد معاملے کی اصل صورت ظاہر ہو گئی ہے۔ جنگ کے آخری سالوں میں جو کانفرنسیں ہوئیں ان میں دنیا تین حصوں میں تقسیم کی گئی تھی۔ ان میں سے ایک روس کا حصہ تھا، دوسرا متحدہ ریاستوں کا، تیسرا برطانیہ کا۔ ان حصوں کی حدود بھی تو رکھی گئی ہوں گی، لیکن یہ ممکن تھا کہ ایک ملک جو برطانیہ کے حصے میں شامل کیا گیا ہو کسی انقلاب کی بدولت فیصلہ کرے کہ وہ روس کی

طرف چلا جائے گا، یا جو روس کو دیا گیا ہو وہ جمہوری خاندان کا رکن بن جائے۔ برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کو روس سے یہ شکایت ہے کہ اس نے جو کچھ مانگا تھا وہ اُسے دے دیا گیا، اس کے باوجود اُسے سیری نہیں ہوئی، جن ملکوں کا وہ سرپرست بنایا گیا ان میں اس نے زبردستی کمیونسٹ پارٹی کی حکومت قائم کرائی یا کرانے کی کوشش کی، اور بعض ملکوں پر جو اس نے دوسروں کو دینا منظور کیا تھا قبضہ کرنے کی نامناسب تدبیریں کیں۔ روسی اس کے جواب میں خود اعتراض اور شکایتیں کرتے ہیں، اور کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جھگڑے ختم ہونے والے نہیں ہیں۔

پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے درمیان روسی ایک نیا نظامِ زندگی قائم اور استوار کرنے میں مصروف تھے۔ اب وہ اس قابل ہو گئے ہیں کہ اقتدار کی توسیع کے ان منصوبوں کو جو اس دوران میں پس پشت ڈال دئے گئے تھے پھر اُٹھائیں۔ دوسری طرف متحدہ ریاستوں کے شہری پہلی جنگِ عظیم تک اپنی صنعت اور تجارت کو ترقی دے رہے تھے، انھیں خیال تھا کہ یورپ اور ایشیا کے سیاسی معاملات سے الگ رہنا ہی بہتر ہے، لیکن ان کی دولت اور ان کے بڑھتے ہوئے تجارتی اور صنعتی تعلقات نے انھیں مجبور کر دیا کہ وہ دنیا کی سیاست میں ایک فریق کی حیثیت سے شریک ہوں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی کامیابی کا سبب وہ حوصلہ مندی ہے جو آزاد جمہوری نظامِ زندگی پیدا کرتا ہے، وہ اپنی سیاست کو سرمایہ داری کے فروغ کا ذریعہ نہیں بنانا چاہتے، مگر سرمایہ داری سے اجتماعی زندگی میں جو عیب پیدا ہوتے ہیں انھیں وہ تسلیم کریں تب بھی اُنھیں یہ گوارا نہیں ہوتا کہ ان عیبوں کو دور کرنے کے لئے انفرادی آزادی اور خود مختاری کو قربان کریں۔ وہ اپنی دولت اور کامیابی کو اس کی سند مانتے ہیں کہ ان کا طریقہ صحیح اور ان کا نظامِ زندگی سب سے بہتر ہے، اور دنیا ان کی مدد کی اتنی محتاج ہے کہ ان سے اختلاف نہیں کر سکتی۔ روس نے ایک نئے معاشرتی نظام کا نمونہ پیش کیا ہے، اور اس کے کارناموں کا ان ملکوں کی آبادی پر بہت اثر ہوا ہے۔ جہاں تھوڑے سے امیر دولت پیدا کرنے کے تمام وسائل پر قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً دنیا کے ہر ملک میں ایک کمیونسٹ پارٹی ہے جو

عقیدت مندی پالیسی اور وجہ سے جو قابلِ تعریف نہیں کومیونسٹ اصولوں کا چرچا اور روسی سیاست کی حمایت کرتی ہے ۔ اس طرح دنیا روس اور متحدہ ریاستوں کے مقابلے کا میدان بن گئی ہے ۔ برطانیہ ہر لحاظ سے متحدہ ریاستوں کا حمایتی ہے اور روسی اتنے تجربہ کار اور ہوشیار نہیں ہیں کہ متحدہ ریاستوں اور برطانیہ کے اتحاد میں کوئی خلل ڈال سکیں ۔ اب روس ایک طرف ہے، باقی دنیا دوسری طرف ۔

سیاسی ناتجربہ کاری کی وجہ سے روس کو کہیں بھی سیاسی کامیابی نصیب نہیں ہوئی ہے ۔ جن ملکوں میں روسی فوجیں موجود ہیں وہاں کومیونسٹ پارٹی حاوی ہے یا حاوی کی جا سکتی ہے، مگر روسی فوجیں ہٹالی جائیں تو کومیونسٹ پارٹی کی حکومت بھی ختم ہو جائے گی ۔ ایران کو روسیوں نے ایک معاہدہ کرنے پر مجبور کر لیا، لیکن آذربائجان کی کومیونسٹ پارٹی روسی سیاست کا آلۂ کار بھی ثابت ہو گئی ۔ ترکی اس پر آمادہ نہیں کیا جا سکا کہ درِ دانیال کے متعلق روس سے الگ گفتگو کرے اور اسے ایک بین الاقوامی مسئلہ نہ بنائے ۔ مشرقی ایشیا میں روسی چین سے کوئی سمجھوتا نہیں کر سکے، اور حال ہی میں چینی کومیونسٹوں نے بہت سخت شکست کھائی ہے ۔ ممکن ہے اس کا نتیجہ یہ نہ ہو کہ چین کی کومیونسٹ پارٹی نیست و نابود کر دی جائے، مگر یہ بالکل ظاہر ہو گیا ہے کہ متحدہ ریاستوں نے چین کی قومی حکومت کو ہر طرح سے مدد پہنچائی اور روس چینی کومیونسٹوں کے کچھ کام نہ آیا ۔ روسی اب بھی چاہیں تو ایک نئے سیاسی اور معاشرتی مذہب کے مبلغ بن سکتے ہیں اور اس تبلیغ کے ذریعے اپنے مخالفوں کو کمزور کر سکتے ہیں ۔ انھوں نے اس تبلیغ سے زیادہ اپنی قوت پر بھروسا کیا، اور ہر معاملے کو اس نظر سے دیکھتے رہے کہ اس میں ان کو کتنا فائدہ ہو سکتا ہے اور اس فائدے کو حاصل کرنے کے لئے کتنی قوت درکار ہوگی تو ممکن ہے چند سال کے اندر کومیونسٹ نظامِ زندگی کے نام لیوا بہت کم اور بدنام ہو جائیں اور روسی سیاست جبر کا نمونہ بن جائے ۔

روس، متحدہ ریاستوں اور برطانیہ کے درمیان یورپ کی جو تقسیم ہوئی ہے اس میں برطانیہ یونان کا سرپرست مانا گیا ہے، روس بلغاریہ اور یوگوسلاویہ کا ۔ جرمنوں کی پسپائی کے بعد برطانیہ نے

یونان میں ذمہ دار حکومت قائم کرنے کے لیے جو تدبیریں کیں ان پر ہر طرف سے اعتراض کئے گئے، لیکن یونان کو مسلسل خانہ جنگی سے بچانے کی دو صورتیں تھیں، ایک یہ کہ جنگ سے پہلے جو طبقہ حکمراں تھا اُسے برسر اقتدار کیا جائے، دوسری یہ کہ کومیونسٹ حکومت قائم کی جائے۔ برطانیہ نے پہلی صورت کو ترجیح دی، کیونکہ ملک کو کومیونسٹوں کے سپرد کر دینے کے معنی یہ تھے کہ اُسے روس کے حوالے کر دیا جائے، اور اس طرح روس کو مشرقی بحرِ روم میں ایک مورچہ بنانے کا موقع دیا جائے۔ یونانیوں کی باہمی عداوتیں ایسی شدید ہیں کہ ایک مرتبہ فساد شروع ہو جائے تو پھر امن قائم کرنا بہت دشوار ہو جاتا ہے، اور اس مرتبہ روسی یونان کے کومیونسٹوں کو اتنا سہارا دیتے رہے ہیں کہ برطانیہ یونانی حکومت کو ہر طرح سے مدد کرنے اور یونانیوں کی بنیادی ضروریات پر لاکھوں پاؤنڈ صرف کرنے کے بعد بھی کسی قسم کا اطمینان حاصل نہیں کر سکا۔ اس وجہ سے شروع مارچ میں برطانیہ نے پریزیڈنٹ ٹرومین کو اطلاع دی کہ وہ یونان کی سرپرستی کا خرچ برداشت نہیں کر سکتا۔ دوسری طرف روس نے زبان سے صاف صاف کہہ دینے کے سوا اور ہر طریقے سے ظاہر کر دیا ہے کہ وہ بلغاریہ، یوگوسلاویہ، البانیہ اور ہنگری کو دوستانہ تعلقات کے ذریعے نہیں بلکہ زبردستی اپنے قابو میں رکھنا چاہتا ہے، اور یونان میں وہ فساد برپا کرتا رہے گا جب تک کہ برطانیہ عاجز آکر اُسے چھوڑ نہ دے۔ اسی دوران میں ہنگری کی کومیونسٹ پارٹی نے جسے مجلس میں اکثریت حاصل نہیں ہے حاکم پارٹی کے لیڈر کو گرفتار کرایا، البانیہ کے قریب ایک امریکی اور دو برطانوی جہاز بحری بم سے ٹکرا کر ڈوبے، اور اس سلسلے میں البانی حکومت نے ایسے عذر کئے جس سے پہچانا جا سکتا تھا کہ معاملے کی پشت پر کون ہے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ وہ بیان ہے جو پریزیڈنٹ ٹرومین نے ۱۲ مارچ کو دیا۔

اس بیان سے واضح ہو گیا کہ اب جمہوری ملک، یعنی متحدہ ریاستیں اور برطانیہ کومیونسٹ ملکوں، یعنی روس اور اُس کے متعلقین کے مقابلے پر آ گئے ہیں، متحدہ ریاستیں ہر اس ملک کی مدد کریں گی جس کی حکومت پر کومیونسٹ زبردستی قبضہ کرنا چاہیں، اور سر دست یونان اور ترکی کو اتنی مدد دیں گی کہ وہ اپنی حفاظت کر سکیں۔ پریزیڈنٹ ٹرومین نے اپنے بیان میں روس کا کہیں نام نہیں لیا، لیکن اس میں کوئی

شک نہیں تھا کہ جس خطرے سے وہ یونان اور ترکی کو بچانا چاہتے ہیں وہ روس اور روس کا سیاسی طرزِ عمل ہے۔ یہ بھی ایک بہت غیر معمولی بات ہے کہ یہ بیان کانگریس کے دونوں ایوانوں کے ایک مشترک اجلاس میں دیا گیا۔ اب سے دس برس پہلے امریکی قوم ایسے بیان سے کوئی خاص اثر نہ لیتی، مگر اب اس کی ذہنیت بدل گئی ہے۔ کانگریس میں اکثریت ریپبلکن پارٹی کی ہے، جسے اصولاً ایسے پریزیڈنٹ کی جو مخالف پارٹی کا رکن ہے ہر تجویز پر اعتراض کرنا چاہیے، لیکن کومیونزم کو ہر سیاسی خیال کے امریکی اپنے لئے ایک بہت بڑا خطرہ سمجھتے ہیں اور حال ہی میں کانگریس کے ایوانِ زیریں نے ایک کمیٹی اس کی تحقیق کرنے کے لئے مقرر کی ہے کہ متحدہ ریاستوں کی کومیونسٹ پارٹی کے مقاصد کیا ہیں، اور اب تک جو کچھ دریافت ہوا ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ متحدہ ریاستوں کی حکومت اور قوم دونوں وہاں کی کومیونسٹ پارٹی کو اپنا دشمن سمجھ کر اس کے خلاف مناسب کارروائیاں کریں گے۔ اس وجہ سے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ پریزیڈنٹ ٹرومین کے بیان پر یہ اعتراض نہیں کیا گیا کہ اس میں امریکی قوم کو ڈرا کر یونان اور ترکی کو مدد پہنچانے کی تجویز منظور کرانے کی کوشش کی گئی ہے، خطرے کی حقیقت کو سب تسلیم کرتے ہیں، جو اختلاف ہے وہ اس میں کہ خطرے کو دور کرنے کی بہترین تدبیریں کیا ہو سکتی ہیں۔ محتاط سیاست دانوں کی عام رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ متحدہ ریاستوں کو دنیا کو کومیونزم سے بچانے کا بڑا کام جزوی طور پر نہ کرنا چاہیے بلکہ کام کی وسعت اور تنوع اور جان اور مال کے خرچ کا زیادہ سے زیادہ صحیح اندازہ کر کے اسے منظم طریقے پر انجام دینا چاہیئے۔

برطانیہ کا یہ کہہ دینا کہ وہ یونان کی اور مدد نہیں کر سکتا ہے، اور اس طرح یہ ظاہر کرنا کہ وہ یونان، ترکی اور مشرقی بحرِ روم کو روس سے محفوظ نہیں رکھ سکتا ایک بہت بڑی بات ہے۔ اس سے اگر ایک طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ برطانیہ میں اتنی سکت نہیں ہے کہ اپنی ساری ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھا سکے تو دوسری طرف یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسے متحدہ ریاستوں پر اتنا بھروسا ہے کہ انھیں بحرِ روم میں اپنا قائم مقام بنا سکے۔ لیکن جب برطانیہ نے ہندوستان کو جون ۱۹۴۸ء تک آزاد کر دینے

کا وعدہ کرلیا ہے، اور اُسے یقین نہیں ہے کہ مصر اور فلسطین میں اس کے قدم جمے رہ سکیں گے تو بحر روم کی حفاظت متحدہ ریاستوں کے سپرد کر دینا کچھ نامناسب نہیں۔ امریکہ میں بعض سیاست دانوں کو اندیشہ ہے کہ برطانیہ رفتہ رفتہ دنیا کی چوکیداری کا سارا کام اور سارا خرچ متحدہ ریاستوں پر ڈال دے گا، مگر حقیقت یہ ہے کہ اب امریکہ اس ذمہ داری سے سبک دوش نہیں ہو سکتا، اور بہتر یہ ہے کہ برطانیہ خود اس سے دست بردار ہو کر رقابت کے امکان کو دور کر دے۔

جرمنی کے متعلق فیصلہ

جنگ کے بعد جرمنی ۴ حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ان حصوں کی حدود پہلے ہی مقرر کر دی گئی تھیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا ہوتا تو نہ معلوم کیا کیا جھگڑے ہوتے۔ روسی شروع سے اتحادِ عمل کی پابندیوں سے بچتے رہے، اپنے حصے کی ناکہ بندی اس طرح کر لی کہ برطانوی اور امریکی عہدہ داروں اور فوجی افسروں کا اس کے متعلق کچھ معلوم کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ اپنے علاقے کے تمام کارخانوں کو جو سلامت رہے تھے یا جن میں استعمال کے قابل سامان تھا انھوں نے اُٹھا کر روس پہنچا دیا، بہت سے سائنسدانوں اور صنعتی ماہروں کو پکڑ لیا گیا، اور اس کے علاوہ انھوں نے قریب نو لاکھ جرمن قیدیوں کو اپنے ملک میں رکھ چھوڑا ہے اور ان سے کام لے رہے ہیں۔ مغربی جرمنی کا بہت سا صنعتی سامان اور بہت سے ماہر برطانیہ اور امریکہ پہنچا دئے گئے ہیں، اگر برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کے اپنے صنعتی نظام کو نقصان ہوتا اگر وہ جرمنی سے بہت زیادہ سامان اور آدمی لے جاتے، انھوں نے وہی مال لوٹا جو جرمنی کے سوا اور کہیں مل نہیں سکتا تھا۔

روسیوں نے اور ملکوں کی طرح جرمنی میں بھی کومیونسٹ پارٹی کی سرپرستی کی، اور اب ان کے علاقے میں وہی ایک پارٹی ہے جو سوشلسٹ یونٹی پارٹی کہلاتی ہے۔ مغربی جرمنی میں تین بڑی پارٹیاں ہیں، جن میں سوشل ڈیموکریٹ اور کرسچین ڈیموکریٹک یونین زیادہ ممتاز ہیں۔ روسی سیاست کے مقاصد کو اس طرح پیش کرنا کہ وہ جرمن قوم کے مطالبے معلوم ہوں کوئی آسان کام نہیں ہے، سوشلسٹ یونٹی پارٹی اپنی بیشتر قوت یہ ثابت کرنے میں صرف کرتی ہے کہ برطانیہ اور متحدہ ریاستوں

کے علاقے میں ہر طرح کی بدنظمی ہے اور مظالم کئے جاتے ہیں، اور وہ خاص طور سے ان کارروائیوں پر اعتراض کرتی ہے جن کی بدولت جرمن آبادی کے لئے غذا کی فراہمی اور دوسری بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے میں کچھ سہولت ہو جاتی ہے۔ جرمنی کی تمام پارٹیاں چاہتی ہیں کہ ملک میں ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم ہو، اگرچہ جنوبی اور مغربی جرمنی میں چند جماعتیں اس خیال کی بھی ہیں کہ وفاقی حکومت مرکزی حکومت سے بہتر ہوگی۔ لیکن حکومت کے مرکزی ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب جرمنی کی حدود طے کردی جائیں۔ روسی اوڈر اور نلسے دریاؤں کو جرمنی کی مشرقی سرحد بنانا چاہتے ہیں، اور ان کا یہ مطالبہ مان لیا گیا تو جرمنی کا وہ سارا علاقہ نکل جائے گا جہاں غلہ پیدا ہوتا ہے۔ سوشلسٹ یونٹی پارٹی روسیوں کے مطالبے کی مخالفت نہیں کرتی، دوسری تمام پارٹیاں اس پر متفق ہیں کہ جرمنی اپنی زراعتی پیداوار سے محروم کردیا گیا تو آبادی کا پیٹ بھرنے اور تاوان جنگ ادا کرنے کی ذمہ داری نہیں لی جاسکتی۔ ابھی تک یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ماسکو کی کانفرنس جرمنی کے بارے میں کیا فیصلہ کرے گی۔ لیکن پھل میں جتنا رس ہو اتنا ہی نچوڑنے سے نکل سکتا ہے۔ جرمن بھوکے اور پریشان حال ہوئے، ان کا معاشی نظام آج کل کی طرح بگڑا رہا تو وہ تاوان کیسے ادا کریں گے۔ جرمنی کی کوئی پارٹی اتحادیوں کے فیصلے پر عمل کرنے کی ذمہ داری نہ لے گی جب تک کہ اس کا یقین نہ ہو کہ فیصلوں پر عمل کرنا ممکن ہے، اور انکار کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کو جرمنی پر قبضہ رکھنے کا خرچ کچھ عرصے تک اور برداشت کرنا پڑے۔

"مردیکا!"

۲۵ مارچ کو بٹیویہ میں ولندیزی اور انڈونیشی نمائندوں نے ایک معاہدے پر دستخط کردئے جس سے امید کی جاتی ہے کہ انڈونیشیا کی جنگ آزادی کامیابی کے ساتھ ختم ہو جائے گی۔ بہت لڑائی جھگڑا کرنے کے بعد ولندیزی حکومت نے آخرکار انڈونیشیا کی خودمختاری کو تسلیم کرلیا ہے، اس شرط پر کہ وہ ولندیزی شہنشاہیت میں ایک رکن کی حیثیت سے شامل رہے۔ اس شہنشاہیت اور اس کی رکنیت کو ۱۹۴۹ء تک ایک باضابطہ شکل دے دی جائے گی۔ ولندیزی حکومت

برطانیہ نے یہ معاہدہ بہت مجبور ہو کر کیا ہے۔ انڈونیشی لیڈروں کی ہوشیاری کی بدولت ولندیزی، برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کو یقین نہیں دلا سکے کہ انڈونیشیا کی قومی تحریک جاپان کے حامیوں کی تحریک ہے اور نہ یہ ثابت کر سکے کہ انڈونیشی کمیونسٹ ہو گئے ہیں۔ برطانیہ کی جو ہندوستانی فوج جاوا میں تھی وہ قومی آزادی کی تحریک میں شریک ہو گئی، آسٹریلیا کے مزدوروں نے ولندیزی حکومت کو آسٹریلیا سے جنگ اور خورد و نوش کا سامان نہیں لے جانے دیا، اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ انڈونیشیا کی تحریک آزادی باہمی اختلافات کی وجہ سے کمزور نہیں ہوئی۔ ولندیزی اپنی فوجی اور بحری قوت کے بل پر صرف دو تین شہروں پر قبضہ کر سکے ہیں، اور جب موقع ملتا ہے اپنی فوجوں کو تھوڑی دور اور آگے بڑھا دیتے ہیں۔ انڈونیشی جانتے ہیں کہ ولندیزیوں کے قول اور عہد و پیمان پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا، ۲۵ مارچ کے معاہدے کے بعد بھی ولندیزی فوجیں بندرگاہ سورابایہ کے قریب پیش قدمی کر چکی ہیں، اور ممکن ہے یہ سلسلہ جاری رہے۔ انڈونیشی حکومت کے ہاتھ میں "ترپ کا پتہ" یہ ہے کہ ربڑ کے تمام ذخیرے اس کے قبضے میں ہیں۔ امریکہ کو ربڑ کی سخت ضرورت ہے اور انڈونیشی حکومت سودا کرنے پر تیار ہے، مگر ولندیزی کہتے ہیں کہ سودا اُن سے کرنا چاہیئے اور وہ امریکی جہازوں کو ربڑ لادنے نہیں دیتے۔ امریکہ اور برطانیہ دونوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ ولندیزی ضدی اور بدمعاملہ ہیں، اسی وجہ سے دونوں اصرار کرتے رہے ہیں کہ ولندیزی انڈونیشیا کی قومی حکومت کو تسلیم کر کے لڑائی کو ختم کر دیں۔ ولندیزیوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور لڑائی کو جاری رکھا تو وہ کچھ فائدے میں نہ رہیں گے۔ انڈونیشی اب آزاد ہو کر ہی رہیں گے۔ "مردیکا!" (آزادی) کے نعرے میں بڑی تاثیر ہے۔

جامعہ ملیہ کے لئے یہ بہت فخر کی بات ہے کہ انڈونیشیا کے کئی نوجوان جنھوں نے جامعہ میں تعلیم پائی ہے قومی آزادی کی تحریک میں شریک ہوئے ہیں اور قوم کی خدمت کا پورا حق ادا کیا ہے۔

ایشیائی کانفرنس

ہندوستان کے سیاست دانوں کی بیدار مغزی اور ہندوستان کے مستقبل کی بہت نیک فال

ایشیائی قوموں کی کانفرنس تھی جس کے اجلاس ۲۳ مارچ سے ۲ اپریل تک ہوئے۔ اس کانفرنس میں ۳۲ قومیں شریک ہوئیں، اور سب نے محسوس کیا کہ کانفرنس ایشیائی قوموں کے درمیان معاشی اور تہذیبی اتحادِ عمل کی تمہید ہے۔ کانفرنس غیر سرکاری تھی، شرکت کے دعوت نامے صرف ایسے اجتماعی اداروں کو بھیجے گئے تھے جن کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں، اور حکومتوں سے صرف "ناظر" بھیجنے کی درخواست کی گئی۔ دلی کے شہریوں نے بھی کانفرنس کا حق ادا کیا۔ تینوں عام جلسوں میں حاضرین کی تعداد بہت تھی، مگر آدابِ مجلس کا لحاظ رکھا گیا اور ایسی تقریریں بھی خاموشی سے سنی گئیں جن کا ایک لفظ بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔

یہ بہت افسوس کی بات ہے کہ مسلم لیگ نے کانفرنس میں شرکت نہیں کی۔ مصر، عرب لیگ، ایران، افغانستان، تاجکستان، کزاکستان، ازبکستان، ملایا اور انڈونیشیا کے نمائندے سب مسلمان تھے اور ان میں سے مصر اور افغانستان کے نمائندوں کو اس بات سے خاصی تکلیف ہوئی کہ ہندوستانی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت نے کانفرنس میں ان کی شرکت کو مسلمانوں کے مفاد کے خلاف قرار دے دیا تھا۔ انھیں مسلم لیگ کی رائے پہلے سے بتا دی جاتی تو مناسب تھا۔ لیکن مسلم لیگ نے کانفرنس کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ اُس وقت کیا جب مصر، ایران اور افغانستان کے بیشتر نمائندے دلی پہنچ چکے تھے۔

قوموں کی اس پہلی کانفرنس سے تبادلہ خیالات کے سوا اور کسی نتیجے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ کانفرنس نے ان مسائل کے متعلق جو بحث میں آئے کوئی تجویز منظور نہیں کی، صرف بحثوں کے جو مختلف خلاصے تیار کیے گئے تھے ان کی تصدیق کی۔ کانفرنس کے کام کو جاری رکھنے کے لئے ایک عارضی کمیٹی مقرر کر دی گئی ہے جس میں ہر قوم کے دو نمائندے ہوں گے، اور اس کمیٹی کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو منتخب ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ تجویز منظور کی گئی ہے کہ دلی میں ایشیائی قوموں کے مختلف مسائل کا مطالعہ کرنے کے لئے ایک انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جائے، اور ایسے ہی انسٹی ٹیوٹ ایشیا کے دوسرے ملکوں میں بھی قائم ہوں۔

محمد مجیب

ترقی پسند ادب کے تین دلکش نمونے

زعفران کے پھول : از خواجہ احمد عباسی - بہت سے افسانہ نگار زندگی کے گرد منڈلا رہے تھے عین اسی وقت عباس خاموشی سے اُٹھا اور ٹھوس حقیقتوں پر ٹوٹ پڑا - کسی نے کہا وہ اخبار نویس ہے، کسی نے کہا ڈھنڈورچی ہے، زندگی نے کہا میرا نباض ہے - "زعفران کے پھول" عباس کی تین طویل کہانیوں کا مجموعہ ہے اس میں اُس کا فن پورے شباب پر ہے اس مجموعہ کی تینوں کہانیاں شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں - قیمت اڑھائی روپئے - ۲/۸

آخر شب : از کیفی اعظمی - کیفی اردو شاعری کا "سرخ پھول" ہے اور "آخر شب" اس کی تازہ ترین نظموں کا مہکتا گلدستہ، کیفی کی انقلابی نظمیں ہندوستان کے کونے کونے میں مشہور ہیں، اس کے ہر ہر شعر میں مزدور اور کسان کا دل دھڑکتا ہے "آخر شب" میں کیفی نے ڈھلتی ہوئی رات کا کرب اور طلوع ہوتی ہوئی صبح کا نشاط بھر دیا ہے - یہ مجموعہ ترقی پسند شاعری کے جلال و جمال کا آئینہ ہے - قیمت تین روپئے - ۳/-

نئی دنیا کو سلام : از سردار علی جعفری - سردار جعفری انسانی عظمت کا شاعر ہے، وہ خوبصورت، شاندار اور بھرپور زندگی کے گیت گاتا ہے - جعفری کی فکر کسی ایک نقطہ پر مرکوز ہو کر نہیں رہ سکتی - اس کا فن کسی دائرے میں مقید نہیں رہ سکتا - اس مرتبہ اس نے ادبی دنیا کے سامنے ایک نیا شعری تجربہ، ایک نیا انقلابی تحفہ پیش کیا ہے - "نئی دنیا کو سلام" طویل تمثیلی نظم ہے - یہ نظم تاریخ کا نیا تصور، زندگی اور سماج کی نئی تفسیر، انسانی عظمت کا نیا اشارہ، آزادی اور انقلاب کی نئی نوید، سیاست اور آرٹ کا حسین امتزاج ہے اس کے ساتھ مشہور مثنوی "جمہور" بھی شامل ہے - قیمت تین روپئے - ۳/-

ملنے کا پتہ : کتب پبلشرز، وڈی ہال لین، کولابا - بمبئی

دی مغل لائن لمیٹڈ

بحر احمر اور مارشس

کی بندرگاہوں کو مسافر اور مال لے جانے والے جہازوں کا بیڑہ

بمبئی سے

عدن - پورٹ سوڈان - جدّہ اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی
اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور اُمید ہے کہ ہم
حسب ضرورت دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے
جہاز بھیج سکیں گے مال اور مسافروں کی
بکنگ کے متعلق تفصیلات کے لئے
لکھئے

ٹرنر مارسین اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶ بنک اسٹریٹ - بمبئی -

طابع و ناشر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) دہلی پرنٹنگ پریس دہلی

ایک اطلاع

جامعہ کے سرپرستوں اور ہمدردوں کو یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ شکر ہے شہر کی صورت

مطبوعات مکتبہ جامعہ دہلی، لکھنؤ اور بمبئی میں ہر وقت مل سکتی ہیں۔ سردست یہ کتابیں موجود ہیں۔

بہتا دریا۔ شالاخوف کی معرکۃ الآرا تصنیف
کا اردو ترجمہ۔ شالاخوف کی اس کتاب میں انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے زمانے کے روس کی
ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ قیمت مکمل دو جلدیں بارہ روپے (عہ)

آپ بیتی۔ چیخوف کی افسانہ نگاری پر ایک مستند کتاب قیمت عہ/

سات کھیل۔ مشہور انشاپرداز راجندر سنگھ کے سات ڈراموں کا مجموعہ " للعہ/

گائے جا ہندوستان۔ دیوندر ستیارتھی کے ان غیرفانی لوک گیتوں کا مجموعہ
انھوں نے ہندوستان گردی کے بعد جمع کی ہیں۔ کتاب میں متعدد تصویریں بھی ہیں " للعہ

پل پر۔ والٹر کے نفسیاتی ناول کا ترجمہ " عہ

سحر ہوتے تک۔ چیخوف کے ایک مشہور ناول کا ترجمہ " عہ/

۱۹۴۱ء کی بہترین نظمیں۔ جدید شعراء کی بہترین نظموں کا انتخاب " عہ/

ہیا ہیا۔ سید مطلبی فریدآبادی کی نظموں کا مجموعہ " عہ

سماج کا ارتقا۔ از کلیم اللہ " للعہ/

شعلۂ طور

جگر مرادآبادی کا وہ دیوان جس کے شائقین مدت سے منتظر تھے۔ خوبصورت پانچ رنگا سنہرا دیدہ زیب ڈسٹ کور۔ قیمت عہ

گئودان

منشی پریم چند کا شاہکار ناول۔ اس غیرفانی تصنیف میں ہندوستان کے کسانوں کی روح، ان کی ذہنیت اور مشکلات کی عکاسی ہے۔ قیمت عہ/

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۰۹۳

Sure

RESULTS

mean

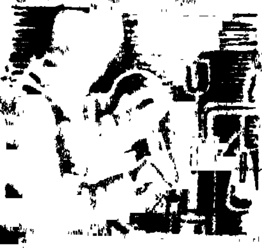
Rapid

RECOVERY

CONSULT YOUR DOCTOR FOR

Cipla

REMEDIES



The scrupulous choice of ingredients, careful processing, strict control and constant research have helped CIPLA to gain EQUAL WORLD STATUS in the production of pharmaceuticals. The uniform good quality of its products have won for CIPLA full confidence of the public and the medical profession.

Cipla REMEDIES OF SUPREME QUALITY

مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

زیر ادارت :- ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے؛ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۴۴، نمبر ۴	بابت ماہ اپریل سنہ ۴۷ء	چندہ سالانہ صہ، فی پرچہ ۸

فہرست مضامین

طابع و ناشر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) دیال پرنٹنگ پریس دہلی

پُرانے صوفی اور نئی تعلیم

آدمی کی طبیعت ہر وقت کسی نہ کسی قسم کا اثر لیتی رہتی ہے لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ایک ہی چیز کا مختلف طبیعتوں پر ایک سا اثر ہو۔ شفق کے رنگ، خوبصورت مناظر، سریلی آواز زندگی کی خوشیاں اور رنج جب انسانی فطرت کو چھیڑتے ہیں اور اس کی کیفیتوں اور اس کے عمل کے ذریعے بیان ہوتے ہیں تو انہیں پہچاننا بہت دشوار ہوتا ہے۔ شاعر، مصور اور ادیب اس پر حیرت کرکے رہ جائیں کہ انسان کی طبیعت کس طرح کھرے کو کھوٹا اور کھوٹے کو کھرا، رنگین کو بے رنگ اور بے رنگ کو رنگین بنا دیتی ہے تو اس میں کچھ حرج نہیں۔ لیکن استاد کو تو روز طبیعت کے من چلے پن سے سابقہ رہتا ہے وہ روز دیکھتا ہے کہ نوجوان اس کی باتوں سے کیا کیا اثر لیتے ہیں، اس کا حیران ہونا اور بے بس ہو جانا اس کے لئے بڑی خامی ہے۔ استاد کے ذہن میں اتنی وسعت ہونا چاہیئے کہ ہر قسم کی طبیعت کی قدر کرسکے اس کا دل اتنا مضبوط ہونا چاہیئے کہ ہر لغزش کو معاف کرسکے، اس کی نظر ایسی ہونا چاہیئے کہ عیب کو دیکھے اور انجان بنی رہے۔ یہ خوبیاں پیدا کر لینا کچھ آسان نہیں ہے اور اچھا استاد وہی ہوگا جو تعلیم کے صحیح طریقے معلوم کرنے اور برتنے کے ساتھ اپنی طبیعت کو جانچنے اور اس کی خامیوں کو دور کرنے کی فکر میں لگا رہے۔ معلمی کے فن کی تکمیل معلم کی سیرت کی تکمیل کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے اور تکمیل کی آرزو اور کوشش ہی استاد کو اچھا اور سچا استاد بنا سکتی ہے۔

آج کل استاد کو معلمی کا فن سکھانے کا انتظام کیا جاتا ہے، مگر نہ تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس فن کو سیکھنے کی خاص استعداد کس میں ہے اور کس میں نہیں ہے، نہ استاد کی سیرت کو کام کے لئے موزوں بنانے کا کوئی اہتمام کیا جاتا ہے۔ استاد اپنا کام شروع کرتا ہے تو اکثر اس کی حالت ان پریشان خاطر لوگوں کی سی ہوتی ہے جو کسی زمانے میں پیر کی تلاش میں نکلتے تھے لیکن ان لوگوں کو کم از کم اس کا اختیار

ہوتا ۔ کہ جہاں چاہیں چلے جائیں اور استاد معلم اور مدرسے کے قاعدوں کا پابند ہوتا ہے ۔ استاد جھکتا ہے تو طبیعت میں تازگی پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا، پریشان اور مایوس ہوتا ہے تو کوئی اسے دلاسا نہیں دیتا ہمت ہار جاتا ہے تو کوئی اسے سہارا نہیں دیتا استاد ایک دوسرے سے ہمدردی کرتے ہیں ، مگر ابھی تک وہ ایک خاص عقیدہ اور خاص مقصد رکھنے والی جماعت نہیں بن سکے ہیں جس میں ایک کی بصیرت دوسرے کی رہنمائی کرتی ہے ، ایک کا ایمان دوسرے کے دل کا نور بن جاتا ہے ، اور سب کی تسلی کے لئے یہ کافی ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے جماعتی مذہب کا حق ادا کر دیا ۔ ایک زمانہ تھا جب ایک خاص طریقے پر چلنے والے لوگ اس قسم کی جماعت بندی کیا کرتے تھے ۔ ایک ہی پیر کے مرید ایک دوسرے کے بھائی بن جاتے تھے ان میں سے وہ جو خالی مرید ہونا کافی نہیں سمجھتے تھے اپنے روحانی رشتے کو اور طریقوں سے مضبوط کرتے ۔ وہ ایک دوسرے کے دوست بن جاتے اور اس دوستی کو وہ محبت فی اللہ کہتے تھے ، جس سے بڑھ کر کوئی اور رشتہ نہیں تھا ۔ سچا دوست وہ سمجھا جاتا جو دوست کو ہر طرح سے عمل میں اور خیال میں اپنے اوپر ترجیح دیتا ۔ یہ صرف ایک اصول نہیں تھا ۔ لوگ اس کے آرزو مند رہتے تھے کہ دوستوں سے ملاقات ہو اور انھیں یہ دکھانے کا موقع ملے کہ دوست کی مدارات کس طرح کی جاتی ہے ۔ اپنے اور غیر کے ، دشمن اور دوست کے ساتھ مناسب برتاؤ کرنا طبیعت میں پختگی پیدا کرنے کا ذریعہ تھا ، جماعتی زندگی کے اصول برتنے سے افراد کی شخصیتیں بنتی تھیں ۔

مرید کے لئے پیر کی شخصیت حسن اور قوت کا نمونہ تھی ، مرید اس کی مثال کو اپنے سامنے رکھتے ، اور اسی کے طریقے کو دیکھ کر عبادت اور دوسرے روحانی شغلوں میں ذوق اور شوق پیدا کرتے ۔ اسی کی ہدایت کے مطابق وہ اپنی زندگی کی تنظیم کرتے اسی سے مہمان نوازی اور صوفیوں کی خاص معاشرت کے آداب سیکھتے ، اسی کی اطاعت کرتے جس کے معنے یہ ہیں کہ جو خدمت ان کے سپرد کی جاتی اسے انجام دیتے جو حکم دیا جاتا اسے بجا لاتے ، جو طریقہ انھیں بتایا جاتا اس پر چلتے ۔ جب کوئی مرید اس قابل ہو تا کہ دوسروں کی رہنمائی کر سکے تو وہ خلیفہ بنا دیا جاتا ۔ اسے مرید کرنے کی اجازت دی جاتی اور عام طور پہ اُسے بتا دیا جاتا کہ کس علاقے یا شہر بستی میں جا کر رہے ۔ وہ یہ سمجھا جاتا کہ وہ بستی یا شہر یا علاقہ اس کی پناہ ۔

میں ہوتا۔ وہ گویا صحیح زندگی کا معلم بن جاتا تھا، اسے سند دے دی جاتی اور یہ بتا دیا جاتا کہ مدرسہ کہاں بنائے
صوفیوں کی جماعت بندی، ان کے طریقے کی جان، عبادت کا شوق تھا۔ آج کل ہم اس شوق
کو غیر ضروری نہ سمجھیں تب بھی اس کی پرورش نہیں کرتے، اور عذر یہ ہے کہ یہ ہم کو حالات سے بے خبر کر دیتا
ہے اور مفید کاموں میں مشغول ہونے سے روکتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ اپنا سارا وقت عبادت میں
صرف کرکے وہ دنیا کے اور کام نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے خیال میں عبادت سے بہتر کوئی کام تھا ہی نہیں
اور اب ہمیں یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا لیکن ہم خود اس بڑے سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکے ہیں کہ
زندگی کا مقصد کیا ہے۔ ہماری زندگی اس کا جواب دئے بغیر بھی کسی نہ کسی طرح بسر ہو جاتی ہے،
لیکن جب ایسے کام کرتے ہوتے ہیں جن سے دوسروں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے مگر خود کام کرنے والا دنیا
کی بہت سی نعمتوں سے محروم رہتا ہے تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ بنیادی مسئلوں کو نظر انداز کرنے سے
بڑی بے چینی پیدا ہوتی ہے آج کل وہ لوگ جو خود غرض نہیں ہیں، اپنے فائدے پر جماعت کے
فائدے کو ترجیح دیتے ہیں، کام کے شوق میں اور باتوں کو بھول جاتے ہیں وہ اکثر اپنے دل کو اس
خیال سے تسلی دیتے ہیں کہ ان کا کام ان کی عبادت ہے لیکن بڑی چیز چھوٹی چیز کے اندر نہیں سما
سکتی، کام کا تعلق سماج کی کسی ضرورت سے یا سماجی زندگی کے دستور سے ہوتا ہے، ضرورت اور دستور
دونوں زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں، اور آدمی سہارے اور تسلی کے لئے ایسے تصورات کا محتاج
ہوتا ہے جن کے بارے میں اسے یقین ہو کہ یہ ضرورت اور زمانہ سے بالاتر ہیں، وجود کی حقیقتیں ہیں جو ہمیشہ
سے تھیں اور ہمیشہ رہیں گی پچھلے زمانے میں اور صوفیوں کے جماعت میں بھی ایسے لوگ تھے جو عبادت
کے رائج طریقوں کو غلط یا بیکار سمجھتے تھے، مگر یہ یا تو اوچھی قابلیت کے آدمی ہوتے تھے جو دماغ کو
نچا کر تماشا دکھاتے تھے، یا اگر وہ سچے صوفی ہوتے تو وہ محسوس کرتے تھے کہ انھیں خدا تک پہنچنے کے
لئے کوئی وسیلہ درکار نہیں ہے۔ آپ ایسے صوفیوں کے حالات پڑھیں یا معلوم کریں تو آپ دیکھیں گے
کہ ان کا کوئی طریقہ نہیں تھا، وہ ایک منزل پر پہنچ گئے تھے جس کا راستہ وہ کسی کو بتا نہیں سکتے تھے
یہ طریقہ صرف ان صوفیوں کا ہوتا تھا جو تعلیم اور عبادت کو وسیلہ بناتے تھے۔ لیکن طریقہ رکھنے اور نہ

رکھنے والے صوفیوں میں اصل خصوصیت مشترک تھی. وہ یہ جانتے تھے کہ وہ خدا کے بندے ہیں، انہا نے انھیں پیدا کیا ہے، انھیں نیک زندگی بسر کرنے کی توفیق دی ہے، اسے ان پر اور ساری مخلوق پر پورا اختیار ہے اور جو کچھ ہوتا ہے اسی کے حکم سے ہوتا ہے۔ اسی کو ہم عبودیت کا تصور کہتے ہیں اور عبادت کا مقصد یہ تھا کہ اس تصور کو آدمی کی شخصیت اور اس کی ظاہری اور باطنی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی کر دے، یہاں تک کہ آدمی اس تصور کا مجسمہ بن جائے۔ آج کل ہم سمجھتے ہیں کہ عبادت کے پرانے طریقے مفید نہیں رہے ہیں لیکن ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ عبادت کا مقصد ان کاموں کے انجام دینے سے حاصل ہو جاتا ہے جنھیں ہم نیک یا مفید مانتے ہیں۔ اس کا فیصلہ تو آپ خود کریں گے کہ عبودیت کا کوئی تصور صحیح اور ضروری ہے یا نہیں۔ اس وقت میں صوفیوں اور ان کے طریقے کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کرتا ہوں، تاکہ زندگی کے ایک دستور کو جو ہماری تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے صحیح سمجھنے اور اس کی قدر کو پہچاننے میں کچھ مدد مل سکے۔

صوفی کی تعلیم دو چیزوں سے شروع ہوتی تھی، ایک توبہ، دوسرے ارادت۔ توبہ کے لئے ضروری نہیں تھا کہ پہلے گناہ کئے جائیں۔ توبہ دنیا کی ادنےٰ چیزوں سے کی جاتی تھی، اس یقین کے ساتھ کہ "جب کسی ادنیٰ چیز کو چھوڑا جاتا ہے تو ایک شریف چیز ضرور ملتی ہے"۔ ارادت کا مطلب یہ تھا کہ شریف اور اعلیٰ چیزوں کو حاصل کرنے کا ارادہ کیا جائے اور اس کے لئے مناسب جد و جہد کی جائے صوفی ہر وقت عبادت میں مشغول رہتا، گویا ادنیٰ سے دور اور اعلیٰ کے قریب رہتا۔ توبہ، ارادت اور عبادت پہلے سبق تھے، جو کوئی پیر کی صحبت میں رہ کر سکھتا، کوئی الگ رہ کر اپنے دنیاوی کام کرتا اور ساتھ ہی عبادت کو بھی جاری رکھتا۔ لیکن آدمی دل سے اپنے آپ کو خدا کا بندہ اسی وقت کہہ سکتا ہے جب وہ اور کسی کا بندہ نہ ہو۔ خدا کی بندگی کا حوصلہ دراصل انتہائی آزادی اور استقلال حاصل کرنے کا منصوبہ ہے آدمی کو بھوک سے تکلیف ہوتی ہے۔ اس بات سے تکلیف ہوتی ہے کہ اس کے پاس اچھے کپڑے نہیں ہیں، دولت نہیں ہے، اس کی حیثیت دوسروں سے کم ہے، اور انھیں سے بچنے کے لئے وہ اپنی آزادی کو بیچ ڈالتا ہے صوفی اس آزادی کی خاطر فاقے کرتے، میلے اور پھٹے کپڑے پہنتے، پلنے

پاس کچھ نہ رکھتے، اور کوئی انھیں کچھ دیتا تو اسے جلد سے جلد صرف کر ڈالتے وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ فاقہ کرنے اور ناداری کی اور مصیبتیں جھیلنے میں بذاتِ خود کوئی فائدہ یا ثواب ہے۔ دنیا کو ترک کرنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ننگا رکھے اور لنگوٹا باندھ کر بیٹھ جائے بلکہ ترکِ دنیا اس بات کا نام ہے کہ آدمی لباس بھی پہنے اور کھائے بھی مگر جو کچھ اسے ملے اس کی طرف راغب نہ ہو اور اس سے دل نہ لگائے وہ صرف نفس اور ضرورت کی غلامی سے آزاد ہونا چاہتے تھے، انھیں اپنے آپ سے اور دنیا سے عداوت نہ تھی۔

وہ صوفی جو فاقہ اور غریبی کے بعید معلوم کرنے کا ارادہ کرتے اگر الگ رہ کر صرف اپنی ذات پر تجربہ کرتے تو ان کی مثال اتنی مفید نہ ہوتی۔ ان کی مشق ایک جماعتی منصوبہ ہوا کرتی تھی، کھانے کو ملتا تو سب کھاتے، نہ ملتا تو ایک دوسرے کو صبر اور شکر کرنے میں مدد دیتے۔ شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ انتہائی تنگی میں گذارا، بہت سے لوگ ان کے مرید ہوئے اور بعض برسوں تک ان کے ساتھ رہے۔ یہ سب ان کے ساتھ ہر طرح سے شریک تھے اور جماعت کے کام ان میں تقسیم کر دئے گئے تھے۔ کوئی جنگل سے لکڑیاں جمع کرکے لاتا۔ کوئی کھانا پکاتا، اگر پکانے کو کچھ ہوتا۔ کوئی جنگلی پھل جمع کرکے لاتا، کوئی کپڑے دھوتا۔ ناداری کی اس حالت میں مہمان نوازی بھی کی جاتی تھی، اور مہمان آجاتے تو اکثر یہ ہوتا تھا کہ کھانے کو جو کچھ ہوتا وہ انھیں کے سامنے رکھ دیا جاتا۔ پیر کی شہرت ہو جاتی تو لوگ اسے نذرانہ اور تحفے اور اس کے مریدوں کو کھلانے کے لئے نقد اور جنس پیش کیا کرتے تھے۔ ایسی پیشکش کو فتوح یا غیبی امداد کہا کرتے تھے، اس کی وجہ سے پیر کا طریقہ نہیں بدل جاتا تھا، جو کچھ ملتا وہ جلد سے جلد صرف ہیں آجاتا اور پھر وہی صبر اور شکر کی مشق شروع ہو جاتی۔ ہم ادنیٰ مریدوں کی طبیعت سے سچے صوفیوں کی شخصیت کا اندازہ کریں تو بڑی سخت غلطی ہوگی، جیسے کسی بچے کے علم سے استاد کے علم کا اندازہ کرنے میں ہوگی۔ بے شک سب مرید ایک سے نہیں ہوتے تھے ایسا بھی ہوتا تھا کہ مرید شکایتیں کرتے، روتے، پیر کے پاس جاکر کہتے کہ آج کھانے کو کچھ نہیں، بتائیے کیا کریں۔ یہ وہ لوگ تھے جن میں آزاد ہونے کی استعداد نہ تھی سچے صوفی کے دل میں ہر تکلیف سے

کی ایک نئی کیفیت پیدا کرتی تھی" سلطان المشائخ (شیخ نظام الدین اولیا) یہ بھی فرماتے تھے کہ میری والدہ محترمہ کا میرے ساتھ ہمیشہ یہ برتاؤ رہا تھا کہ جب ہمارے گھر میں غلہ نہ ہوتا تو آپ مجھ سے فرماتیں کہ آج ہم خدا کے مہمان ہیں آپ کے اس فرمانے کا میرے دل پر وہ عجیب و غریب اثر پڑتا کہ سارا دن ذوق و شوق میں گذار دیتا تھا۔ اتفاق سے ایک شخص غلہ کا ایک کافی بوجھ ہمارے گھر میں لاتا اور ہم متواتر چند روز تک اس کی روٹی کھاتے، یہاں تک کہ میں تنگ ہوجاتا کہ کس دن غلہ نبڑے گا اور کس دن والدۂ محترمہ فرمائیں گی کہ ہم خدا کے مہمان ہیں چنانچہ جب غلہ خرچ ہوجاتا تو والدۂ محترمہ مجھ سے فرماتیں کہ آج ہم خدا کے مہمان ہیں۔ اس سے وہ ذوق اور راحت مجھ میں پیدا ہوتی کہ جسے میں کسی طرح بیان نہیں کرسکتا" صبر کرنا نسبتاً آسان ہوجاتا ہے اگر آدمی کسی چیز کو اس طرح چھوڑ دے کہ گویا وہ اس پر حرام ہوگئی۔ صوفی اپنے ساتھ اس قسم کی رعایت بھی نہیں کرتے تھے۔ سلطان المشائخ فرماتے تھے کہ "غیاثی عہد میں اگرچہ دو آنے کے من بھر خربوزے بکتے تھے لیکن بیشتر فصل گذر گئی تھی۔ اور میں نے خربوزہ چکھا تک نہ تھا۔ میں اس پر خوش تھا۔ میری دلی آرزو تھی کہ اگر باقی فصل بھی خربوزہ نہ کھایا جائے تو بہت اچھا ہے۔ آخر موسم میں ایک شخص کئی خربوزے اور چند روٹیاں میرے پاس لایا چونکہ غیبی سامان تھا اس لئے میں نے اسے قبول کرلیا۔ خربوزوں کی فصل کا یہ پہلا ہی دن تھا جس میں میں نے خربوزہ کھایا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ ایک اور دن کا ذکر ہے کہ ایک رات دن گذر چکا تھا اور دوسری رات نصف کے قریب آگئی تھی کہ مجھے کوئی چیز کھانے کے لئے دستیاب نہیں ہوئی تھی حالانکہ اس زمانہ میں ایک آنہ کی دو سیر میدہ کی روٹیاں بکتی تھیں لیکن میرے پاس ایک دانگ بھی نہ تھا کہ میں روٹیاں بازار سے خریدتا، اور میری والدہ محترمہ اور ہمشیرہ عزیزہ اور گھر کے دوسرے آدمی جو میری کفالت میں تھے سب کا یہی حال تھا۔ ایسی صورت میں اگر کوئی شخص مصری یا شکر یا قیمتی جامہ ہدیۃً پیش کرتا اگرچہ اسے فروخت کرکے میں اپنی غرض پوری کرسکتا تھا لیکن میں نے کبھی ایسا نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اسی فاقہ کشی کی حالت میں رہنا مناسب و بہتر سمجھتا، اور جو کچھ غیب سے پہنچتا اسے کافی جانتا" اس سے ہم کو یہ سبق لینا چاہئے کہ شخصیت کے لئے نہ محرومی مفید ہے نہ افراط۔ اور نہ

یہ کہ اسے جو کچھ ملے اندازے سے ملے۔ شخصیت کو فروغ آزادی سے ہوتا ہے، اور وہ آزادی اسی طرح ہوتی ہے کہ اپنے نفس پر اور اپنی ضرورت پر غالب ہو۔ یہ غلبہ اسے حاصل نہیں کیا جا سکتا جیسے کسی امتحان میں کامیاب ہونے پر سند مل جاتی ہے، اس کے لئے ایک خاص طریقے پر مسلسل عمل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ صوفی کا گھر اور اس کا جماعت خانہ شخصیت کو خوبصورت اور مضبوط، غالب اور مطلق بنانے کے کارخانے تھے جن کا کام کبھی بند نہ ہوتا تھا۔ صوفی کی ہر وقت طرح طرح سے آزمائش ہوتی رہتی تھی، وہ چاہتا تھا کہ اس کی آزمائش ہوتی رہے، تاکہ آزادی کے احساس کو تقویت پہنچتی رہے اور بندگی کا یقین تازہ ہوتا رہے۔

صوفی کے گھر یا اس کے جماعت خانہ میں جو رہتا وہ گویا ایک مدرسے میں رہتا تھا جہاں علم حاصل کرنے کے علاوہ اسے خاص اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی مشق کرائی جاتی تھی۔ اس کے نظام عمل میں مرکزی حیثیت عبادت کو حاصل تھی۔ عبادت میں کمی بیشی کی بہت گنجائش تھی، جسے جیسی توفیق ہوتی اتنا کرتا، اور جماعتی کام بھی انھیں مریدوں کے سپرد کئے جاتے جو انھیں انجام دینے کی خواہش کرتے۔ ہمارے مدرسے ایک مدت کے اندر اپنا نصاب پورا کرا دیتے تھے، ناکامیاب طالب علم اس بات سے فائدہ اٹھا کر کہ امتحان دینے کا موقع دوسری اور تیسری دفعہ بھی ملتا ہے مدرسے کو اپنی مستقل قیام گاہ نہیں بنا سکتے۔ صوفی ناقص لوگوں کو جماعت سے نکال نہیں دیتے تھے۔ یہ اچھے مریدوں کی اخلاقی تربیت کا ایک کارآمد ذریعہ تھا کہ ان کے ساتھ بہت سے نالائق بھی ہوتے تھے، نالائق لوگ اچھے ساتھیوں کی مروت اور شرافت کی وجہ سے خود کچھ بہتر نہ ہو پاتے ہوں گے۔

جب کوئی شخص مرید ہوتا تو اسے عبادات کے علاوہ ایک خاص طریقے کو برتنے کی بھی تاکید کی جاتی تھی۔ بعض معاملات کا صحت اور صفائی سے تعلق تھا، جیسے کہ صبح سے پہلے اٹھنا، کبھی پیٹ بھر کر نہ کھانا، مسواک اور کنگھی کرنا۔ بعض قاعدے معاشرتی آداب کو ذہن نشین کرنے کی خاطر بتائے جاتے، بعض اخلاقی اصول تھے جن کا لحاظ رکھنا بہت ضروری تھا۔ طریقے سے متعلق تمام باتیں، خاص طور سے اخلاقی اصول مرتب کر لینا اور پھر ان کی پابندی کرنا ظاہر میں تو مناسب معلوم ہوتا ہے مگر تعلیم زیادہ

موثر اور مفید اس وقت ہوتی ہے جب وہ کسی شخص یا موقع کے حسب حال ہو صوفی جانتے تھے کہ اخلاقی تعلیم کا اصل مقصد شخصیت کی تعمیر ہے اور وہ انھیں اصولوں کو زیادہ ممتاز کرتے تھے جو انسان کو انسانیت کا خادم بناتے ہیں اور اس طرح اس میں سچی شرافت اور بزرگی کے اوصاف پیدا کرتے ہیں۔ حضرت سلطان المشائخ فرماتے تھے کہ "ایک دفعہ شیخ محمد اجلّ شیرازی کی خدمت میں ایک شخص آکر مرید ہوا اور اس بات کا منتظر ہوا کہ خواجہ کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ انجام کار شیخ نے فرمایا کہ عزیزمن جو چیز اپنے لئے درست نہیں رکھتا ہو اسے دوسرے کے لئے بھی درست نہ رکھو اور جس بات کی اپنے لئے خواہش کرتا ہے اس کی دوسرے کے لئے بھی خواہش کر۔ یہ سن کر مرید چلا گیا، اور چند روز بعد پھر خدمت شیخ میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ جس روز میں بیعت کے شرف سے مشرف ہوا تھا تو اس بات کا منتظر تھا کہ خواجہ مجھے کسی ورد و وظیفہ کا حکم فرمائیں گے، لیکن حضور نے کچھ ارشاد نہیں فرمایا۔ خواجہ نے فرمایا کہ اس دن میں نے تجھے کس چیز کی مشق کرنے کا حکم دیا تھا۔ مرید ہکا بکا ہو گیا اور اس نے کوئی جواب نہیں دیا اس پر خواجہ نے تبسم کرکے فرمایا کہ اس دن میں نے تجھے اس بات کا حکم دیا تھا کہ جو چیز اپنے لئے پسند نہیں کرتا ہے وہ دوسرے کے لئے پسند نہ کر اور جس بات کی اپنے لئے خواہش کرتا ہے اس کی دوسرے کے لئے بھی خواہش کر۔ جب تو نے پہلے ہی بسم اللہ غلط کی اور اول تختی درست نہ کی تو دوسرا سبق تجھے کیونکر دوں۔" خواجہ اجلّ شیرازی نے جو حکم دیا تھا وہ اسلامی اخلاق کا ایک پرانا اور ایسا بسیط اصول ہے کہ جس قدر خلوص سے برتا جائے اتنے ہی اس میں نئے نکتے پیدا ہوتے رہیں گے سلطان المشائخ یہ بھی فرماتے تھے کہ ایک شخص کسی پیر کی خدمت میں حاضر ہو کر مرید ہوا شیخ نے اسے حکم دیا کہ دو کام نہ کرنا، ایک دعویٰ خدائی کا، دوسرے دعویٰ پیغمبری کا۔ شیخ کی یہ گفتگو سن کر مرید حیران ہو گیا کہ یہ کیا فرماتے ہیں جب کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آئی تو شیخ سے اس (حکم) کی تفسیر طلب کی۔ فرمایا دعویٰ خدائی کا یہ مطلب ہے کہ سارے کام اپنی مراد کے مطابق طلب کرے اور دعویٰ پیغمبری کے یہ معنی ہیں کہ تو یوں چاہے کہ ساری مخلوق تیری خواہاں ہو اور تجھے دل سے دوست رکھے۔" شیخ نے یہ حکم یا تو اس شخص کی طبیعت کا اندازہ کرکے دیا ہوگا جو مرید ہونے کو آیا تھا۔ یا حاضرین میں سے کسی کو نصیحت کرنا مقصود ہوگا لیکن یہ بات ہر اس شخص سے کہی جا سکتی ہے جو دنیا میں کچھ کرنے کو نکلے اور استاد کو تو اسے ہر وقت ذہن میں رکھنا چاہیئے،

کہ خدا کی مشیت اور پیغمبر کے مقصد کو پورا کرنا اس کا فرض منصبی ہوتا ہے، مگر وہ خود کوئی اختیار نہیں رکھتا، اور لوگوں کو عام طور پر اس کی اور اس کے کام کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ اگر کامیاب اور مطمئن ہو سکتا ہے تو دیہاتی استاد جو کام کو سلیقے اور تن دہی سے کرتا رہے اور یہ سمجھ کر کبھی مایوس نہ ہو کہ اس کی بہت کم مرادیں پوری ہوں گی اور لوگ اس کی اور اس کے کام کی قدر نہ کریں گے

صوفی اکثر ایسی نصیحتیں کیا کرتے تھے کہ اگر مرید ان پر عمل کرنا چاہتا تو وہ ایک عرصے تک اس کی رہنمائی کرتی رہتیں، اور مرید کو محسوس ہوتا کہ حقیقت کا پورا انکشاف حقیقت کو بیان کر دینے سے نہیں ہوتا۔ بلکہ حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت کو بڑھانے سے، دل میں گہرائی اور نظر میں وسعت پیدا کرنے سے، خود اس حقیقت کا نمونہ بن جانے سے۔ صوفی کو طریقے کی پوری خصوصیت کو واضح کرنا ہوتا تو مطلب کسی قدر تفصیل سے بھی بیان کیا جاتا۔ شیخ نظام الدینؒ نے ایک روایت کا تمہید کے طور پر ذکر کر کے ایک موقع پر پانچ عادتوں کو مرید کے لئے ضروری قرار دیا ہے، ایک یہ کہ اپنے گھر کا دروازہ کھلا رکھے اور کسی شخص کو آنے جانے سے نہ روکے۔ دوسرے یہ کہ ہر شخص سے خواہ وہ کسی مرتبہ کا ہو خندہ پیشانی سے ملے اور مہربانی سے پیش آئے۔ تیسرے یہ کہ جو کچھ میسر ہو، تھوڑا یا بہت، کسی سے دریغ نہ کرے۔ چوتھے یہ کہ اپنا بار کسی شخص پر نہ ڈالے، اور پانچویں یہ کہ لوگوں کا بار خود اٹھائے اور کبھی ملول اور رنجیدہ نہ ہو۔ یہ پانچوں عادتیں اخلاق میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ آدمی کو دوسرے آدمیوں سے الگ، اس کی نظر کو تنگ اور اس کے دل کو چھوٹا سب سے زیادہ یہ خواہش کرتی ہے کہ اس کے پاس جو کچھ ہو اس کا اپنا ہو، اور اشتراکیت کے مبلغ جو کہتے رہے ہیں کہ سماجی فساد کا اصل سبب ملکیت کی خواہش اور ملکیت کا حق ہے وہ بالکل صحیح ہے لیکن ملکیت کئی قسم کی ہوتی ہے۔ بہت سے لوگ مال اور دولت چھوڑنے پر راضی ہو جاتے ہیں اگر انھیں اس کے بدلے عزت اور حکومت ملے اور ان کی تعظیم کرنا دستور بن جائے۔ صوفی ایسے انکسار کی تلقین کرتے تھے جو انسان کی اس خواہش کو مٹا دے کہ دوسرے اس کا لحاظ کریں، اور یہ بہت ہی برا سمجھا جاتا ہے کہ صوفی سے کوئی ملنے آئے اور مل نہ سکے، یا اس کی خاطر تواضع نہ کی جائے یا کسی سے ملاقات کی جائے مگر اپنی تکلیف کا

خیال غالب ہے اور طبیعت دوسروں کے رنج یا راحت کے حال کو سننے کی طرف مائل نہ ہو۔ صوفی کے لئے بڑی بے آبروئی کی بات تھی۔ اگر اس کی تکلیف کسی پر ظاہر ہو جاتی، یا اس کے قول یا عمل سے دوسرے کو معلوم ہو جاتا کہ وہ کسی روحانی مرتبہ یا عظمت کا دعوے دار ہے۔ ادنےٰ او اعلیٰ طبیعتوں میں تمیز اسی طرح کی جاتی تھی کہ ادنےٰ طبیعت رکھنے والے دوسروں پر اپنا سارا حال ظاہر کر دیتے ہیں اور اعلیٰ طبیعت رکھنے والے اپنی حالت کو چھپاتے ہیں۔ اپنا حال ظاہر کرنا گویا دوسرے پر اپنا بوجھ ڈالنا۔ اس سے مدد یا ہمدردی یا تعظیم کا مطالبہ کرنا تھا، اور صوفی کا منصب یہ تھا کہ دوسروں کا بوجھ اٹھائے۔ اس کی کئی شکلیں تھیں۔ ایک پردہ پوشی تھی۔ خواجہ صاحب نے آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ "درویش کو پردہ پوش ہونا چاہیئے، کیونکہ پردہ پوشی سب عبادتوں سے افضل ہے خواہ کوئی اپنی آنکھوں سے کسی کا عیب دیکھے پھر بھی اسے چھپانا چاہیئے، کیونکہ یہ اللہ تعالےٰ کی خلقت ہے۔" ایک اور موقع پر شیخ نظام الدین نے زبان مبارک سے فرمایا کہ "ایک شیخ نہایت بزرگ تھا۔ ایک شخص آکر اس کا مرید ہوا اور خرقہ پایا کچھ مدت بعد شیخ کو معلوم ہوا کہ مرید نے برے کام اختیار کئے ہیں تو شیخ اس کے گھر گیا اور کہا کہ میرے گھر آ کر رہ، تو مجھے کیوں مشہور کرتا ہے آ، میں تیری پردہ پوشی کروں گا۔" اپنی اور غیروں کی پردہ پوشی کرنے کے علاوہ کبھی کبھی صوفیوں کو مخالفوں کی زیادتیاں بھی سہنا پڑتی تھیں۔ ایسی حالت میں ان کا عمل وہ ہوتا تھا جو آج کل مسلمانوں کی شان اور اسلام کی تعلیم کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ حاضرین میں سے ایک نے عرض کی کہ بعض آدمیوں نے جناب کو ہر موقع پر برا کہا وہ آپ کی شان میں ایسی باتیں کہتے ہیں جن کے سننے کی ہم تاب نہیں لا سکتے۔ خواجہ صاحب نے کہا کہ میں نے سب کو معاف کیا۔ تم بھی معاف کر دو۔ اور کسی سے دشمنی نہ کرو۔" بعد ازاں تحمل اور بردباری کے بارے میں بہت غلو فرمایا کہ ہر ایک کا ظلم سہنا چاہیئے اور اس کا بدلا لینے کی نیت بھی نہ کرنا چاہیئے۔ یہ مصرعہ زبان مبارک سے فرمایا "ہر کہ ما را رنجہ دارد راحتش بسیار باد۔" (جو ہم کو تکلیف پہنچائے خدا کرے اس کو بہت راحت ملے) بعد ازاں یہ شعر پڑھا۔ ہر کہ ما را یار نبود ایزد او را یار باد۔ ہر کہ ما را رنجہ دارد راحتش بسیار باد

(جو شخص دشمنی کی وجہ سے ہمارے راستے میں کانٹے ڈالے خدا کرے اس کی زندگی کے باغ میں جو پھول کھلے
اس میں کانٹا نہ ہو) شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے پاس ایک درویش آیا۔ کسی کے ظلم کا شاکی تھا حضرت
خواجہ نے فرمایا درویش تحمل کر۔ اگر اور لوگ جفا کیا کریں، تم درویش ہو۔ معاف کر دیا کرو؛ صوفی کا اصل
کام، جس میں وہ اکثر عبادت سے زیادہ وقت صرف کرتا تھا، تالیف قلوب تھا، تالیف کے کئی معنے میں
یکجا کرنا، باہم الفت دینا، ربط پیدا کرنا، اور جو شخص دلوں کی تالیف کو اپنا مشغلہ بنا تا وہ ایک طرف افراد
کی ذاتی مشکلوں میں شریک ہوتا۔ انھیں تسلی اور تسکین دیتا۔ دوسری طرف افراد کی باہمی مخالفتوں اور رنجشوں
کو دور کرنے اور جماعت کے اخلاقی ربط کو قائم رکھنے میں مصروف رہتا۔ آجکل ہم نے سیاسی اور سماجی کاموں
کی جو تقسیم کی ہے اس میں تالیف قلوب کے لئے کہیں جگہ نہیں۔ اب صرف کام دیکھا جاتا ہے کام کرنے
والے کی کوئی قدر نہیں سماج کی نظر صرف ان لوگوں پر پڑتی ہے جنھیں فراغت اور اطمینان ہے
اور پریشانیاں بیان بھی کی جاتی ہیں تو کسی سیاسی مقصد سے۔ ہمدردی اور محبت کی وجہ سے نہیں۔
دنیا میں پہلے بھی دستور یہی تھا، صرف صوفی ایسے لوگ تھے جنھوں نے اور سب کچھ چھوڑ کر خدا
کی بندگی اور انسانی ہمدردی کی لوازمات کو پورا کرنا اپنے ذمے لے لیا تھا۔ آجکل صوفی نہیں ہیں
ہمدردی اور محبت کا حق ادا کرنے کی ہمت اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ اگر ہو سکتی ہے تو اچھے استاد کو۔
نئی تعلیم کے جو طریقے تجویز کئے گئے ہیں ان کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ نوجوان کے ذہن اور
طبیعت کی پوری نشو و نما ہو۔ اور اس طرح اس کی شخصیت فروغ پائے۔ مدرسے کی فضا بھی ایسی ہو گی
کہ شخصیت کو نمایاں کرے لیکن مدرسہ جو کچھ کر سکتا ہے وہ تمہید ہے اصل کام کی، جو نوجوان اچھا شہری
اور سچا انسان بن کر انجام دے گا۔ ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ تعلیم کا طریقہ بہتر یا بہت اچھا ہو گیا تو ہمارے
ملک میں بہتر انسان پیدا ہونے لگیں گے۔ اخلاقی تربیت نصابی تعلیم سے ایک الگ چیز ہے اور یہ
اسی وقت ممکن ہو گی جب استاد کی نظر میں مروت اور شرافت کے اچھے نمونے ہوں، جب استاد اپنی
شخصیت کو آزاد اور مطمئن کرنے کی فکر میں ہو اور مدرسے کی زندگی شخصیت کو خوبصورت اور آزاد
بنانے کا ایک ذریعہ ہو جائے آج کل ہمارے سماجی جسم میں بہت سے روگ ہیں وہ بیمار زخمی بھی ہوتا

رہتا ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب تالیف قلوب کی مشق کہیں نہ کہیں ضرور شروع ہو جانا چاہئے بنیادی تعلیم کے اصل مقاصد اسی وقت پورے ہوں گے جب استاد تعلیم کے ساتھ تالیف قلب کا سلسلہ بھی شروع کریں، صرف مدرسہ کا نہیں بلکہ پوری سماج کا بوجھ اپنے کندھوں پر لیں اور یہ سمجھیں کہ انہیں صرف پڑھانا نہیں بلکہ سماج میں نئی جان ڈالنا ہے۔

آخر میں صوفیوں کے متعلق ایک بات پھر بیان کر دینا چاہتا ہوں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے اور آجکل کے استادوں کے کام میں کتنی مشابہت ہے۔ صوفیوں کے مختلف سلسلے تھے، اور یہ اپنی تنظیم بھی کرتے تھے۔ سلسلہ کا سب سے ممتاز بزرگ جہاں کہیں بھی ہوتا وہ اس کا مرکز بن جاتا تھا، اور جو مرید اس قابل ہوتے کہ تعلیم اور ہدایت کا کام ان کے سپرد کیا جائے ان کو خلافت کی سند ملتی اور وہ کسی مقام پر بھیجے جاتے تھے، کہ وہاں جاکر تعلیم اور ہدایت کا سلسلہ جاری کریں۔ گویا جیسے جیسے استاد تیار ہوتے گئے، دین داری، اخلاق اور شرافت کے مدرسے کھلتے گئے۔ ان مدرسوں کو قائم کرنا کچھ آسان نہ تھا بعض صوفی تنہا رہ کر عبادت میں مشغول ہونا چاہتے تھے بعض کو نئے اور دور افتادہ مقاموں سے وحشت ہوتی تھی۔ مگر پیر کے حکم کی خلاف ورزی کوئی نہ کرتا، جو جہاں بھیجا جاتا، وہیں اپنے قدم جمالیتا اور چودھویں صدی کے آخر تک ایسی بہت کم بستیاں تھیں جو کسی صوفی کی پناہ میں نہیں تھیں۔ آج کل ہم تعلیم کا کام اسی طرح سے پھیلانا چاہتے ہیں اور استاد دوسرے طریقوں سے اپنے آپ کو کام کے لئے تیار کرتے ہیں تو انہیں پرانے صوفیوں کی مثالوں کو بھی نظر میں رکھنا چاہئے۔

محمد مجیب

ایک سبق آموز تعلیمی تجربہ

جوں جوں تعلیم عام ہوتی جا رہی ہے یہ خیال زیادہ نمایاں ہوتا جا رہا ہے کہ تعلیمی نصاب کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ طالب علم کچھ ایسے کام کریں جن کے ذریعے وہ اپنی پڑھائی کا خرچ خود نکال لیں۔ اس کے علاوہ یہ زمانہ مشین کا زمانہ ہے اور اس مشینی زمانے کا یہ تقاضا ہے کہ ہماری تعلیم قوم کے ہر فرد کو یہ سکھائے کہ وہ خود اپنا کفیل ہو، اپنے متعلقین کا بار خود برداشت کرے، وہ جو کچھ کرے سمجھ کر کرے اور اس میں پوری دلچسپی لے۔ اسے یہ سمجھنا چاہیئے کہ اس کے کام پر صرف اسی کی بہبودی کا انحصار نہیں بلکہ پوری جماعت کی بہبودی اس پر منحصر ہے۔ مختصر یہ کہ اس کا علم زندگی کی حقیقتوں سے جتنا زیادہ قریب ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ اس مشینی دنیا میں ترقی کر سکے گا۔

اسی خیال کے ماتحت ہمارے ملک میں بنیادی قومی تعلیم کی تحریک نے جنم لیا۔ اس کے بانیوں کے سامنے معلوم ہوتا ہے کہ دو خیال خاص طور پر تھے۔ ایک تو یہ کہ تعلیم میں اس نفسیاتی اصول کا خیال رہے کہ بچوں کی تربیت ان ذرائع سے ہو جنھیں ان کی طبیعت سے خاص مناسبت ہوتی ہے یعنی ۱۴ سال تک لڑکے لڑکیوں کو ہاتھ کے کام کے ذریعے ذہنی نشوونما کا موقع دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ قومی تعلیم کے لئے جو مدارس قائم ہوں انھیں اپنا کام کرنے کے لئے جن مادی وسائل کی ضرورت پڑتی ہے اُن کے واسطے اہلِ ثروت کا دروازہ کھٹکھٹانے اور حکومت وقت کی امداد حاصل کرنے کی کم سے کم ضرورت پیش آئے اس لئے کہ بیرونی امداد جتنی زیادہ حاصل کی جائے گی اتنا ہی تعلیمی کام کو اپنے سرپرستوں کی خواہش کے مطابق لانا پڑے گا بلکہ تعلیم کو حتی الوسع خود کفیل بنایا جائے۔ چنانچہ بنیادی قومی تعلیم نے اپنے نصاب میں اس بات پر زیادہ زور دیا ہے کہ مدارس میں دستکاری کو زیادہ رواج دیا جائے اور تعلیم کو ہاتھ کے کام کے ساتھ اس طرح مربوط کیا جائے کہ اس کی تعلیمی قدر کا کام یعنی طالب علم کی سیرت کی تربیت اور دماغ کی

بہتر نشوونما اور تشکیل کا کام بھی انجام پائے اور طالب علم جو کچھ سیکھیں اس کی بنیاد ان کا اپنا تجربہ ہو اور ہاتھ اور دماغ کے میل سے طالب علم کی زندگی اور اس کی تعلیم میں وہ حقیقی رشتہ باقی رہے جو اس کی تخلیقی قوتوں کو معنویت بخشتا ہے۔

بنیادی قومی تعلیم کی یہ تحریک اس وقت صرف ابتدائی مدارس تک محدود ہے۔ لیکن ہمارے اعلیٰ تعلیم کے مدارس کے لئے، جن میں ایک طرف عمل اور تعلیم کا رشتہ یکسر مفقود ہوتا ہے اور جہاں تمام تعلیمی قدریں لفظوں اور کتابوں تک محدود ہو کر رہ جاتی ہیں اور دوسری طرف اخراجات اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ قومی آمدنی پر بار معلوم ہوتے ہیں۔ ابھی تک اس قسم کی کوئی تجویز پیش نہیں کی گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ "خود کفالتی" تعلیم کی ضرورت بہ نسبت ابتدائی مدارس کے ہمارے اعلیٰ تعلیم کے مدارس کے لئے زیادہ ضروری ہے۔ اس لئے کہ ہمارے نوجوان جو قومی دولت آفرینی کے کاموں میں معاون بن کر اپنی معاشی حالت کو زیادہ سدھار سکتے ہیں، عرصے تک قومی اور انفرادی آمدنی پر بار بنے رہتے ہیں پھر یہ کہ ایک بہت بڑا طبقہ ہمارے نوجوانوں کا ایسا ہوتا ہے جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ یہ لوگ مفید معاشی مشاغل میں مصروف تو ہو جاتے ہیں مگر بے دلی سے، کیونکہ ان میں سے بیشتر اس بات کے خواہش مند ہوتے ہیں کہ وہ کسی طرح اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا کام نہ تو قومی دولت میں کوئی خاص اضافہ کرتا ہے اور نہ وہ ہمارے سماج کے مفید رکن بنتے ہیں۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ جو نوجوان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ انہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا جائے، وہ یونیورسٹی کے اخراجات کا بار برداشت نہ کرسکنے کی وجہ سے اپنی خداداد قابلیت کے فائدے سے خود بھی محروم رہتے ہیں اور اپنی قوم کو بھی محروم رکھتے ہیں۔

حصولِ تعلیم کے راستے کی یہ دشواریاں کم و بیش تمام ملکوں میں موجود ہیں اور ان پر قابو پانے کی راہیں بھی ہر جگہ سوچی جا رہی ہیں۔ ان میں سے ایک کامیاب کوشش ریاستہائے متحدہ میں میڈیسن کالج کی ہے۔ ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر سدرلینڈ جو میڈیسن کالج کے بانی ہیں، اور ان کے چار ساتھیوں نے مل کر ایک درس گاہ قائم کی اور اس کا بنیادی اصول یہ قرار دیا کہ اس درس گاہ میں وہ طالب علم داخل ہو سکتے

ہیں جو اپنی تعلیم اور اپنے کھانے پینے اور اپنی دوسری ضروریات کے تمام اخراجات کو پورا کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی کام کریں۔

درسگاہ کے اخراجات چلانے کے لئے ڈاکٹر سدرلینڈ نے کالج کے ساتھ سب سے پہلا ایک سینی ٹوریم قائم کیا۔ لیکن سینی ٹوریم بغیر ڈاکٹر کے نہیں چل سکتا تھا اس لئے انھوں نے خود ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی اور ۴ سال کا کورس پورا کر کے ایم۔ ڈی کی ڈگری حاصل کر لی۔

سینی ٹوریم کالج کا سب سے اہم شعبہ ہے۔ اس وقت اس میں مریضوں کو رکھنے کے لئے ۱۰۰ کمرے ہیں اور ان میں سے ہر کمرہ مریضوں اور اُن کے علاج کے جدید ترین سامان سے درست ہیں۔ اس میں جو مریض داخل ہوتے ہیں انھیں اپنے علاج کے لئے ۲۵ ڈالر سے ۳۵ ڈالر تک ہفتہ وار ادا کرنے پڑتے ہیں، لیکن اگر کوئی ایسا مریض آجائے جو اپنے علاج کا خرچ نہ برداشت کر سکتا ہو تو اس کو بھی داخل کر لیا جاتا ہے۔ اس سینی ٹوریم کا تمام کام طالب علم انجام دیتے ہیں اور اس طرح وہ عملی کام کے ذریعے اپنی تعلیم کی تکمیل کرتے ہیں۔

ہر سال اس سینی ٹوریم کے ۲۵، ۳۰ طالب علم جو نرسنگ کا صداقت نامہ حاصل کرتے ہیں ملک کے بہترین اسپتالوں میں رکھ لیے جاتے ہیں۔ غرض جنوبی امریکہ میں سینی ٹوریم اور اس کے کامیاب طلبا بڑی وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

سینی ٹوریم کی طرح اس درسگاہ کے فارم بھی معاشی اعتبار سے کالج کے لئے بہت اہم ہیں۔ ۱۶۰ ایکڑ زمین میں ان کے باغات ہیں۔ ۷۰ ایکڑ زمین پھل دار درختوں کے لئے مخصوص ہے۔ دو پھلواریاں ہیں جن کے پھول شفا خانے کے کمروں کی زینت بنتے ہیں۔ طالب علموں اور مریضوں کے کھانے کے لئے اتنی ترکاریاں محفوظ کر لی جاتی ہیں کہ سال بھر کو کفایت کرتی ہیں۔

۱۵ سال کی تحقیق کے بعد انھوں نے کھانے پینے کی چیزوں میں بھی نئے اضافے کئے ہیں مثلاً سویابین سے انھوں نے ایسی غذا تیار کی ہے جو امریکہ میں بہت مقبول ہے۔ درس گاہ کے کیمیا دانوں نے سویابین کی دو سو قسموں پر تجربہ کیا ہے اور اس کے نامرغوب حصے کو خارج کر کے

اس سے ناشتے کی بہت سی چیزیں تیار کی ہیں، روٹی، جما ہوا دودھ اور ایسی چیزیں تیار کی ہیں جو کانی اور گوشت کی قائم مقامی کرتی ہیں۔ گوشت کا بدل فی الحقیقت شکل کے اعتبار سے بالکل گوشت معلوم ہوتا ہے لیکن گوشت سے زیادہ زود ہضم ہوتا ہے اور غذائیت بھی اس میں زیادہ ہوتی ہے۔ اسی طرح میڈلین کے اس غذائی محکمے نے سویابین سے جو دودھ تیار کیا ہے وہ گائے کے دودھ سے نہ صرف سستا ہوتا ہے بلکہ امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن کے بیان کے مطابق دودھ پیتے بچوں کے لئے زیادہ مفید ہے۔ میڈلین کی اس صنعت کو لوگ افریقہ اور ہندوستان سے دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ گذشتہ سال امریکہ کی ۲۷ ریاستوں میں اس کالج کی تیار کی ہوئی کھانے کی چیزیں ۶۰ ہزار ڈالر کی فروخت ہوئی تھیں۔

کالج کی تیسری اہم صنعت جھاڑوؤں کا کارخانہ ہے جو ۵۰ درجن جھاڑو روزانہ تیار کرتا ہے۔ اس فیکٹری کی بنائی ہوئی چیزیں مقابلتہً زیادہ قیمت پر فروخت ہوتی ہیں۔ ان صنعتوں کے علاوہ ان کے یہاں فرشی دریاں بنانے، فوٹوگرافی، موٹروں کی مرمت کا کام بھی ہوتا ہے۔ ان کا اپنا پریس ہے۔ بجلی پیدا کرنے کا کارخانہ بھی اپنا ہے۔

میڈلین کالج کے نصاب میں ۲۷ دستکاریاں رکھی گئی ہیں اور یہ سب کی سب کالج کے طالب علم خود چلاتے ہیں۔ ہر طالب علم کا فرض ہے کہ اپنی تعلیم کا کم از کم آدھا خرچ اپنی محنت کی اجرت سے نکالے۔ ۴ سال کے پورے کورس کے لئے ہر طالب علم کو داخلے کے وقت صرف ۲۵ ڈالر جمع کرانے پڑتے ہیں۔ اس کے بعد پھر تمام تعلیمی مدت میں اسے کسی مزید مالی امداد کی ضرورت نہیں پڑتی اور جب وہ کالج سے نکلتا ہے تو اس کے ہاتھ میں کئی ہنر ہوتے ہیں جن سے وہ اپنی معاش حاصل کر سکتا ہے۔

طلبا کو روزانہ ۵ گھنٹے پڑھنا اور ۵ گھنٹے کام کرنا ہوتا ہے۔ اس کام کی اجرت ان کی تعلیم اور رہنے سہنے کے اخراجات کے حساب میں ۵۰ سینٹ فی گھنٹہ کی شرح سے جمع کر لی جاتی ہے۔ ضروریات کی تقریباً سب چیزیں مدرسہ کو اپنی صنعتوں سے مل جاتی ہیں مگر کالج ان چیزوں کی

قیمت طلبا سے نسبتاً کم وصول کرتا ہے۔ کالج کے نصاب کے مطابق ہر طالب علم کو سال بھر میں اتنا کام کرنا چاہیے کہ اس کی اجرت جمع ہو کر ۲۱۰ ڈالر ہو جائے۔ کالج طلبا سے جو مطالبات وصول کرتا ہے اس میں بڑے بڑے اخراجات حسب ذیل ہوتے ہیں:-

فیس تعلیم	۷۲ ڈالر سے ۹۶ ڈالر تک
کمرے کا کرایہ	۶۰ ڈالر
کھانے کا خرچ	۹۰ ڈالر

جو طالب علم اتنا کام نہیں کر سکتے کہ وہ ۲۱۰ ڈالر کی مطلوبہ اُجرت حاصل کر سکیں تو انھیں بقیہ رقم نقد ادا کرنی ہوتی ہے۔

کالج کے اس تمام کاروباری حصے سے ذاتی طور پر کوئی منافع نہیں کمایا جاتا۔ تمام آمدنی کالج کے چلانے اور اس میں مزید اضافہ کرنے پر صرف کی جاتی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بغیر کسی خارجی امداد کے اس وقت کالج کی مملوکہ جائداد ۵ لاکھ ۲۰ ہزار ڈالر کی ہے جو کالج کی کمائی ہوئی آمدنی سے پیدا کی گئی ہے اور اس وقت اس میں امریکہ کی ۳۶ ریاستوں سے آئے ہوئے ۳۰۰ طالب علم تعلیم حاصل کر رہے ہیں جن میں ۹ طلبہ غیر ممالک کے بھی ہیں۔

اپنی عمارتوں کی تعمیر کا کام بھی کالج کے لڑکوں نے خود کیا ہے۔ کالج اور سینی ٹوریم کی ۱۲۰ عمارتیں جو ۹۰۰ ایکڑ زمین گھیرے ہوئے ہیں ان سب کا ڈیزائن طالب علموں ہی نے تیار کیا ہے اور خود انھوں نے ہی تعمیریں کی ہیں۔ کالج یہ کر سکتا تھا کہ اپنی مصنوعات کی آمدنی کو بڑھا کر، عمارتوں کی تعمیر اور ان کے رکھ رکھاؤ کے لئے باہر کے آدمیوں سے کام لیتا لیکن جو لڑکے تعمیر عمارت کا کورس لیتے ہیں ان کی عملی تربیت نہیں ہو سکتی تھی۔

پڑھائی کے لئے ایک کمرہ بنانے کے واسطے تقریباً ۰ ۲۰ طالب علم کام کرتے ہیں اور ان کے کام سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ مبتدی ہیں۔ ایک دفعہ ایک صاحب کالج دیکھنے آئے۔ ایک طالب علم کمرے کا فرش تیار کر رہا تھا، انھوں نے اُس سے پوچھا "اس کام میں تمہارا کتنا تجربہ ہے!" لڑکے

نے جواب دیا: "اس جگہ سے کمرے کے دروازے تک۔"

طلبا کو اس بات کا پورا موقع ہے کہ وہ جو کام چاہیں اپنے لئے منتخب کرلیں۔ وہ نہایت محنت اور تن دہی سے کام کرتے ہیں اور اس بات پر ان کو فخر ہے کہ اپنی تعلیم اور اپنی ضروریات کے تمام اخراجات وہ اپنی محنت سے حاصل کرتے ہیں۔ اس سے ان میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اپنا تعلیمی کام بھی نہایت شوق اور انہماک سے کرتے ہیں۔

اس کالج کے گریجویٹ زیادہ تر نرسنگ، طبی امداد، معیشت خانہ داری اور زراعت کے کورس میں ڈگری حاصل کرتے ہیں۔ انہی طالب علموں کی مدد سے اس کالج نے جنوبی امریکہ میں ۳ ہائی اسکول ۶ جونیر ہائی اسکول اور ۱۶ گرامر اسکول قایم کئے ہیں جن کا سارا انتظام میڈیسن کے اسی اصول پر ہے کہ اپنے مدرسے کا خرچ خود برداشت کرنا چاہئے۔ ان میں سے ہر مدرسے کے ساتھ ایک سینی ٹوریم ہے جو اپنے پاس پڑوس کی بستیوں کو طبی امداد پہنچاتا ہے۔

میڈیسن کے اس کالج میں داخلے کے لئے بہت درخواستیں آتی ہیں لیکن کالج صرف انہی طالب علموں کی درخواستیں منظور کرتا ہے جو اعلیٰ تعلیم کا خرچ برداشت نہیں کرسکتے۔ لیکن اگر کبھی کسی دولتمند کے لڑکے کو اس کے والدین کے اصرار پر داخل کیا جاتا ہے تو اس کو بھی کالج کی فیکٹری اور کارخانوں میں کام کرنا پڑتا ہے اور اس طرح کالج کے دوسرے طلبا کو کبھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان کا کوئی ساتھی ایسا بھی ہے جو مالدار ہے اور اپنے خرچ کا خود کفیل ہوسکتا ہے۔

ملک میں میڈیسن کالج سے زیادہ پرانے اور بڑے بڑے کالج بھی ہیں جن میں تعلیم کے ساتھ صنعت بھی سکھائی جاتی ہے مگر یہ بات کسی نے پیش نہیں کی کہ "مدرسوں کو اپنا خرچ خود برداشت کرنا چاہئے اور چندوں کی امداد حاصل کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہئے۔"

میڈیسن کالج کی اس مثال سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ اعلیٰ تعلیم اپنا خرچ خود برداشت کرسکنے کے اصول پر زیادہ آسانی سے رائج کی جاسکتی ہے۔ اگر ہمارے ارباب فکر ہمارے یہاں کی اعلیٰ تعلیم کے نصاب کو بھی بنیادی قومی تعلیم کے نقطۂ نظر کے ماتحت ترتیب دینے کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیں تو آئندہ ہماری آزاد قومی ریاست کے استحکام اور ہماری معاشی ترقی کے لئے یہ کام بہت مفید ہوگا۔

بشیر احمد انصاری

تعلیم میں "مضامین"

رسالہ جامعہ کی پچھلی اشاعت (مارچ ۱۹۳۰ء) میں میں نے "تعلیم کی تعلیمی اصلاح" کے عنوان سے کچھ خیالات پیش کئے تھے اور ایک انگریز معلم کی کتاب کے حوالے سے چند تعلیمی مسائل کی طرف متوجہ کیا تھا۔ اسی مضمون میں یہ وعدہ بھی کیا گیا تھا کہ آئندہ اشاعت میں اس معلم کی رائے اپنے لفظوں میں پیش کروں گا کہ تعلیم کی مختلف منزلوں میں ان مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے جن کا ذکر مضمون میں تھا مضامین درس کی تقسیم کس طرح ہونی چاہئے۔ اس وقت اس وعدے کو پورا کرتا ہوں۔

تعلیم میں ہمارے سامنے چند کام آتے ہیں:- (۱) بعض ایسے علوم سے واقف کرانا جن کے بغیر دوسرے علوم کا حاصل کرنا دشوار ہو اور جو بطور آلات علم طلبی لازم ہیں نیز بعض مہارتیں پیدا کردینی جو ان علوم کے ساتھ وابستہ ہیں۔ (۲) کچھ اور علم اس نیت سے پہنچانا کہ تعلیم "لبرل" تعلیم بن سکے۔ (۳) بعض ایسے خاص مضامین کی تعلیم دینا جن سے طالب علم کے مخصوص رجحانات کو پیش نظر رکھا جائے یا جو کسی خاص پیشے کے لئے تیار کرنے میں معاون ہوں۔ (۴) ذہنی تربیت کا اہتمام کرنا (۵) اخلاق اور سیرت کی تربیت جس میں تربیت جسمانی کو بھی شامل سمجھنا چاہئے۔

ان کاموں میں سے نمبر ۴ تو ۱، ۲ اور ۳ کی تکمیل کے ساتھ ساتھ انجام پاتا ہے۔ نمبر ۵ میں ۱ تا ۳ سے بھی مدد ملتی ہے اور مدرسے کی عام فضا اور مدرسے سے باہر کے تعلقات و روابط سے بھی۔

سوال یہ ہے کہ نمبر ۱، ۲، ۳ کے لئے تعلیم کے مختلف منازل میں کون کون سے مضامین اور کون کون سے اشغال [illegible] ہیں۔ [illegible] کا خیال ہے کہ ابتدائی منزل میں (جو [illegible] کے ۵ یا ۶ سال کی عمر سے شروع نہ ہونی چاہئے بلکہ عمر کے ساتویں سال کی تکمیل کے بعد آٹھویں سال میں) ناظرین [illegible] تجویز اور [illegible] کی تعلیم کی تجویز کی مشابہت دیکھیں جس میں تعلیم کو ۷ سال کی عمر سے شروع کرنے

کی سفارش کی گئی تھی اور جس پر ہمارے ملک میں خاصی بحث رہی ہے۔ پہلے کام کے لئے صرف مادری زبان، حساب، اس قدر کہ جو معمولی خرید و فروخت کا کام انجام دینے میں ضروری ہوتا ہے، اور صحت و صفائی کے متعلق قواعد کی تعلیم ہونی چاہئے۔ اور اس آخری عنوان کو بھی پورے مرحلِ ابتدائی میں جاری رکھنے کی ضرورت غالباً نہ ہوگی۔ صرف ان تین مضامین میں "سبق" ہونے چاہئیں۔ دوسرے مضامین جو اب پڑھائے جاتے ہیں مثلاً مذہب، تاریخ، جغرافیہ، سائنس کی تعلیم کو دستکاری، آرٹ اور موسیقی کی تعلیم کے ساتھ اور ورزشِ جسمانی، کھیل وغیرہ کے ساتھ جو نمبر ۳ کے لئے تجویز کئے جاتے ہیں ضم کر دینا چاہئے۔

نمبر ۲ کے سلسلے میں یہ کرنا چاہئے کہ "پس منظر" دینے والے علم کے پہنچانے کا اہتمام کیا جائے۔ ہر مدرسے میں ایک اچھا کتب خانہ ایسی کتابوں کا ہو جنھیں بچے صرف نکال لیں نہیں بلکہ پڑھیں اور دیکھیں بھی؛ آرٹ کا ایک مجموعہ ہونا چاہئے جس میں اچھی تصاویر، عمارتوں وغیرہ کے عکس ہوں، موسیقی کے کمرے میں اچھا سا گراموفون ہو اور بہت سے اچھے اچھے ریکارڈ، مدرسے کے ہال میں سنیما دکھانے کا انتظام ہو اور دستکاری کے لئے اچھی کارگاہیں ہوں۔ یہاں بچے اپنے آنکھ کان، ہاتھ سے بہت کچھ سیکھ سکیں گے، لیکن 'سبق' اور 'درس' کی حیثیت سے نہیں، ذہنی پس منظر کی حیثیت سے۔ اس پس منظر والے حصہ تعلیم کا تعلق اسباق سے بس اتنا ہونا چاہئے کہ زبان کے سبق کے ساتھ اس کا اہتمام ہو کہ بچے ہر ہفتہ انھوں نے جو کچھ دیکھا، سنا یا کیا ہے اس کا ایک بیان اپنی زبان میں لکھ کر یا زبانی پیش کر دیا کریں۔

اس پس منظر والے کام میں استاد کی ہدایت بھی ہونی چاہئے اور اس کا ایک نظام بھی رکھنا چاہئے۔ استادوں کو تربیت کے سلسلے میں اس کام کے لئے خاص طور پر تیار بھی کرنا چاہئے۔ ان کے مختلف عنوانات کے [illegible] کی تعلیم بھی اس طرح کی جانی چاہئے کہ بچوں کے فطری رجحان [illegible] سے [illegible] کتاب میں "بیکن کے مضامین" کے باب میں بچوں کی پسند کا ایک نقشہ شامل کیا ہے۔ [illegible] کے بچوں میں [illegible] کے ہاتھ کے کام کو اور سب چیزوں پر ترجیح [illegible]

اور پسند کی فہرست میں پورے زمانے میں اول یا دوم مرتبے پر آتا ہے، لڑکیوں کے یہاں اس کا درجہ
چوتھا ہے۔ اور ۱۰ برس کی عمر تک بچیوں میں اول نمبر پایا جاتا ہے۔ اس سارے زمانۂ عمر میں
ڈرائنگ کا درجہ پسند کی فہرست میں دوسرے اور تیسرے نمبر سے نہیں گرتا، صرف بچیوں کے یہاں
۱۲-۱۳ سال کی عمر میں اس کا نمبر چھٹا ہو جاتا ہے۔ قدرت سے واقفیت کی خواہش کا درجہ ۷ سال
کے لڑکوں میں ساتویں نمبر پر ہے مگر تیرہ کی عمر میں دوسرے درجے پر پہنچ جاتا ہے۔ یہ بھی بتایا ہے کہ
۹ برس کی عمر میں بچہ گھر سے باہر کی زندگی کی طرف بہت مائل ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے لئے زیادہ بڑے
میدانِ عمل و حرکت کا طالب ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس عمر میں مدرسے سے یا گھر سے بھاگ
نکلنا اس قدر عام ہے۔ وہ اپنے طبیعی ماحول سے واقف ہونا چاہتا ہے اور دلچسپ مقامات کو جا کر
دیکھنا چاہتا ہے۔ ان سب معلومات کا تقاضا یہ ہے کہ پس منظر پیدا کرنے والی تعلیم کو جو وقت دیا جائے
اس میں سے زیادہ عملی کاموں کے لئے رکھنا چاہیے، دستکاری اور آرٹ کو دینا چاہیے، اور تعلیمی سیر کے
لئے خاص اہتمام کرنا چاہیے۔ مدرسے کے اوقات کا ⅓ یا ½ اس قسم کے کاموں کے لئے وقف کرنا قرین
صحت ہوتا اور وہ یوں کہ شروع کی جماعتوں میں درس کو ⅓ اور پس منظر کو ⅔ وقت دیا جائے، آخر کی
جماعتوں میں اسے نصف نصف تقسیم کر دیا جائے۔

ثانوی منزل میں مختلف قسم کے مدرسے ہوں گے۔ کوئی علمی، کوئی صنعتی، کوئی آرٹ اور موسیقی کا
مدرسہ۔ ان میں بھی 'درسی' مضامین اور 'پس منظر' پیدا کرنے والے مشاغل کی تفریق پیش نظر رکھنی چاہیے۔
یہاں درس میں تعلیم کے مندرجہ بالا کاموں میں نمبر ۱ کے علاوہ نمبر ۲ کے لئے بھی 'درس' کا انتظام ضروری
ہوگا۔ علمی مدرسے میں مادری زبان اور اس کا ادب تو سب کے لئے موضوع درس ہوگا، لیکن حساب صرف
ان کے لئے ہونا چاہیے جو سائنس یا ریاضیات میں تخصیص چاہیں۔ اور ان کے علاوہ دو یا تین مضمون اور
تاکہ خیال اور توجہ کے دھارے ۵-۶ سے زیادہ نہ ہوں۔ ان دو تین مضامین کے انتخاب میں بچے کے
رجحانات کا خیال رکھنا چاہیے۔ صنعتی اور آرٹ کے مدرسوں میں زبان اور ادب کے علاوہ اس شعبے کے خاص
مضامین ہوں۔ اور سب مدرسوں میں پس منظر پیدا کرنے کا کام ایک سا ہونا چاہیے۔ ابتدائی منزل کی طرح

یہاں بھی کتب خانوں اور خاص انتظاموں کی ضرورت ہوگی۔ البتہ اور کام اور عمل سے بلوغ کے رجحانات کی طرف جھک جائے گا۔ اور کتابوں، فلموں، تقریروں وغیرہ میں اس تغیر کا خیال رکھنا ہوگا۔ وقت کی تقسیم ثانوی منزل میں یہ ہونی چاہئے کہ شروع میں نصف وقت "درس" کے لئے ہو نصف "پس منظر" کے لئے، تیسری جماعت ثانوی میں دو تہائی درس اور سبق کے لئے ہوجائے اور ایک تہائی "پس منظر" کو دیا جائے۔

کالج کی اعلیٰ تعلیم میں بھی بلیک کا خیال ہے کہ پس منظر پیدا کرنے کا اہتمام اسباق اور لکچروں کے علاوہ خاص طور پر کرنا چاہئے اور کسی فارغ طالب علم کو کالج کا نصاب ختم کرتے ہی بازار میں نہ پھینک دینا چاہئے بلکہ ختم تعلیم کے بعد اس کے چنے ہوئے کام کے لئے ایک مخصوص کورس کا ضرور انتظام کرنا چاہئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ابتدائی اور ثانوی مدارس اور کالجوں کے نگرانوں اور ان کا نصاب بنانے والوں کو بلیک کی ان تجاویز پر خاص طور سے توجہ کرنی چاہئے۔ تاکہ تعلیم کی تعلیمی اصلاح کا کام اس کے لازم کرنے، مفت بنانے، پھیلانے کے ساتھ ساتھ انجام پانے لگے۔ یہ نہ کہ بہت زیادہ آدمیوں کی تعلیم کا انتظام ہوجائے مگر اسے اچھی تعلیم بنانے کا خیال نظر انداز کر دیا جائے۔ کمیت سے کیفیت کی تلافی کبھی نہیں ہوتی۔

سید مجتبیٰ حسین زیدی

مسلمان لڑکیوں کی تعلیم

ہمارا یہ بدبخت ملک جو کبھی علم و عمل کا گہوارہ کہا جاتا تھا آج جہالت کا مسکن بنا ہوا ہے اور اسی جہالت کی بدولت مصیبتوں میں گھرا ہوا تیزی سے ذلت اور تباہی کے غار کی طرف جا رہا ہے۔ سرسری نظر سے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کا چرچا روز بروز زیادہ ہو رہا ہے لیکن حقیقت میں تعلیمی ترقی کی رفتار بہت سست ہے۔ عورتوں کی خصوصاً مسلمان عورتوں کی حالت تو نہایت ہی افسوسناک ہے۔ ہندوستان میں بارہ فی صدی سے زیادہ لوگ پڑھے ہوئے نہیں، جن میں عورتیں دو فی صدی سے بھی کم ہیں۔ ان دو فی صدی حرف شناس عورتوں میں مسلمان عورتیں کتنی ہوں گی؟ شاید ہزار میں دو تین ہوں تو ہوں۔

بظاہر ہندوستانی مسلمان اپنے سیاسی اور تہذیبی حقوق کے لئے بڑے زور شور سے جد و جہد کر رہے ہیں۔ لیکن جو اصلی چیز ہے، انسانیت کا بنیادی حق ہے، جس سے اُن کی حالت سچ مچ سنبھل سکتی ہے، ان کے سارے حقوق انھیں خود بخود مل سکتے ہیں، یعنی تعلیم، اس کی طرف ان کی توجہ پہلے سے کچھ کم ہی ہو گئی ہے۔ اُونچے اور متوسط طبقے کے چند لاکھ لوگوں کے پڑھے لکھے ہونے سے کیا ہو سکتا ہے جب کہ باقی آٹھ نو کروڑ انسان جہالت کی تاریکی میں پڑے ٹاپک ٹوئیاں مار رہے ہوں۔ اگرچہ لڑکوں کی تعلیم بھی بہت کم ہے اور اس کی طرف سے بھی مسلمان بہت بے پروا ہیں لیکن جیسی غفلت وہ اپنی لڑکیوں کی تعلیم سے برت رہے ہیں اس کی مثال آج کل کی دنیا میں مشکل سے ملے گی۔ اتنے وسیع ملک میں مسلمان لڑکیوں کے گنتی کے مدرسے اور نام کے دو ایک کالج ضرور قائم ہیں لیکن اول تو وہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں، دوسرے ان کا طریقہ تعلیم

ناقص اور مضر ہے جس سے فائدہ کم حاصل ہوتا ہے اور نقصان زیادہ۔ ہندوستانی مسلمان مردوں نے صدیوں سے عورت کے حقوق اور مطالبات کی طرف سے جس طرح اپنے کان اور اپنی آنکھیں بند کرلی ہیں وہ محتاجِ بیان نہیں۔ منصف پسند لوگ خود اس بات کو سمجھتے اور جانتے ہیں۔ عورتوں کو اس طرح پامال کرنے، ان کو دینی اور دنیاوی معلومات سے بے خبر اور علم کی بیش بہا نعمت سے محروم رکھنے کی وجہ سے عورتوں کی جو ابتر اور زبوں حالت ہوگئی ہے وہ تو ظاہری ہے مگر اسی کے ساتھ ساتھ اس کا اثر مسلمانوں کی پوری قوم پر بہت برا پڑا ہے۔ جس قوم کی مائیں دبی، کچلی، جاہل، دنیا سے ناواقفِ محض ہوں گی اس کا انجام سوچ کر دل لرزتا ہے۔ اب بھی اگر مسلمان مردوں کو عقل آجائے تو غنیمت ہے۔ جو کچھ ہوا وہ ہوچکا مگر خدا کے لئے اب تو ان حق تلفیوں کی تلافی کیجئے۔ سارے ملک میں لڑکیوں کے لئے بہترین اسکول قائم کیجئے اور کرائیے۔ لڑکیوں کو علم کی دولت سے اب زیادہ دنوں محروم نہ رکھئے ورنہ انجام اس سے بھی زیادہ خوفناک ہوگا جو اب نظر آرہا ہے۔۔۔ وہ زمانہ گیا جب عورتیں اپنی حالت پر شاکر اور قانع تھیں۔ اب وہ بھی اپنے جائز حقوق کی حفاظت کرنا اور اپنے مطالبات منوانا چاہتی ہیں، خصوصاً اپنے سب سے بڑے حق یعنی تعلیم حاصل کرنے کے لئے وہ حد سے زیادہ بے چین ہیں۔ میں نے کتنے گھرانوں کی بے بس، لاچار لڑکیوں کو تعلیم پانے کے لئے اس طرح تڑپتے دیکھا ہے جیسے کوئی پیاسا ٹھنڈے پانی کے لئے تڑپتا ہو۔۔۔۔ وہ دیکھ اور سمجھ رہی ہیں کہ اس زمانے میں جاہل کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ جاہل عورت کی نہ باپ بھائی عزت کرتے ہیں نہ شوہر اور بیٹے۔ وہ دیکھ رہی ہیں کہ گھرداری اور خانہ داری کے فرائض کی ادائگی، بچوں کی پرورش اور تربیت ان سب باتوں کے لئے بھی تعلیم کا ہونا ناگزیر ہے۔ وہ دیکھ رہی ہیں کہ موجودہ دنیا میں عورت محض مرد کی اندھی [illegible] کی پابند نہیں بلکہ وہ اس کی شریک کار ہے [illegible] معاشرت میں، سیاست میں [illegible] کاروبار میں، ملازمت میں ہر جگہ مردوں کے دوش بدوش کام کر رہی ہے۔ اگر مسلمان عورتیں اسی طرح جاہل اور پسماندہ رہیں تو [illegible] کے ساتھ [illegible] کی بھی زندگی تلخ اور بدتر ہو جائے گی [illegible] کوئی [illegible] پسند نہیں کرے گا [illegible]

خیال رہتا ہے۔ لیکن جب وہ دیکھتی ہے کہ اس کی جہالت کی وجہ سے نہ اس کی عزت ہے اور نہ وہ عملی میدان میں جدوجہد کرکے زبردستی اپنی عزت کرا اور اپنی اہمیت منوا سکتی ہے تو اس کے دل میں رنج و غصے کے ساتھ ساتھ بغاوت کے جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ وہ چاہتی ہے کہ سماج کی ان ساری بندشوں کو توڑ کر مرد کے پنجے سے آزاد ہو کر زبردستی اپنے حقوق حاصل کرے۔ لیکن صدیوں کی غلامی اور جہالت کی وجہ سے چونکہ اس کی قوت عمل کمزور ہو گئی ہے، اس لئے وہ تڑپ تڑپ کر رہ جاتی ہے اور جیسا کہ ایسی صورت میں ہونا ضروری ہے اس پر بے چارگی اور مایوسی چھا جاتی ہے جس سے اس کی موجودہ خانگی زندگی میں الجھنیں اور دقتیں پیش آتی ہیں۔ دوسری طرف اپنے حقوق غصب کرنے والوں کی طرف سے نفرت اور تعصب کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جو اس سے بھی زیادہ مضر اثرات دکھاتا ہے۔

انصاف پسندی کا، اسلامی مساوات کا، موجودہ زمانے کا تقاضا اور سخت تقاضا ہے کہ عورتوں کے اس جائز مطالبے، یعنی لڑکیوں کی تعلیم کی طرف جلد سے جلد پوری توجہ دی جائے۔ یہ بے حسی، یہ تساہل، یہ بے پروائی اسی لئے ہے ناکہ آپ عورت کو، (خواہ زبان سے نہ کہیں) اب تک اپنی خدمت کرنے والی لونڈی اور اپنے بچوں کی دائی سمجھتے ہیں؟ جسے انسانیت کے سب سے بڑے حق، علم کی دولت سے محروم کرکے بھی آپ کا ضمیر آپ کو ملامت نہیں کرتا، آپ کے دل میں ناانصافی اور ظلم کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے رہنما بھی جنھوں نے مسلمانوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور بہت کچھ کر بھی دکھایا، آدھی قوم کے حقوق اور مطالبات سے غافل اور بے نیاز رہے۔ اسی کا نتیجہ تو ہے کہ ان کی ان تھک اور بے غرض خدمتیں اور کوششیں بھی مسلمان قوم کی ذلت اور تباہی پوری طرح سے دور نہ کر سکیں۔ سر سید علیہ الرحمۃ نے لڑکوں کی تعلیم کے لئے کیا کچھ نہ کیا لیکن لڑکیوں کی تعلیم کے لئے چند جملے لکھنے کے سوا انھوں نے کوئی زحمت نہ گوارا کی۔ آخر کیوں؟ مصلح کا کام صرف ایک طبقے یا جنس تک ہی تو محدود نہیں ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر اقبال ایشیا کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا تھا اور ملک میں سب نے [illegible]

ایک انقلاب پیدا کر دیا جس نے اپنی جادو بیانی سے لوگوں کے دلوں کی کایا پلٹ دی، وہ عورتوں کے متعلق جن جذبات اور خیالات کا اظہار کرتا ہے وہ باعثِ افسوس ہی نہیں باعثِ حیرت بھی ہے جس نے کروڑوں آدمیوں کو خوابِ غفلت سے جگانے کا فرض اپنے ذمہ لیا تھا وہ کس سادگی سے کہتا ہے ؎

میں بھی مظلومیِ نسواں سے ہوں غم ناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

ان سے اس عقدۂ مشکل کی کشود نا ممکن ہو مگر عورت کے محسنِ اعظم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس عقدۂ مشکل کو اب سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کھول چکے ہیں۔ آپ نے اسے انسانیت کے سارے حقوق عطا کئے تھے۔ آپ نے اُسے جہالت اور قید و بند کی زندگی سے نجات دی تھی۔ آپ نے یہ کہیں نہیں فرمایا کہ "آزادیِ نسواں کے بجائے عورت کو زمرد کے گلوبند کی خواہش ہونی چاہیئے۔ ہم علامہ ڈاکٹر اقبال کی انسانیت کے علمبردار مصلح اور رہنما شاعر کی حیثیت سے دل و جان سے عزت کرتے ہیں اور چونکہ ہم اپنے آپ کو انسانوں میں شمار کرتے ہیں اس لئے ان کے پیغام کا پورا احترام کرتے اور اپنے کو بھی اس کا مخاطب سمجھتے ہیں۔ لیکن جو خیالات انھوں نے عورت کے بارے میں ظاہر کئے ہیں ان کو دیکھ کر ہمیں تعجب، رنج اور افسوس ہوتا ہے بے شک ہم یہ مانتے ہیں کہ "مدرسۂ زن" دین سے "بے گانہ" ہرگز نہیں رہنا چاہیئے (بلکہ ہمارا تو خیال ہے کہ مدرسۂ مرد بھی دین سے بے گانہ نہیں رہنا چاہیئے) لیکن کہیں اس مدرسۂ زن کی، جو دین کا محرم ہے، صورت بھی تو نظر آئے۔ کیا یہ غیرت اور افسوس کی بات نہیں کہ ستر بہتر برس کی تعلیمی جدوجہد میں مسلمان لڑکیوں کا ایسا ایک مدرسہ بھی نہ بن سکے جو ان کی قومی ضرورتوں اور مصلحتوں کے مطابق ہو؟ بہرحال پچھلوں نے جو ان کی سمجھ میں آیا کیا اور کہا۔ یہ زمانہ بھی وہ تھا کہ عورت کی کوئی آواز نہ تھی، اس کا کوئی مطالبہ نہ تھا، وہ اپنے حقوق سے بے خبر، اپنی جہالت میں مگن، تاریکی کو روشنی، ذلت کو عزت سمجھے مطمئن زندگی بسر کر رہی تھی۔ مگر

اب زمانہ پلٹ چکا ہے اور اب مسلمان قوم کو سب سے پہلا سب سے ضروری پوری توجہ اور پھرتی لگن سے جو کام کرنا ہے وہ یہ کہ لڑکوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی لڑکیوں کی تعلیم کا بہت وسیع پیمانے پر انتظام کریں۔ یہ اسکول ایسے اسکول نہ ہوں جیسے اب تک لڑکوں کے لئے بنتے رہے ہیں۔ یوں تو وہ تعلیم لڑکوں کے لئے بھی ناقص ثابت ہوئی ہے لیکن لڑکیوں کے لئے تو وہ نصاب جو آج کل لڑکوں کے مدرسوں میں رائج ہے کسی طرح موزوں نہیں .....

ضرورت اس کی ہے کہ ملک کے چند صاحبِ فکر، صاحبِ نظر، تجربہ کار، انصاف پسند ماہرینِ تعلیم مشورہ کرکے ایک ایسا نصاب مرتب کریں جس میں ایک طرف لڑکی کی جسمانی اور ذہنی ترقی اور تربیت کا پورا خیال رکھا جائے، دوسرے اس کی روحانی غذا کا، یعنی صحیح معنوں میں مذہبی تعلیم کا جس میں سچی اسلامی روح موجود ہو، بہتر سے بہتر انتظام کیا جائے اور ساتھ ہی اس کو ان فرائض کے انجام دینے کے قابل بنایا جائے جو اس پر قدرت اور سماج کی طرف سے عائد کئے گئے ہیں، مثلاً گھرداری، بچوں کی پرورش اور تربیت، نرسنگ وغیرہ۔ اسے محض کھانا پکانا اور سینا پرونا ہی نہیں بلکہ اور گھریلو صنعتیں بھی سکھائی جائیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر عورت دفتروں، دکانوں، کارخانوں وغیرہ میں نوکری کرے۔ اُس کو ایسے ہنر سکھانے چاہئیں جو اس کی فطرت اور طبیعت سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں اور جن کاموں کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ذاتی فرائض بھی اچھی طرح انجام دے سکے، مثلاً خطاطی، مصوری، کتابت، چھوٹے بچوں کی تعلیم، ڈاکٹری، نرسنگ، معلمی، اخبار نویسی، لڑکیوں کے اسکولوں اور دوسرے زنانہ اداروں کا انتظام وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے بہت سے کام سکھائے جا سکتے ہیں۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جائے کہ لڑکیوں کو لڑکوں کی طرح الجبرا اور جیومیٹری، اقلیدس اور حساب کے بے کار اور پیچیدہ سوالات حل کرنے پر مجبور نہ کیا جائے بلکہ یہ چیزیں صرف اتنی نصاب میں رکھی جائیں کہ لڑکیاں ابتدائی باتوں سے بے خبر نہ رہیں۔ انگریزی [illegible] کی اور دوسری زبانوں پر بھی اس دور میں زیادہ زور نہ دینا چاہئے اور یہ تو خیر لازمی بات ہے کہ انھیں ساری تعلیم مادری زبان میں دی جائے البتہ

میرے نزدیک اتنی عربی ہر مسلمان لڑکی کو یکساں لازمی قرار دیا جائے جس کی مدد سے وہ قرآن شریف کا تھوڑا بہت مطلب سمجھ سکے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے بعد جو لڑکی اعلیٰ تعلیم پانی چاہے وہ چاہے تو دوسری زبانوں میں اور کسی دوسرے خاص مضمون میں مہارت حاصل کرے۔ لڑکوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم کے لئے سوگرلی کالج کھولنے کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے مگر اس میں بھی عورتوں کے نصاب کا تعین الگ سے کرنا ہوگا۔

اس وقت تو حالت یہ ہے کہ لڑکیوں کی ایک بہت بڑی تعداد تو جاہل ہے کچھ حرف شناس ہیں جن کا پڑھنا نہ پڑھنا برابر ہے اور گنتی کی جن چند لڑکیوں نے تعلیم پائی ہے وہ غلط نصاب اور ناقص تعلیم کے سبب ذہنی اور دماغی طور پر بالکل لڑکا بن گئی ہیں۔ یاد رکھئے جس طرح مرد کسی لڑکے کے لئے تحقیر سے یہ کہتے ہیں کہ یہ تو بالکل لڑکی ہے اسی طرح عورتیں لڑکی کا لڑکا بن جانا برا سمجھتی ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک دوسرے کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ نہیں بلکہ قدرت نے مرد عورت دونوں میں بعض جوہر ایسے رکھے ہیں جو دوسرے میں نہیں۔ ان میں ایک دوسرے سے مختلف صفات اور خصوصیات کی بنا پر مرد مرد اور عورت عورت ہوتی ہے اور ان دونوں سے مل کر ہی زندگی کا تانا بانا بنتا ہے۔ اس لئے لازمی ہے کہ مرد اپنی خصوصیات کی تربیت کرے اور عورت اپنے نسوانی جوہر اور خصوصیات کو باقی رکھے کہ یہی اس کی معراج ہے لیکن یہ غلط طریقۂ تعلیم لڑکی کو لڑکا بنا رہا ہے اور یہی لڑکا نما لڑکی جب مغرب کی سستی قسم کی عورت کی نقالی بھی کرتی ہے تو ایک عجیب مضحکہ خیز چیز بن جاتی ہے جسے دیکھ کر لوگ عورتوں کی تعلیم سے اور زیادہ ڈرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ اس کی ذمہ داری سراسر ان پر ہے جنہوں نے حقیقت کو سمجھے بغیر لڑکے لڑکی دونوں کے لئے ایک سا نصاب تعلیم اور ایک سا طریقِ تعلیم مقرر کر دیا۔ لہٰذا جو ماہرین تعلیم لڑکیوں کی تعلیم کے لئے نصاب بنانے بیٹھیں وہ اس امر کی طرف خاص توجہ رکھیں کہ ہمیں اپنی عورتوں کو مرد بنانا نہیں بلکہ عورت ہی رہنے دینا ہے اور اس کے مخصوص جوہر اور نسوانی خصوصیات اور خوبیوں کو باقی رکھنا اور اجاگر کرنا لڑکیوں کی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد ہونا چاہئے۔

ہم اپنے سارے ہم وطن تعلیم یافتہ، اہلِ فکر، اہلِ نظر، صاحبِ دماغ، صاحبِ اختیار، ماہرینِ تعلیم اور اربابِ حکومت اور قوم کے سچے خادموں اور رہنماؤں سے پرزور درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہمارے اس مطالبے پر نیک نیتی، خلوص اور انصاف پسندی کے ساتھ غور کریں اور جلد سے جلد لڑکیوں کی تعلیم کی طرف پوری توجہ مبذول کردیں اور اس کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں۔ ۔ ۔ ۔ ورنہ اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ ۔ ۔ صدیوں کی کچلی ہوئی جاہل عورت اگر خدانخواستہ بغاوت پر اتر آئی تو شاید اس سے بھی زیادہ خوفناک انجام ہو جو آج خانہ جنگی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ ۔ ۔ ۔ گھریلو زندگی، خاندانی تعلقات، مرد عورت کی محبت و یگانگت، آیندہ نسل کی بہبودی سب کچھ خطرے میں پڑ جائے گی اور قومی زندگی کا رہا سہا شیرازہ بھی بکھر جائے گا۔

آخر میں، میں اپنی کروروں بہنوں کی طرف سے وزیرِ تعلیم گورنمنٹ ہند جناب مولانا ابوالکلام آزاد سے مطالبہ کرتی ہوں کہ ان کے محکمۂ تعلیم کو لڑکیوں کی تعلیم کی طرف، لڑکوں کی تعلیم سے زیادہ توجہ دینا اور اس کے لئے زیادہ سے زیادہ روپیہ صرف کرنا چاہئے، نیز نمونے کے بہترین اسلامی اسکول قائم کرنے میں زیادہ سے زیادہ مدد دینی چاہئے۔ مجھے امید ہے کہ آنریبل وزیرِ تعلیم ہماری اس اپیل پر غور کریں گے اور جلد سے جلد اسے عملی صورت دیں گے۔ اور ساتھ ہی میں تعلیم کے سب سے بڑے رہنما اور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے یہ شکایت کرتی ہوں کہ وہ بھی بیس سال سے لڑکوں کی تعلیم کے لئے جان کھپا رہے ہیں لیکن لڑکیوں کی تعلیم کی طرف اب تک انھوں نے بھی توجہ نہ کی۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی راہ میں ہزاروں مشکلیں اور رکاوٹیں ہیں، مگر میں انہیں سے پوچھتی ہوں کہ اگر وہ بھی اس کی طرف توجہ نہ کریں گے تو پھر کون کرے گا؟ میں ان سے اپنی چالیس کروڑ بہنوں کی طرف سے درخواست اور مطالبہ کرتی ہوں کہ وہ جلد سے جلد اپنی نگرانی میں لڑکیوں کا ایک ایسا اسکول قائم کریں جو نمونے کا کام دے اور سارے ملک میں مسلمان لڑکیوں کے لئے اسی طرز کے اسکول قائم کئے جا سکیں۔ ہماری قوم کا اور حکومت کا فرض یہ ہے کہ وہ اس اسکول کے قائم کرنے اور چلانے میں دامے، درمے، قدمے ہر طرح سے مدد دے اور پھر اس کے نمونے

اسکول سارے ملک میں قائم کرکے ہمارے اس مطالبے کو پورا کرے۔ یہ باتیں جو میں نے عرض کیں محض برائے گفتن نہیں بلکہ کروڑوں بے بس اور لاچار عورتوں کے دکھے دل کی پکار ہے جس کا پورا کرنا قوم کا سب سے پہلا فرض ہے۔ اگر آپ نے یہ کام کر دکھایا تو اس ظلم و ناانصافی کی بہت کچھ تلافی کر دیں گے جو صدیوں سے آپ عورت کے ساتھ کرتے آئے ہیں۔

صالحہ عابد حسین

سرگوشیاں

نسیمِ نرم رَو کرتی ہے یوں سرگوشیاں مجھ سے
کہ گوشِ دل میں غنچوں کی چٹک معلوم ہوتی ہے
کہا کرتی ہیں آدھی رات کی خاموشیاں مجھ سے
ترے دل میں محبت کی کھٹک معلوم ہوتی ہے

یہ شب کو جاگنے والے، یہ تنہائی کے شیدائی
یہ صورت گر، یہ غارت گر، یہ دیوانے، یہ فرزانے
شکستہ دل، پریشاں مو، یہ نکتہ چیں، تماشائی
بٹھایا ہے انھیں آنکھوں پر آخرکار دنیا نے

مجھے اکثر نظر آتے ہیں کچھ آثار ایسے بھی
خزاں کی رگ میں موجِ بہار آجائے گی ہمدم
نہیں جس شاخ پر سوکھے ہوئے دو چار بھی پتے
وہی گلہائے رنگا رنگ سے لہرائے گی ہمدم

گذر جائے گی یہ لُو کی لپٹ، یہ آندھیاں کالی
یہ پیلا آسماں، یہ آفتابِ گرم کی چشمک
چلیں گی شبنم آلودہ ہوائیں چال متوالی
گھٹائیں چھائیں گی گھنگھور مینہ برسے گا پہروں تک

ہوئی مدت کہ ویرانے میں اک اک اینٹ چنتا ہوں،
ہنسا کرتی ہے میری سعیِ لاحاصل پہ بربادی
مگر میں جیتے جی کے وقت اِک آسودہ ہوں
کہ ہو جائے گی اس سنسان وادی میں بھی آبادی

اختر حمید خاں

تبصرے

افکارِ آتشیں : مجموعہ منظومات حافظ فضل الرحمٰن صاحب بزمی۔ ملنے کا پتہ : امین بک ڈپو، پیلی کوٹھی، بنارس۔ ضخامت ۱۲۲ صفحات، سائز ۲۲×۱۸/۱۶، کاغذ اچھا، کتابت وطباعت اوسط درجے کی۔ قیمت عہ

بزمی صاحب نوجوان شاعر ہیں، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی اسلامی واصلاحی تعلیمات سے متاثر۔ قریب قریب سبھی نظموں میں اصلاحی رنگ نمایاں ہے۔ چند نظمیں طنزیہ بھی ہیں۔ ان میں الکشن، خانقاہ، مولوی زیادہ کامیاب ہیں۔ ایک چیز ان سب نظموں میں مشترک ہے اور وہ ہے شاعر کا خلوص۔ رہا پختگی اور اثر کا معاملہ تو یہ چیزیں مشق و مزاولت کے بعد پیدا ہو جائیں گی۔

حریمِ ادب : ماہوار رسالہ۔ ملنے کا پتہ : انجمن حریم ادب، دہلی۔ چندہ سالانہ -

عبدالباسط نعیم صاحب نے مضمون نگار بچوں کی ایک انجمن بنائی ہے۔ انجمن کی طرف سے "حریم ادب" نام کا ایک رسالہ بھی نکلتا ہے، ماہوار۔ اس میں بچوں کے مضمون ہوتے ہیں، مختلف شاخوں کی رودادیں ہوتی ہیں، نگرانِ انجمن کی ہدایتیں اور مشورے ہوتے ہیں اور دو ایک مسئلے ہوتے ہیں۔ نعیم صاحب بہت ہمت و کوشش سے اس تحریک کو چلا رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اس معاملے میں وہ بچوں کی صحیح رہنمائی کریں گے۔ یہ بہت ذمّے داری کا کام ہے۔

نیا دور (ہفتہ وار) : ایڈیٹر سید جلال الدین کاظمی۔ ملنے کا پتہ : ایڈیٹر، نیا دور، نمبر ۵۰۰ کوم جاہی روڈ، حیدرآباد (دکن)۔ سائز ۳۰×۲۰/۴، ضخامت ۱۶ صفحے۔ قیمت سالانہ آٹھ روپیے فی پرچہ ۳ ر

یہ ہفتے وار اخبار سماج کی خدمت و رہنمائی اور صحیح سیاسی تعلیم کے لئے ترقی پسند ادیبوں کی طرف سے نکالا گیا ہے۔ زیر نظر نمبر جلد کا پہلا نمبر ہے۔ اس میں اخبار کی اشاعت کے جو مقاصد بیان کئے

گئے ہیں وہ بہت خوش آیند ہیں۔ زیرِ نظر نمبر کے مضامین "ہمالیہ سے دس میل پرے" "نئی دنیا (افسانہ) سنگلہ میں مزدوروں کی جدوجہد" "اپنے وطن میں" مفید معلوماتی اور غور سے پڑھے جانے کے قابل ہیں۔ "نئی دنیا" ایک افسانہ ہے جو مرہٹی سے لیا گیا ہے۔ "آغاز کا انجام" نظم ہے یہ دونوں بھی اسی رنگ میں ہیں۔

سالنامہ "قوم" دہلی: مدیر انوار الحق حقی، سلیمان الارشد فاروقی۔ ملنے کا پتہ: لائبریری روڈ، دہلی۔ قیمت سالانہ للعہ؎، فی پرچہ ۶؍۔

"قوم" کا سالنامہ لائق اڈیٹروں کی کوششوں کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اس میں ۹ مقالے ہیں، ۲۳ افسانے، ۲۹ نظمیں۔

لکھنے والوں میں ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ، جاں نثار اختر، محمد احمد سبزواری، ابوسعید بزمی، سلیمان الارشد فاروقی، آسی رام نگری، ظریف دہلوی، احمد ندیم قاسمی، مقبول حسین احمد پوری، الطاف مشہدی، کوثر چاند پوری، سلیمان ادیب وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ شروع میں مسلم لیگ کے بڑے بڑے لیڈروں، دلی کے بڑے بڑے افسروں اور سالنامے کے خاص خاص مضمون نگاروں کی تصویریں بھی ہیں۔ آخر میں نونہال کلب کے نام سے بچوں کے کام کی چیزیں ہیں۔ یہ حصہ نسبتاً جلی خط میں لکھا جائے تو بچوں کے لئے زیادہ مفید ہوگا۔ نظموں کے انتخاب میں بہت خوش ذوقی کا ثبوت دیا گیا ہے۔

تعمیر: ماہنامہ ۔ مدیر حامد حسین صدیقی بی اے (جامعہ)۔ ملنے کا پتہ: دار الاشاعت تعمیر ادب، علوی پریس، بھوپال۔

یہ پرچہ مولانا محوی صدیقی لکھنوی کی سرپرستی اور حامد حسین صدیقی بی۔ اے (جامعہ) کی ادارت میں جنوری ۱۹۴۷ء سے نکل رہا ہے۔ مقصد ادب کی تعمیر ہے اس لئے قدرتاً ادبی مضامین، نظموں اور غزلوں کا پلا بھاری ہے۔ پہلے نمبر میں حضرت فہمی لکھنوی کا منظوم ڈراما انجام شاعر خاصے کی چیز ہے۔ شاعروں کی بزم میں دکنی شعراء کی تعداد کافی ہے۔ رسالے کی لکھائی چھپائی اور ترتیب میں سلیقہ نمایاں ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ رسالہ آئندہ اور ترقی کرے گا۔

جدید اردو: ماہنامہ۔ مدیر مسئول پرویز شاہدی۔ ملنے کا پتہ: نمبر ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ۔ سائز ۲۰×۳۰/۸ ضخامت ۴۰ صفحے۔ قیمت سالانہ للعہ، فی پرچہ ۶/۔

یہ ایک علمی و ادبی اور سیاسی رسالہ ہے۔ موجودہ مسائل پر عموماً اسلامی روشنی میں بحث کی جاتی ہے۔ زیر نظر نمبر میں "ہماری ذہنی الجھنیں"، "پس چہ باید کرد"، "سالنامہ ۱۹۴۶ء پر تبصرہ" توجہ سے پڑھنے کے قابل مضمون ہیں۔ دوسرے مضامین نظم و نثر بھی اچھے خاصے ہیں۔ مولانا وحشت کی غزل مرصع ہے۔ رسالے کی لکھائی چھپائی بھی اچھی خاصی ہے۔

قومی آواز: ماہنامہ۔ ایڈیٹر حیات اللہ انصاری۔ ملنے کا پتہ:

قومی آواز اردو صحافت میں ترقی کی طرف ایک قدم ہے۔ اس کی ترتیب میں سلیقہ، خوش نمائی اور جدت ہے۔ زبان میں شائستگی ہے اور اردو صحافت میں یہ ایسی جنس بے بہا ہے جو خال خال ہی نظر آتی ہے۔ زیر نظر نمبر اس کا سالنامہ ہے۔ اس میں چند معیاری علمی و ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ وقت کے ضروری مسائل پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے، مثلاً اناج کی قلت، ہندو مسلم نزاع کے اسباب۔ نظم کا حصہ بھی اچھا ہے۔ پہلے صفحے پر بلاک کی چند تصویریں ہیں۔

معاشی دنیا

(۱)

ٹائمز آف انڈیا کواٹرلی نے اپنی اپریل ۴۷ء کی اشاعت میں ہندوستان کی موجودہ حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے مختلف ممالک میں جنگ ختم ہونے کے بعد سے جو کچھ ہوا ہے اس کا ایک مفید خاکہ پیش کر دیا ہے۔ ذیل کی معلومات اس مضمون سے ماخوذ ہے۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ | پچھلے ۱۰ ماہ میں یہاں معیشت بہت کچھ جنگ سے پہلی والی حالت پر پہنچ گئی ہے۔ فوجیوں کو نہایت تیزی کے ساتھ فوجی خدمت سے بری کر کے دولت آفرینی کے کام کے لئے آزاد کر دیا گیا ہے۔ لیکن باوجود اس کے کہیں بے کاری اور بے روزگاری کے آثار نہیں ہیں۔ ۴۶ء میں زرعی پیداوار اتنی ہوئی کہ امریکہ کی تاریخ میں پہلے کبھی نہ ہوئی تھی صنعتی پیداوار کی مقدار بھی جنگ سے پہلے کی پیداوار سے ۲۵ فی صدی زیادہ رہی۔ چونکہ مال بھی بہت بنا اس لئے آمدنیوں کی فراوانی نے قیمتوں کو نہیں چڑھایا۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۰ء تک برآمد کا جو اوسط رہا تھا ۴۶ء میں اس سے دوگنا مال باہر بھیجا گیا۔ جنگ کے زمانے میں کاروبار پر جو پابندیاں لگائی گئی تھیں وہ بیشتر ہٹالی گئی ہیں۔

کنیڈا | جنگ کے زمانے کی پابندیاں یہاں بھی زیادہ تر ہٹ گئی ہیں۔ مزدوروں میں بے چینی بہت کچھ رفع ہو گئی ہے۔ اور سب کے لئے کام کا موقع ہے بے روزگاری نہیں ہے۔ ۴۵ء کے مقابلے میں کوئلہ، پٹرول، عمارت کے سامان کی پیداوار میں ۱۲ فیصد کا اضافہ ۴۶ء میں ہوا، گیہوں کا آٹا ۹ فیصد زیادہ پسا، اخباروں کے لئے کاغذ میں ۲۷ فیصد کا اضافہ ہوا۔ برقی توانائی جتنی اس سال تیار ہوئی پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ عمارتوں کے ٹھیکے قیمت میں پچھلے سال سے ۶۲ فیصد زیادہ کے دیے گئے۔

برطانیہ | برطانیہ میں معاشی زندگی میں وہ ہما ہمی تو نہیں ہے جو امریکہ یا کنیڈا میں ہے۔ پھر بھی پہلے کام کے لائق آدمیوں میں سے ۲۴ فیصد پہلے فوجی خدمت میں تھے تو اب ۱۰ فیصد رہ گئے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزوں کا وہی حال ہے البتہ کپڑے کی مقدار میں معتدبہ اضافہ ہوا ہے۔ ۳ لاکھ کے قریب خاندانوں کے لئے رہنے کا جیسا تیسا انتظام ہو گیا ہے۔ یہاں کی معاشی زندگی کا سدھار تمام تر برآمد کے بڑھنے پر ہے سو ۱۹۳۸ء کے مقابلے میں برآمد تقریباً ۱۱۵ فیصد زیادہ ہوئی۔

دوسرے مغربی ممالک | دوسرے ممالک میں بھی جہاں جنگ اور جرمن تسلط نے معیشت کو درہم برہم کردیا تھا حالات کچھ سدھرے ہیں۔ اگر ۱۹۳۹ء کی صنعتی پیداوار کو ۱۰۰ مان لیا جائے تو بیلجیم میں ستمبر ۴۵ء میں پیداوار ۴۸ رہ گئی لیکن ستمبر ۴۶ء میں ۱۰۹ تک پہنچ گئی۔ ڈنمارک میں اسی طرح ۷۳ سے ۹۴ پر آگئی، ناروے میں ۷۰ سے ۱۰۱ پر۔

ہندوستان | ہندوستان میں ابھی کوئی خوش گوار تبدیلی نمودار نہیں ہوئی ہے۔ فوج سے کوئی ۱۲ لاکھ آدمی نکل چکے ہیں۔ معمولی مزدور جو زمانۂ جنگ میں فوجی کاموں میں لگے ہوئے تھے وہ بھی اکثر ان کاموں سے ہٹ چکے ہیں، ان میں سے بیشتر کسی صنعتی کام میں نہیں کھپ سکے ہیں بلکہ زراعت ہی سے اپنی روزی کمانے کی دشوار کوشش میں مصروف ہیں۔ پیداوار کو لیجئے تو صورتِ حال چنداں قابلِ اطمینان نہیں۔ مثلاً غذا کا معاملہ ہے۔ یوں تو غذائی اجناس کی مقدار ہمارے یہاں ضرورت سے ہمیشہ کچھ کم ہی ہوتی تھی اور یہ تفاوت آبادی میں اضافے کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ غلہ کی پیداوار ۴۴-۱۹۴۳ء میں ۵۶ ملین ٹن تھی ۴۶-۱۹۴۵ء میں ۱۵ ملین ٹن ہو گئی۔ کچھ بارش کی کمی کی وجہ سے کچھ طغیانیوں کے باعث یہ مقدار جنگ سے پہلے کے سالانہ اوسط ۵۳ ملین سے بھی بقدر ۲ ملین ٹن کم تھی۔

صنعتی پیداوار کو اگر ۳۹ء میں ۱۰۰ مان لیجئے تو ستمبر ۴۵ء میں ۱۲۹٫۷ تھی، اکتوبر ۴۶ء میں ۱۱۰٫۷ رہ گئی۔ صنعتی کارخانوں میں بجلی کی کھپت اس زمانے میں ۱۹۰٫۶ ملین اکائیوں سے گھٹ کے ۱۴۷٫۵ ملین اکائیاں ہو گئی۔ مختلف مصنوعات میں کمی کا اندازہ ذیل کے اعداد سے ہوگا۔

	۱۹۴۵ء	۱۹۴۶ء
فولاد	۹۲۴,۰۰۰	۸۹۵,۲۰۰ ٹن
سمنٹ	۲,۱۶۰,۰۰۰	۱,۹۵۹,۰۰۰ "
شکر	۹۵۳,۵۰۰	۹۴۴,۸۰۰ "
کاغذ	۱,۶۳۲,۰۰۰	۱,۵۴۸,۰۰۰ ہنڈرڈویٹ
سوتی کپڑا	۴,۱۸۷	۵,۳۰۰ ملین گز

اس کمی کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ جنگ کے زمانے میں آلات اور مشینوں سے بہت کام لیا گیا اور نئی مشینوں کے خریدنے کا موقع نہ تھا۔ اب یہ ٹھیک کام نہیں دیتیں اور نئی مشینیں اب تک دستیاب نہیں ہوتیں۔ پھر کوئلے کی بھی بہت کمی رہی۔ کام کے اوقات ۵۴ سے گھٹا کر ۴۸ کر دیے گئے اور مزدوروں نے غائب ہونا بھی بہت شروع کر دیا ہے۔ صنعتی مزدوروں میں بے چینی اور بے اطمینانی بھی بہت رہی اور صنعتی جھگڑوں میں ۱۹۴۵ء میں ۴ لاکھ کے قریب گھنٹوں کے کام کا نقصان ہوا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں سوا کروڑ گھنٹوں سے زیادہ کا نقصان ہوا۔

تجارت درآمد برآمد میں ایک ۷ سال کے وقفے کے بعد یہ سلسلہ شروع ہوا ہے، اضافہ ہوا اور اگر جہازوں کے ملنے میں دشواری نہ ہوتی تو غالباً اس سے بہت زیادہ اضافہ ہوتا۔ ۱۹۴۵ء میں ۲۳۹,۹ کروڑ روپے کا مال باہر گیا تھا، ۱۹۴۶ء میں ۲۹۷,۳ کروڑ کا۔ ۱۹۴۵ء میں ۲۳۶,۹ کروڑ کا مال ملک میں باہر سے آیا تھا، ۱۹۴۶ء میں ۲۶۲,۳ کروڑ کا۔ البتہ ان اعداد سے اضافے کا جو اندازہ ہوتا ہے اس میں یہ خیال ضرور رہنا چاہیے کہ مال کی قیمت بہت چڑھی ہوئی ہے اس لئے قیمتوں سے مقدار مال کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔

مال کی کمی اور نقد کی فراوانی نے قیمتوں کو جو جنگ کے آخر میں کچھ ایک جگہ قائم سی ہو گئی تھیں اور بھی اوپر چڑھا دیا ہے۔ اگست ۱۹۳۹ء کی قیمتوں کو ۱۰۰ مان لیا جائے تو ستمبر ۱۹۴۵ء میں قیمتیں [illegible] تھیں اور فروری ۱۹۴۷ء میں اور چڑھ کر ۲۰۹,۲ ہو گئیں۔ اس سے عام لوگوں کے معیارِ زندگی پر

جو اثر پڑ رہا ہے وہ ظاہر ہے لوگ امید لگائے بیٹھے تھے کہ جنگ ختم ہو تو روزمرہ کی ضرورتوں کی چیزیں ذرا سستی ہوں مگر ابھی تو قیمتیں بڑھ ہی رہی ہیں !

---

(۲)

ہندوستان کا جو حال اوپر بیان ہوا اس کی ایک گہری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس ملک میں نفع طلبی کی آزاد ذہنیت اور مفاد جماعتی کے لئے دولت پیدا کرنے والی پابند منظم معیشت کے تصورات کی ایک کشمکش ہو رہی ہے اور اس کشمکش میں یکسوئی چونکہ حاصل نہیں اس لئے نہ ایک کے پورے فائدے ہمیں حاصل ہیں نہ دوسرے کے۔ سرمایہ دار، جو پچھلی جنگ کے تجربوں اور غیر معمولی اور بسا اوقات غیر قانونی منافعے کے زور پر معیشت ہی نہیں سیاست پر بھی چھا جانے کے منصوبے بنا رہا تھا، نئے اور روز بدلتے ہوئے حالات میں ذرا متوحش سا ہے۔ آئے دن کوئی سر پھرا تقریر کر دیتا ہے کہ سرمایہ داری نظام مٹا دیا جائے گا، معتدل مزاج والے بھی صنعت کو قومیانے کی باتیں تو کرتے ہی ہیں، بجٹ کی تجویزوں میں اسے اپنے حریفوں کے گہرے منصوبے دکھائی دیتے ہیں اور اگرچہ شور مچا کر یہ اس سیاسی جماعت کو اپنا ہمنوا بنا لیتا ہے جو نصف صدی سے غریبوں کی بہبود کا راگ گا رہی ہے اور ان کے ڈر سے ان تجویزوں کی مضرت کو اپنے لئے کم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن دلجمعی اسے حاصل نہیں۔ قدم قدم پر خطرے دکھائی دیتے ہیں اور دل کھول کر یہ وہ نہیں کر سکتا جو کرنا چاہتا ہے۔ اُدھر قومی صنعت، قومی زراعت، قومی کاروبار زر، اشتراکیت، الفاظ کے چکر سے نکل کر عمل کے میدان میں کیسے آئیں، سکیمیں بنانے والے راتوں رات کام کرنے والے کیسے ہو جائیں، سیکھے ہوئے آدمی کہاں ہیں جو ان بڑے منصوبوں کو چلانے کے لئے درکار ہیں؟ یہ اپنی تقریروں سے سرمایہ داروں کو بھڑکا سکتے ہیں، خود ایک منظم معیشت اور جماعتی ضرورت کے لئے دولت آفرینی کے نظام کو قائم کرنے سے قاصر ہیں، اس دور میں ایک بدلتے ہوئے ملک کی معیشت کیسے آگے قدم بڑھائے۔

---

(۳)

انگلستان جو سرمایہ داری کے پورے دورسے گذر چکا ہے اور اب اس اندھی گلی کے سرے پر پہنچ گیا ہے، اپنی معیشت کو تو میانے کی راہ پر قدم آگے بڑھا رہا ہے اور بغیر ایک خونی انقلاب کی تمہید کے اس مرحلہ کو طے کرنے کی تدبیریں کر رہا ہے۔ وہاں کی حکومت اس راستے پر چلنے کا تہیہ کر چکی ہے۔ مگر وہاں کے اہلِ فکر میں ابھی بہت سے ہیں جو "کھلی معیشت" کے حامی ہیں۔ حال میں رائل انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیرس نے پروفیسر فشر کی ایک کتاب شائع کی ہے: *International Implications of Full Employment in Great Britain* جس میں انھوں نے "کھلی معیشت" کی پرزور تائید کی ہے اور بغیر ترجیح و تامین اور مختلف علاقوں اور ملکوں میں باہمی سمجھوتے کے بغیر آزاد تجارت کے پرانے نظریے کو مدلل طور پر پیش کیا ہے۔ انگلستان کا معاشی مسئلہ تو صاف ہے اور اس پر لوگوں میں اختلاف نہیں۔ مسئلہ یہ ہے اپنی ضرورت کی بعض لابد چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے اپنا کافی مال باہر بھیجا جائے۔ دولت آفرینی میں کارکردگی پر اور منڈی کی حالت سے جلد مطابقت کرنے کی صلاحیت پر اس مسئلے کا حل منحصر ہے سکے کی قیمت گرا کر زیادہ کام اس کے حل میں نہیں چل سکتا۔ امریکہ کی آنکھ بھی تکنی ہے اور بین الاقوامی تجارت کے عام فروغ سے اپنی مشکل کو دور کرتا ہے۔ پروفیسر فشر یہ بتاتے ہیں کہ یہ "کھلی معیشت" میں ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ اس کے ثابت کرنے میں غالباً کامیاب نہیں ہوئے ہیں کہ اگر سب حالات موافق بھی رہے اور امریکہ میں کچھ عرصے بعد کساد بازاری کی پھیلانے والی سموم بھی نہ چلی تب بھی انگلستان اس "کھلی معیشت" میں اپنی درآمد اور برآمد کا منہ کیسے ملا سکے گا۔ اور اگر دنیا میں خوشحالی کا دور دورہ زیادہ دن رہا اور امریکہ میں کساد بازاری شروع ہوگئی جیسا کہ ظن غالب ہے کہ ہوگی تو پھر انگلستان کا کیا حشر ہوگا؟ غالباً بغیر مرکزی تنظیم اور پابندی کے یہ مہم سر نہ ہوگی۔ ہمارے ملک میں جہاں کھلی اور پابند معیشت کی چھپی ہوئی کشمکش معاشی ترقی کا راستہ روکے کھڑی ہے ابھی موافقت اور مخالفت میں اس قسم کا ذہنی کام میں بھی کسی اونچی سطح پر نہیں ہو رہا ہے جس سے مسئلے کے پہلو روشن ہوں اور عمل کے لئے راہیں کھلیں۔

سیاسی دنیا

ماسکو میں برطانیہ، فرانس، متحدہ ریاستوں اور روس کے خارجی وزیروں کی جو کانفرنس ہو رہی تھی وہ قریب ڈیڑھ مہینے تک جرمنی اور آسٹریا کے معاملات پر غور کرنے کے بعد کوئی فیصلہ نہ کر سکی، لیکن مسٹر بیون اور جنرل مارشل دونوں نے اصرار کے ساتھ کہا کہ کانفرنس ناکامیاب نہیں ہوئی۔ سیاسی بحثوں میں کامیابی کا کوئی الگ معیار نہیں ہے۔ کاروباری گفتگو میں بھی بہت مفید سمجھا جاتا ہے کہ ایک فریق کا اصل منشا دوسرے کو معلوم ہو جائے، کیونکہ اس سے مخالفت یا مقابلہ بند نہ ہو جائے تب بھی بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں اور جو کارروائیاں کی جاتی ہیں وہ سمجھ بوجھ کر کی جاتی ہیں۔ مسٹر بیون اور جنرل مارشل نے ایک طرف یہ کہا کہ ماسکو کانفرنس ناکامیاب نہیں ہوئی ہے تو دوسری طرف انھوں نے اختلاف پر بھی روشنی ڈالی، اور یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہوگا کہ کانفرنس کی کامیابی سے ان کا مطلب یہ تھا کہ انھیں روس کے مطالبے اور مقاصد صحیح صحیح معلوم ہو گئے، اور یہ ایک بہت بڑی بات ہے، کیونکہ روسی اپنے مطالبے کانفرنس میں پیش نہ کر سکتے تو انھیں کسی اور طرح سے ظاہر کرتے اور جمہوری ملکوں کے سیاست دانوں کو سوچنا پڑتا کہ روسی کیا چاہتے ہیں۔

کانفرنس میں روس کے مطالبے منظور نہیں کئے جا سکے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جمہوری اور کمیونسٹ سیاست کی موجودہ مخالفت جاری رہے گی۔ کانگریس نے پریزیڈنٹ ٹرومین کی اس تجویز کو منظور کر لیا ہے کہ یونان اور ترکی کو نقد اور سامان سے مدد پہنچائی جائے، یونان کو اتنا سہارا مل گیا ہے کہ حکومت ان کمیونسٹ جماعتوں کو جو قزاقانہ جنگ کر رہی ہیں قابو میں کرنے کی کارروائی شروع کر دے، ترکی کو دس کروڑ ڈالر دئے جائیں گے اور خیال ہے کہ یہ رقم جنگ کے سامان پر صرف کی جائے گی۔ اس محاذ کی طرف سے کچھ اطمینان ہوا تو آسٹریا اور جرمنی کی طرف توجہ کی جائے گی۔ ابھی تک یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان ملکوں میں جمہوری سیاست کیا طریقہ اختیار کرے گی، برطانیہ اور متحدہ ریاستوں دونوں کا کہنا یہ ہے کہ وہ جرمنوں کے خورد و نوش

کا خرچ ایک نامعلوم مدت تک برداشت نہیں کر سکتے' اور وہ چاہتے ہیں کہ اس کی جلد سے جلد کوئی تدبیر کی جائے کہ جرمن اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں اور اس قابل ہو جائیں کہ جنگ کا جو تاوان انھیں دینا ہے اُسے ادا کر سکیں۔ جرمنی کے جس علاقے میں غلہ پیدا ہوتا ہے وہ روسیوں کے قبضے میں ہے' اور شاید روسیوں کا خیال ہے کہ اگر وہ اس علاقے پر قابض رہے تو برطانیہ اور متحدہ ریاستیں عاجز آکر ان کی شرطیں مان لیں گی۔ قبضہ رکھنے کا بار روسیوں کے لئے بہت ہلکا اور متحدہ ریاستوں اور برطانیہ کے لئے بہت بھاری ہے' مگر روسیوں کا خیال کہ جمہوری ملک جلد سے جلد قبضے کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کے لئے وسطی یورپ میں جمہوریت کے مستقبل کو خطرے میں ڈالیں گے صحیح نہیں۔ اب روسی جتنی ضد کریں گے اتنے ہی زیادہ برطانیہ اور متحدہ ریاستیں جرمنی کی طرف مائل ہوں گی' مغربی جرمنی کی صنعت کو بحال کرنے میں مدد دیں گی' وہاں کی تنظیم میں استقلال پیدا کریں گی اور پھر اس کی کوشش کریں گی کہ جرمنی کے مشرقی اور مغربی حصے اپنی قوت سے متحد ہو جائیں۔ مشرقی جرمنی میں ایک کومیونسٹ پارٹی بن گئی ہے لیکن وہ اس طرح روسی حکومت کے اشاروں پر چلتی ہے کہ اس کے خلوص پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا' اور سوا اس کے کہ روسی پورے جرمنی پر قبضہ کر لیں' جرمنی میں کومیونسٹ پارٹی کی حکومت قائم نہیں ہو سکتی۔ ممکن ہے سال دو سال بعد' یہ دیکھ کر کہ جرمنی کی سیاست ان کے قابو سے نکلی جا رہی ہے روسی بالواسطہ یا براہ راست جرمنی پر قبضہ کرنا چاہیں' جیسے ۱۹۲۳ء میں فرانسیسیوں نے روہر کے علاقے پر قبضہ کیا تھا۔ اس سے جرمنی کو بہت نقصان پہنچ سکتا ہے لیکن روس کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ اسی وجہ سے خیال ہوتا ہے کہ ماسکو کی اس کانفرنس کے بعد اور ملاقاتیں اور بحثیں ہوں گی' اور آخر میں روسی سلامت روی کو جنگ جوئی پر ترجیح دیں گے۔

اس لئے ضروری ہے کہ سلامتی اور جنگ دونوں کا صحیح تصور ذہن میں ہو۔ جہاں یہ نہ ہو وہاں کیا پیش آئے گا؟ ہندوستان کے مسائل اب آہستہ آہستہ ایک بین الاقوامی حیثیت اختیار کر رہے ہیں' اور دنیا کو یہ بھی بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ ہندوستانی فائدے اور نقصان میں تمیز نہیں کر سکتے۔ پہلے جو کانفرنسیں ہوا کرتی تھیں ان سے بھی کم از کم ایک فریق یہ ظاہر کرتا تھا کہ وقت بالکل ضائع نہیں گیا ہے' اب اگر کوئی بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے تو یہ کہ سمجھوتے کی کوشش کرنا فضول ہے۔ پہلے جو بنیادی اختلافات تھے اُن کی

خدمت کو ذاتی تعلقات مفاہمت کی امید، مہذب زندگی کی پابندیاں کچھ ہلکا کر دیتی تھیں، اب سب کے منہ کو خون لگ گیا ہے، وہ اور کسی بات پر راضی ہو جائیں، دوستانہ اتحادِ عمل پر راضی نہ ہوں گے، اور کسی فریق نے ایسے سمجھوتے پر آمادگی ظاہر کی جس میں دوسرے کا بھی کچھ فائدہ ہو تو یہ سمجھا جائے گا کہ اس نے جان و مال کو دشمن کے حوالے کر دیا۔ اس حالت میں ہندوستان کو تقسیم کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر حصے میں آہستہ آہستہ قتل و غارت کے ذریعے وہ آبادی نیست و نابود کر دی جائے گی جس پر دشمن ہونے کا الزام اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لگ گیا ہے۔ قتل و غارت کا اور کوئی مقصد نہ ہوگا سوا اس کے کہ خون کی پیاس بجھائی جائے، اور اسی وجہ سے اس میں کامیابی ہوئی تو وہ بھی کسی اعتبار سے مفید نہ ہوگی۔

اکثر الفاظ کے کئی معنی ہوتے ہیں، اور انھیں عبارت سے الگ کرکے صرف ان کے مختلف معنی ہی دیکھے جائیں تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کے کوئی معنی ہی نہیں۔ ہندوستان میں اب تک آزادی کے معنی یہ تھے کہ برطانیہ کے اقتدار کے بجائے ملک میں ہندوستانیوں کی اپنی حکومت ہو۔ برطانوی حکومت نے اپنے اختیارات سے دست بردار ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تو آزادی کے معنی یہ ہو گئے کہ ہر جماعت اپنے مخالفوں کو رستے سے ہٹائے، اور اس کی تدبیر پر مصلحت، سلامت روی اور اخلاق کی کوئی پابندی نہ ہو۔ معلوم نہیں اس لحاظ سے آزادی حاصل کرنے میں کتنی مدت لگے اور اس دوران میں اور کیسے کیسے انقلاب ہوں۔ یہ تو یقینی ہے کہ اس دوران میں تنظیم اور اصلاح کے کوئی بڑے منصوبے کامیاب نہ ہوں گے، اگر کچھ فروغ ہو سکتا ہے تو سرمایہ داری کو، اس لئے کہ وہ اپنے مقاصد لوگوں کو ملا کر بھی حاصل کر سکتی ہے اور انھیں لڑا کر بھی، انھیں کھلا کر بھی اور بھوکا رکھ کر بھی۔ ممکن ہے جب ہندوستانیوں کو دوسری قسم کی آزادی حاصل ہو جائے، یعنی انھیں اپنوں میں کوئی ایسا نظر نہ آئے جسے وہ غیر کہہ سکیں اور جس کی جان اور عزت کو آزادی کے خونی دیوتا پر قربان کرنے کا فرض باقی رہ گیا ہو، تو وہ محسوس کریں کہ آزادی کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ ملک کی صحیح معاشی تنظیم کی جائے اور لوگوں کو صنعت اور تہذیب کے کاموں میں اس طرح لگا دیا جائے کہ وہ سب کے فائدے کو دیکھیں، کسی کو نقصان پہنچانے کے درپے نہ ہو جائیں۔

محمد مجیب

ترقی پسند ادب کے تین دلکش نمونے

زعفران کے پھول: از خواجہ احمد عباسی۔ بہت سے افسانہ نگار زندگی کے گرد منڈلا رہے تھے۔ عین اسی وقت عباس خاموشی سے اُٹھا اور ٹھوس حقیقتوں پر ٹوٹ پڑا۔ کسی نے کہا وہ اخبار نویس ہے، کسی نے کہا ڈھنڈورچی ہے، زندگی نے کہا میرا نباض ہے۔ "زعفران کے پھول" عباس کی تین کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں اُس کا فن پورے شباب پر ہے۔ اس مجموعے کی تینوں کہانیاں شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ قیمت اڑھائی روپے ۲/۸

آخرِ شب: از کیفی اعظمی۔ کیفی اردو شاعری کا "سرخ پھول" ہے اور "آخرِ شب" اس کی تازہ ترین نظموں کا مہکتا گلدستہ۔ کیفی کی انقلابی نظمیں ہندوستان کے کونے کونے میں مشہور ہیں۔ اس کے ہر ہر شعر میں مزدور اور کسان کا دل دھڑکتا ہے۔ "آخرِ شب" میں کیفی نے ڈھلتی ہوئی رات کا کرب اور طلوع ہوتی ہوئی صبح کا نشاط بھر دیا ہے۔ یہ مجموعہ ترقی پسند شاعری کے جلال و جمال کا آئینہ ہے۔ قیمت تین روپے ۳/-

نئی دنیا کو سلام: از سردار علی جعفری۔ سردار جعفری انسانی عظمت کا شاعر ہے۔ وہ خوبصورت، شان دار اور بھرپور زندگی کے گیت گاتا ہے۔ جعفری کی فکر کسی ایک نقطے پر مرکوز ہو کر نہیں رہ سکتی۔ اس کا فن کسی دائرے میں مقید نہیں رہ سکتا۔ اس مرتبہ اس نے ادبی دنیا کے سامنے ایک نیا شعری تجربہ، ایک نیا انقلابی تحفہ پیش کیا ہے۔ "نئی دنیا کو سلام" طویل تمثیلی نظم ہے۔ یہ نظم تاریخ کا نیا تصور، زندگی اور سماج کی نئی تفسیر، انسانی عظمت کا نیا اشارہ، آزادی اور انقلاب کی نئی نوید [illegible]ت اور آرٹ کا حسین امتزاج ہے۔ اس کے ساتھ مشہور مثنوی "جمہور" بھی شامل ہے۔ قیمت [illegible] روپے ۳/-

ملنے کا پتہ: کتب پبلشرز، ونڈی ہال لین، کولابا، بمبئی

جدید مطبوعات مکتبۂ سلطانی

امیر پاکستان سوانح حیات شاہ ولی - قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح کی تاریخ پیدائش ۱۹۰۶ء سے
کانگریس کے مسلمانوں کے ساتھ رویہ کی مفصل وضاحت۔ قیمت عہ روپے

ولیم فرگوسن کا فیصلہ - ۲۰ مئی ۱۹۴۶ء کا ابتدائی کیبنٹ مشن کا فیصلہ جس کی ہیئت مسلم ہے بالتشریح
اس مطالعہ درج ہے قیمت ۸/

منزل پاکستان - ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء سے ۳۱ دسمبر ۱۹۴۶ء تک کے آل انڈیا مسلم اور قائد اعظم
محمد علی جناح کی پاکستان کے حصول میں سرگرم جدوجہد کو نہایت اختصار کے ساتھ بڑی عمدگی و خوبی کے
ساتھ پیش کیا گیا۔ قیمت ۶/

مسلم لیگ کیوں ہے؟ - تاریخ مسلم لیگ اس کے اغراض و مقاصد اور معقول مطالبات کے علاوہ
اس کی جدوجہد اور شاندار نتائج کی مبسوط تاریخ نہایت دلکش انداز میں۔ قیمت

ہمارا پاکستان - مسلمانان ہند کے محبوب نصب العین پاکستان پر نہایت سیر حاصل مدلل بحث کی گئی
رنگین و مہذب ٹائٹل کی ضخیم کتاب۔ قیمت

بیش بہا ادبی جواہر پارے

انجم کدہ - دور حاضر کے اساتذہ اور مشاہیر شعراء کا بہترین منتخب کلام۔ نظم و غزل مع مختصر حالات زندگی
و فوٹو وغیرہ کے۔ قیمت عہ

بیل بوٹے - چراغ حسن حسرت مضامین کا نایاب مرتبہ اور ملک کے افسانوں کا بہترین مجموعہ۔ قیمت عہ

پہلا پیار - مسٹر ظہیر الحق صاحب ایم اے کے افسانوں کا نادر مجموعہ۔ قیمت عہ

مالی باتیں - مولانا عبدالستار حیدر صاحب نیر کے افسانوں کا قیمتی مجموعہ۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ

سلطان حسین تاجر کتب ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی

طابع و ناشر پروفیسر محمد مجیب بی۔اے (آکسن)، دیال پرنٹنگ پریس دہلی

مکتبہ جامعہ دہلی

ہم کیسے پڑھائیں؟

اردو میں [illegible] کتابوں کی [illegible] بہت [illegible] ایم-اے، بی-ٹی نے یہ کتاب لکھ کر وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ اساتذہ کے لیے یہ کتاب بہترین نمونہ ہے۔

قیمت [illegible]

تعلیمی خطبات۔ یہ کتاب جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی ہے۔ چند نہایت اہم تعلیمی تقریروں کا مجموعہ ہے۔ تعلیمی مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک بیش بہا تحفہ ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ ایک معیاری چیز ہے۔ قیمت قسم اول [illegible]، قسم دوم [illegible]

تلاشِ ہند۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی تازہ تصنیف Discovery of India کا اردو ترجمہ۔ یہ کتاب پنڈت جی نے ۱۹۴۴ء کے زمانۂ قید میں لکھی ہے۔ زمانۂ قدیم سے لے کر زمانۂ حال تک کی ہندوستان کی معاشرتی اور سیاسی تاریخ۔ قیمت مکمل دو حصے [illegible]

میری کہانی۔ پنڈت جواہر لال کی آپ بیتی۔ یہ کتاب عرصے سے ختم تھی۔ اس کا تازہ ایڈیشن ابھی ابھی چھپ کر آیا ہے۔ قیمت مکمل دو حصے [illegible]

تلاشِ حق۔ مہاتما گاندھی کی آپ بیتی۔ ترجمہ از ڈاکٹر سید عابد حسین۔ قیمت مکمل دو حصے [illegible]

ارتقائی اشتراکیت۔ پروفیسر جوڈ کی کتاب "موڈرن پولیٹیکل تھیوری" کا اردو ترجمہ از برکت علی فراق۔ اس کتاب میں کمیونزم، انارکزم، سوشلزم وغیرہ کی عالمانہ تحلیل کی گئی ہے اور بتایا ہے کہ کونسی شکل زیادہ قابلِ عمل ہے۔ قیمت مجلد [illegible]

ہندوستانی قومیت۔ ڈاکٹر سید عابد حسین کی ایک معرکۃ الآرا تصنیف، قومیت کے مسئلے کو وقتی سیاست اور عارضی مصلحت کی سطح سے بلند ہو کر علمی سطح پر حل کرنے کی پہلی کوشش، ہند تہذیب، اسلامی تہذیب اور جدید مغربی تہذیب کا جائزہ، مشترک قومیت اور مشترک تہذیب پر بے لاگ تنقیدی بحث۔ قیمت مکمل تین حصے [illegible]

مکتبہ جامعہ

دہلی، لکھنؤ، بمبئی

جامعہ

زیرِ ادارت ڈاکٹر سید عابد حسین، ایم اے۔ پی ایچ ڈی

جلد ۴۴ نمبر ۵ | بابت ماہ [redacted] | سالانہ چندہ ... فی پرچہ ...

فہرست مضامین

(طابع و ناشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) دیال پرنٹنگ پریس دہلی)

اقبال کا ابلیس

ریڈیو والوں کی فرمائش تھی کہ میں "اقبال کے ابلیس" کے بارے میں ایک تقریر کروں اور میری ان بزرگ سے ذرا سرسری ملاقات ہے۔ اس لئے فرمائش کی تعمیل مشکل معلوم ہوتی تھی۔ رات کے وقت میں اسی سوچ میں تھا کہ غالباً آنکھ لگ گئی، اور جب خواب ہی میں آنکھ کھلی تو ڈاکٹر اقبال کی لاہور والی کوٹھی تھی۔ وہ اپنے برآمدے میں ایک پرانے سے مونڈھے پر بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے تھے اور اتفاق سے کوئی اور شخص موجود نہ تھا۔ میں داخل ہوا تو انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں فرمایا "آیئے سیّدین صاحب (وہ اپنے چھوٹوں سے اسی طرح مخاطب ہوتے تھے) کہئے خیریت تو ہے؟" میں نے عرض کیا "جی ہاں، خیریت تو ہے لیکن ایک مشکل میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ ایک کمزوری کے لمحے میں ایک ایسے مضمون پر تقریر کرنے کا وعدہ کر لیا ہے جس کے متعلق اوّل تو کافی واقفیت کا دعویٰ کر نہیں سکتا اور اگر کروں بھی تو خطرناک ہے۔" چہرے پر ہلکا سا تبسم آیا اور پوچھا "یعنی"؟ میں نے کہا "اقبال کا ابلیس"۔ خوب ہنسے۔ کہنے لگے "مضمون تو کسی کو اچھا سوجھا ہے۔ مگر تقریر کہاں کرنی ہے؟" عرض کیا "ریڈیو پر"۔ یہ سن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے پھر بولے "یہ ریڈیو والے بھی بڑے بے ڈھب لوگ ہیں، نہ زمین والوں کو چھوڑتے ہیں نہ آسمان والوں کو"۔ میں نے موقع کو غنیمت جان کر پوچھا "ابلیس کا شمار آپ کون سے گروہ میں کرتے ہیں۔ زمین والوں میں یا آسمان والوں میں"؟ کہنے لگے "زمین والوں میں۔ اگر آسمان والوں میں سے ہوتا تو وہاں کے لطف، سکون اور بیکاری کو چھوڑ کر اس شورش اور ہنگاموں سے بھری ہوئی دنیا میں کیوں آتا؟ اس کی تو فطرت کا تقاضا ہی یہ تھا کہ وہ فرش کو عرش پر ترجیح دے۔" میں نے قطع کلام کر کے کہا کہ آپ اس بارے میں اس کی فطرت کو کیوں ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ اس نے حکمِ الٰہی کی نافرمانی کی اور مشیتِ الٰہی نے اسے جنت سے نکال

زمین پر پہنچا دیا۔" کہنے لگے "بھئی تم نے تو پریس والوں کی طرح مجھ سے انٹرویو کرنا شروع کر دیا۔ میں ابلیس کی شخصیت پر حکم کی حیثیت تھوڑا ہی رکھتا ہوں۔" میں نے عرض کیا "تصنیف کو تو مصنف ہی اچھی طرح بیان کر سکتا ہے۔ اس لئے میں نے آپ کی جانب رجوع کیا ہے۔" کہنے لگے "واہ یہ تو تم نے کفر کی بات کہہ دی۔ ابلیس تو مشیت الٰہی کی تصنیف ہے۔ اسے میری طرف کیوں نسبت دیتے ہو؟" میں نے فوراً تعریف کے عنوان کے پیچھے پناہ لے کر کہا "جناب ریڈیو والے اُس ابلیس میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے یا کم سے کم وہ سرکاری طور پر اس دلچسپی کا اعتراف نہیں کرنا چاہتے۔ انھیں تو اس ابلیس سے دلچسپی ہے جو آپ کی شاعری اور آپ کے دماغ کی تخلیق ہے اور جس کا ذکر بار بار آپ کے کلام میں آتا ہے اور مجھے بھی اس وقت اُسی ابلیس سے سروکار ہے۔" ڈاکٹر صاحب ٹھہرے نکتہ نواز۔ اس دلیل کو تو تسلیم کر لیا لیکن یہ عذر پیش کیا کہ "بھئی شاعر بحیثیت شاعر کے کوئی علمی مقالہ پیش نہیں کرتا بلکہ وقتی الہام اور کیفیت کے مطابق جو خیال یا جذبہ یا نکتہ ذہن میں آجاتا ہے اس کو شعر کے قالب میں ڈھال کر بیان کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ وہ اپنے شاعرانہ تخیلات کے متعلق اخباری بیانات دیا کرے۔" میں نے باادب عرض کیا کہ "یہ اصول عام شعرا کے متعلق تو صحیح ہے لیکن چونکہ اقبال میں شعر اور فلسفے کا امتزاج کامل ہے اس لئے اس کا وقتی الہام اور اس کے بدلتے ہوئے موڈ بھی ایک وحدت خیال کے مختلف مظاہر ہیں اور ان سب میں ایک داخلی تعلق اور ہم آہنگی ہے۔" اور پھر میں نے پہلو بدل کر کہا "میں کا کب طلبگار ہوں میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ اپنے تصور ابلیس کے متعلق آپ چند نکتے ارشاد فرمائیں" اور پھر اس خیال سے کہ وہ کوئی اور شاعرانہ عذر نہ پیش کر دیں، میں نے بغیر جواب کا انتظار کئے کہا کہ "جی ہاں میں یہ دریافت کر رہا تھا کہ آپ اس کے نزول کے لئے اس کی فطرت کو کیوں ذمہ دار ٹھہراتے ہیں" ہنس کر کہنے لگے "یہ تو تم ابلیس کی وکالت تقریباً اس کے الفاظ میں کرنے لگے۔ شاید تم نے ضرب کلیم میں ابلیس کی معذرت پڑھی ہو۔

اے خدائے کن فکاں مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر　　تھی مری تقدیر میں زندانی نزدیک و دور
حرف استکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا　　ہاں مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود

مگر میرا خیال یہ ہے کہ ابلیس کو آزادیٔ اختیار حاصل تھی اور اس نے سجدۂ آدم سے انکار کر کے اپنی عظمت اور بلندیٔ فطرت کا ایک ثبوت دیا تھا جسے اس موقع پر بھلا کر اظہارِ عجز کر بیٹھا۔ اس وجہ سے مشیتِ الٰہی نے خود اسے اس بات پر ٹوکا :-

پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے ۔ کہتا ہے تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود!

دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام ۔ ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود!

"یعنی آپ کا مطلب یہ ہے کہ ابلیس کا انکار اور بغاوت اس کے عجز و اطاعت سے افضل ہے یہ تو ذرا سخن گستاخانہ بات ہوئی" "یقیناً" اور وہ مونڈھے پر ذرا آگے کو جھک کر بیٹھ گئے جس سے مجھے خیال ہوا کہ اب وہ گفتگو کے موڈ میں آ گئے ہیں "اس میں کیا شک ہے۔ ابلیس کا جو تصور میں نے پیش کیا ہے اس کا اصل نکتہ ہی یہ ہے۔ لوگ غور نہیں کرتے کہ انسانی زندگی کے ڈراما میں ابلیس کا پارٹ کیا ہے؟ آدم جنت میں سکون اور عیش اور اطاعت و عبادت میں اپنا وقت بسر کر رہے ہیں۔ ان کی زندگی فرشتوں کی زندگی کی طرح محدود اور مجبور تھی۔ اگر مشیتِ الٰہی میں آدم کے لئے یہی زندگی ہوتی تو اس کے لئے فرشتوں کی کیا کمی تھی؟ دراصل تخلیقِ آدم کا منشا اس وقت تک پورا نہ ہو سکتا تھا جب تک آدم اس بے عملی اور آرام طلبی کی جنت سے نکل کر اس رزم گاہِ خیر و شر میں نہ آتے جب تک اُن میں تپش اور جوش و خروش اور بغاوت کا جذبہ پیدا نہ ہوتا، جب تک وہ اس سرور سے لذت آشنا نہ ہوتے جو حق و باطل کی کارزار میں پوشیدہ ہے، جب تک وہ گمان کو یقین پر اور جستجو کو منزل پر ترجیح دینا نہ سیکھتے۔ یہ ابلیس کے انکار کا اعجاز ہے کہ اس نے آدم کو انسان بنا دیا اور اس کی عقل اور دماغ کے سامنے لا انتہا امکانات کھول دئے۔

جبریل ایک دفعہ ابلیس کے منہ آئے تھے اور ناصح مشفق بن کر پوچھ بیٹھے تھے: "کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاک دامن ہو رفو؟" ابلیس نے اس وقت جو دنداں شکن جواب دیا تھا اس سے اس کے کردار اور کام دونوں پر روشنی پڑتی ہے۔ تم جانتے ہو مجھے تو اکثر اپنے اشعار یاد نہیں رہتے لیکن تم نے بالِ جبریل میں ضرور پڑھے ہوں گے۔" جی ہاں مجھے وہ اشعار یاد ہیں اور اگر محض

ابلیس کا تصور کلام میں اس قدر زور اور اثر پیدا کر سکتا ہے تو میں سمجھتا ہوں اس کا شاعری پر بھی بڑا احسان ہے۔

آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے　　کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو
اب یہاں میری گذر ممکن نہیں ممکن نہیں　　کس قدر خاموش ہے یہ عالم بے کاخ و کو
جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات　　اس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لا تقنطوا؟

ابلیس کو "سوزِ درونِ کائنات" کی ہمیشہ فکر رہتی ہے اور اس کے نزدیک اس جہان رنگ و بو کی سب سے بڑی خصوصیت کیا ہے؟ یہی سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو جس کی کشمکش انسان کے دل میں برابر جاری رہتی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس کی نظر میں بخشے ہوئے فردوس نہیں جچتے بلکہ وہ خود اپنی محنت اور کاوش سے اپنے خونِ جگر سے، اپنے عزم اور حوصلہ اور بلند ہمتی سے اپنی جنت تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ ابلیس کے انکار ہی نے انسان کو مجبوری کی پستی سے مختاری کی بلندی پر پہنچایا ہے۔

شعلہ ہا از کشتِ زارِ من دمید　　اُو زِ مجبوری بہ مختاری رسید

جب تک انسان اس کشمکش پیہم میں لگا ہوا ہے اور جرأت کے ساتھ خیر و شر، نیکی و بدی، عبادت و بغاوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے، ابلیس مطمئن ہے لیکن اگر وہ ابلیس کے سامنے بھی فوراً ہتھیار ڈال دے اور آسانی سے اس کے فریب میں آجائے تو وہ صیدِ زبوں ہے جس کی ابلیس کی نظر میں کوئی وقعت نہیں۔ وہ تو خدائے برتر کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ بار الٰہا مجھے جو کچھ عظمت و شہرت حاصل ہوئی وہ تیرے سامنے انکار کی ذمہ داری اٹھا کر اور انسان بھی اسی وقت اپنی فطرت کی بلندی پر پہنچ سکتا ہے جب اس میں میری طرح انکار کرنے کا حوصلہ ہو۔" آپ کے اس ارشاد سے میری ایک مشکل حل ہو گئی میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آپ نے ارمغانِ حجاز میں ابلیس کو خدا کے حضور میں نالہ کرتے ہوئے کیوں پیش کیا ہے۔ جب وہ ایک دفعہ بغاوت کر چکا تو اب اس اظہارِ عقیدت کی کیا ضرورت ہے؟" اس کی ضرورت تو ان اشعار ہی سے واضح ہو جاتی ہے۔ کوئی شعر یا جملہ کہ

میں نے تعمیل کی۔

"اے خداوندِ صواب و ناصواب
من شدم از صحبتِ آدم خراب

خاکش از ذوقِ اِبا بیگانۂ
از شرارِ کبریا بیگانۂ

صید خود صیاد را گوید بگیر
الاماں از بندۂ فرماں پذیر

فطرتِ او خام و عزمِ او ضعیف
تابِ یک ضربم نہ دارد ایں حریف

ابنِ آدم چیست یک مشتِ خس است
مشتِ خس رایک شرر از من بس است

اندریں عالم اگر جز خس نبود
ایں قدر آتش مرا دادن چہ سود"

مجھے ارشاد سے روک دیا اور تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ آنکھوں میں ایک ایسی کیفیت تھی جیسے بہت دور کی کوئی چیز دیکھ رہے ہوں اور چہرے پر حسرت و آرزو کا ایک عجیب امتزاج، پھر ذرا دھیمی آواز میں فرمانے لگے۔

"سید ین صاحب، مجھے ابلیس کی یہی ادا تو پسند ہے کہ وہ رزم کو بزم پر اور جدوجہد کو سکون پر ترجیح دیتا ہے اور اسے سہل انکاری نہ اپنے لئے پسند ہے نہ دوسروں کے لئے۔ وہ انسان کو فقہا کی اصطلاح میں، گمراہ ضرور کرنا چاہتا ہے، بغاوت کا بیج ان کی سرشت میں ضرور بوتا ہے لیکن جب اسے بہت آسانی سے فتح حاصل ہونے لگتی ہے تو وہ اس کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے خدا کی طرف رجوع کرتا ہے۔ وہ شر اور شک کی تخم کاری میں اس قدر خلوص اور جاں فشانی کے ساتھ جدوجہد کرتا ہے کہ اس کے مخالف خیر و برکت اور ایمان و برکت اور ایمان و یقین کے لئے اس قدر تکلیف نہیں اٹھاتے انھیں تو ہر وقت کسی ایسے تعویذ یا دعا یا طلسم کی تلاش رہتی ہے جو ساری مشکلات آسان کر دے جس کی مدد سے خدا سے لے کر روپے تک ہر چیز مل جائے یعنی ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ لیکن میں ایسے آسان راستوں کا، ایسی سہل نجات کا قائل نہیں۔ میں تو انسان کا دلدادہ ہوں جس میں بغاوت کا جوش اور ولولہ ہو، جو اس ناقص گھروندے کو توڑ کر جس میں وہ سسکتی زندگی بسر کر رہا ہے۔ خود ایک نئی دنیا تعمیر کر سکے۔

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

اور جب میں ابلیس کے کردار میں اس برہم زنی کا کمال دیکھتا ہوں تو میں اس کا جبر مقدر کرتا ہوں، کیونکہ جہاں انسان کی فطرت کا ایک پہلو تسلیم و رضا ہے وہاں اس کا دوسرا اثر تخلیق، اظہار خودی اور تعمیر و تخریب کا بھی ہے۔ ابلیس میری نظر میں اُس رخ کی مکمل نمائندگی کرتا ہے۔

فرق نا کردہ ہنوز خیر و شر سے ہنوز صد پیمبر دیدہ و کافر ہنوز

جبینوں میں ہزار ہا سجدوں کا تڑپنا یقیناً قابلِ قدر ہے اور اطاعت گذاری بہت بڑی دولت ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ پیدائش ہی سے گلے میں زنجیر کی طرح نہ پڑی ہوئی ہو بلکہ انسان کفر و انکار گمان اور شک کی آتشین منزلوں میں سے گذر کر اس منزلِ آخر تک پہنچا ہو جس طرح خلیل اللہ نمرود کی آگ کو جھیلنے کے بعد سلامتی اور خنکی میں داخل ہوئے تھے"۔

کس قدر بلند تھا ڈاکٹر صاحب کا یہ نصب العین جس میں ابلیس کا ماضی اور انسان کے مستقبل کے خد و خال صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میں تھوڑی دیر خاموش بیٹھا اس ذہنی تصویر کو دیکھتا رہا۔ اس کے بعد میں نے ہمت کر کے ایک سوال اور پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب، آخر ابلیس میں وہ کونسی خاص صفت تھی جس نے اس کو نہ صرف تمام مخلوق سے مختلف بلکہ فطرت کے ابدی سکون کے لئے ایک خطرہ بنا دیا؟"

"دلچسپ سوال پوچھا تم نے۔ سنو۔ تم انگریزی کی اصطلاح FOOLS PARADISE تو جانتے ہو گے یہ احمقوں کی جنت" کیا چیز ہے؟ بات یہ ہے کہ کم ہمت لوگ کسی چیز سے اس قدر خائف نہیں ہوتے جس قدر علم و آگاہی، فکر و خیال سے، کیونکہ خیال میں تیزاب کی سی صفت ہوتی ہے۔ اس میں عادتیں، خیالات، جذبات، توہمات، تعصبات، عقائد سب گھل جاتے ہیں۔ لوگ اس کو برداشت نہیں کر سکتے کیونکہ وہ اپنی زندگی انھیں نیکیوں کے سہارے بسر کرتے ہیں۔ ان میں اتنی ہمت ہی نہیں ہوتی کہ وہ عقل و فکر کی تیز روشنی کا مقابلہ کر سکیں۔ اس لئے وہ جہالت اور لاعلمی کے سکون و عافیت کو علم کے خطروں اور ہنگاموں پر ترجیح دیتے ہیں۔ برخلاف اس کے ابلیس میں جاننے اور سمجھنے کا

تحقیق تفتیش کا ایک بے پناہ جذبہ تھا۔ اس کی فطرت اس کو سیدھی علم کے شجرِ ممنوعہ کی طرف لے جاتی ہے اور وہ بے خوف ان تمام خطروں کا سامنا کرتا ہے جو اس اقدام کی وجہ سے پیش آسکتے ہیں۔ فرشتوں کی فطرت میں کرید اور جستجو کا مادہ ہی نہ تھا اور آدم اپنے علمِ اسما کی وجہ سے قانع اور مطمئن تھے لیکن ابلیس کی مثال اور ترغیب نے ان پر اس حقیقت کو فاش کیا کہ علم یعنی حدبندی سے آزاد ہے اور فکر و خیال پر کسی قسم کی پابندی لگانا انسانی ارتقا کے امکانات کو محدود کرتا ہے۔ اگر ابلیس علم حاصل کرنے کا جذبہ انسان میں بیدار نہ کرتا تو آج انسان تہذیب کے ابتدائی دور میں ہوتا اور ابر و باد، برق و باراں کی قوتیں اس کی غلام نہ ہوتیں۔ اسی وجہ سے وہ مبارز طلبی کے انداز میں جبریل سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو

میں نے امید سے زیادہ پالیا تھا۔ اجازت لے کر رخصت ہونے لگا تو ہنس کر کہنے لگے "یعنی میری رائے تو نہیں ہے کہ تم اس بارے میں ریڈیو پر تقریر کرو، کیونکہ ریڈیو زمان و مکان کا احترام نہیں کرتا اور زمین و آسمان میں فرق نہیں کرتا اور معلوم نہیں تقریر کو ابلیس کے علاوہ اور کون کون سُنے رائے صاحب بھی۔ لہٰذا میں نے طے کر لیا کہ میں اس موضوع پر خود کوئی تقریر نہیں کروں گا بلکہ محض اس گفتگو کا ذکر آپ کو سنا دوں گا اور بس۔

غلام السیدین

جامعہ اسلامیہ علمیہ کا نظامِ تعلیم

علامہ موسیٰ جاراللہ مشہور ترکی عالم کئی برس سے ہندوستان میں مقیم ہیں۔ اُردو داں حضرات شاید علامہ موصوف کی علمی عظمت سے زیادہ واقف نہیں، کیونکہ ان کی کوئی تصنیف اب تک اردو میں شائع نہیں ہوسکی۔ لیکن ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا میں موصوف کو ایک عرصۂ دراز سے علمی حلقوں میں بڑا بلند مقام حاصل ہے۔ آپ ترکی، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں لکھتے ہیں اور ان زبانوں میں آپ کی درجنوں تصانیف شائع ہوچکی ہیں۔ علامہ اقبال مرحوم کی زندگی میں شیعہ سُنّی نزاع پر صاحب موصوف کی فارسی میں ایک کتاب چھپی تھی۔ مرحوم ہر شخص سے جو اُن سے ملنے آتا اس کتاب کا ذکر کرتے اور فرماتے کہ اس موضوع پر میں نے اس سے بہتر آج تک کوئی کتاب نہیں دیکھی۔ مولانا عبیداللہ صاحب سندھی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ معارف قرآن پر علامہ موسیٰ جاراللہ سے بڑا اب تک میں نے کوئی عالم نہیں دیکھا۔ مصر میں علامہ موصوف کا بہت زیادہ چرچا ہے، اور قرآنی علوم پر تحقیقات کرنے والوں کے لئے آپ کی کتابیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ روسی اور ایشیائی ترکوں کے تو آپ اوام ہیں ہی، بالشویک انقلاب سے قبل آپ نے ترکوں میں علمی و دینی بیداری پیدا کرنے کے لئے بڑی جدوجہد کی تھی۔ انقلاب کے ابتدائی زمانے میں آپ زارشاہی کے مخالفوں میں سے تھے، لیکن لینن کے بعد روس کے اربابِ اقتدار سے موصوف کی نبھ نہ سکی اور انھیں وطن کو خیرباد کہنا پڑا۔ موصوف کبھی کبھار جامعہ میں بھی تشریف لاتے ہیں اور اس سلسلے میں طالب علموں کو اُن سے استفادہ کا موقع ملتا رہتا ہے۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب سے علامہ موصوف کا خصوصی تعلق ہے۔ گزشتہ نومبر

میں جب جامعہ کی پچیس سالہ جوبلی منائی گئی تو "جامعہ اسلامیہ علیہ کا مجوزہ نظام" کے نام سے موصوف نے عربی میں ایک رسالہ بمبئی سے چھپوا کر اس تقریب کے سلسلے میں جناب ڈاکٹر صاحب کو بھیجا تھا۔

ان دنوں عربی مدارس کے نصاب کی اصلاح کے سوال پر مشورے ہو رہے ہیں اور کچھ عرصہ ہوا مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں اس کام کے لیے لکھنؤ میں علمائے کرام کا اجتماع بھی ہو چکا ہے۔ علامہ جار اللہ نے اس رسالے میں اسی مسئلے پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ موصوف علمی و تعلیمی کاموں کا بڑا تجربہ رکھتے ہیں اور اس ضمن میں ہجرت سے پہلے اپنے وطن میں تعلیمی اصلاح کا کام بھی کر چکے ہیں، اس لیے آپ کے خیالات خاص طور پر ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔ اس رسالے میں علامہ موصوف نے "جامعہ اسلامیہ علمیہ" کے مجوزہ نظام کا مختصراً تعارف کرایا ہے امید ہے کہ قارئین کرام کے لئے زیادہ بار نہ ہوگا اگر ہم پورے رسالے کا اردو ترجمہ ان کے سامنے پیش کریں۔

علامہ موصوف فرماتے ہیں :-

ایک زمانے سے ہماری یہ آرزو تھی کہ ایک ایسا اسلامی دارالعلوم قائم کیا جائے، جس میں ایک طرف اسلامی علوم کی درجۂ کمال تک تعلیم ہو اور دوسری طرف آج کی متمدن دنیا کے سرکاری مدارس میں اعلیٰ ثانوی جماعتوں میں جو علوم و فنون پڑھائے جاتے ہیں، ان کی بھی اس میں تعلیم کا انتظام ہو۔ یہ آرزو اُس زمانے میں جب کہ میں ابھی طالب علمی کے دور سے گذر رہا تھا، میرے دل میں جاگزیں ہوئی۔ یہ ۱۸۹۸ء کا ذکر ہے، میں نے ۱۸۹۸ء سے لے کر ۱۹۰۴ء تک اس غرض سے دنیائے اسلام کی سیاحت کی تھی کہ اسلامی ممالک کے مرکزی شہروں میں جو شرعی عدالتیں قائم تھیں، اُن کے نظام کو دیکھوں اور ان کے دینی مدارس میں جو تعلیم ہوتی تھی، اس کے نصاب اور مدارس کے نظام کار کا مطالعہ کروں۔ اپنی سیاحت کے ان سات سالوں میں میں نے ممالکِ اسلامی کے اکثر پایۂ تختوں کی زیارت

کی اور اس ضمن میں وہاں کی شرعی عدالتوں اور دینی مدرسوں کے نظام کار اور نصابِ تعلیم میں سے جو کچھ بھی دیکھنا چاہتا تھا میں نے اچھی طرح سے دیکھ لیا اور دینی مدارس کے نظامِ تعلیم اور نصابِ علوم کو خوب جان لیا۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے اُس وقت ہی یہ طرزِ تعلیم پسند نہ آیا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ عالمِ اسلام اس کو قائم رکھے۔ میں نے اُس وقت ہی دیکھ لیا تھا کہ شرعی عدالتوں کا نظام جس طرح مفتیوں کے فتووں اور اُن کی الگ الگ خواہشات کے پیچھے چل رہا ہے، وہ اکثر معاملات میں باطل ہے اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کے دلوں میں شریعت کا مطلق کوئی احترام نہیں رہا۔ اور اسی طرح مجھے اس وقت اس بات کا بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ممالک اسلامیہ میں یہ جو دینی مدارس ہیں، ان کا نظام اور نصابِ تعلیم مسلمانوں کی ضرورتوں کے مطابق نہیں ہے اور اس سے نہ تو ان کی دینی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اور نہ دنیوی۔ اور اس معاملے میں میں نے دیکھا کہ منوبی ترکستان کی سب سے خراب حالت ہے، شرعی عدالتوں اور مدارسِ دینی دونوں کے اعتبار سے اور اُن کے ہاں زندگی کے اہم مسائل میں شرم آمیز حیلے مروج ہیں جن کا نام انھوں نے شرعی حیلے رکھ چھوڑا ہے اور اس طرح وہ اسلام کو اُس کے اساس ہی سے ختم کر رہے ہیں۔

یہ اور اسی طرح کی اور چیزوں کو دیکھ کر میں نے اُس وقت اس بات کو سمجھ لیا تھا کہ یہی وہ ذرائع ہیں جن کی وجہ سے ممالکِ اسلامیہ کے اندرونی معاملات میں اجنبی سیاست کو مداخلت کرنے کے مواقع مل رہے ہیں۔ چنانچہ اِسی بنا پر مصر میں شرعی عدالتوں کی بجائے مخلوط عدالتیں قائم کی گئیں اور خلافتِ عثمانیہ کے اسلامی نظامِ عدالت پر تنظیماتِ خیریہ کے نام سے بندشیں عائد ہوئیں، اور جہاں تک افغانستان اور ایران کی سلطنتوں کا تعلق ہے میں نے دیکھا کہ اُن کے پاس نہ تو قوت باقی ہے اور نہ شریعتِ اسلام اور نہ قرآنِ کریم کا احترام، نہ وہاں کے لوگوں کے دلوں میں، اور نہ حکومت ہی کی نظر میں، اور اگر ہے تو محض نام کے [illegible] دل بہلانے اور دھوکا دینے کے لئے، اور میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس [illegible] جو حشر

خلافتِ عثمانیہ اور مصر کا ہوا، چار و نا چار یہ دو سلطنتیں بھی اُنھی کی راہ پر چلنے لگیں۔ میرے نزدیک اس تباہی کا سب سے بڑا سبب شرعی عدالتوں اور دینی مدرسوں کی زبوں حالی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ قوم کی ترقی او تنزل کا انحصار اُس کی عدالتوں اور اُس کے مدارس اور مکاتب پر ہوتا ہے۔

۱۹۰۴ء کے آخر میں میں نے اپنی سیاحت ختم کی اور پیٹرز برگ کو اپنا مرکز بنایا اور ۱۹۰۵ء کے اوائل میں سب سے پہلی کتاب جو میں نے مرتب کی تھی اس کو وہاں سے شائع کیا۔ اور جو کچھ میں نے اسلامی ممالک کے مدارس میں دیکھا تھا مجملًا اُس میں جمع کر دیا۔ شاید سرخیلِ شعرائے اسلام ڈاکٹر سر محمد اقبال نے ممالکِ اسلامیہ کے مدارس کے متعلق میرے جو مشاہدات تھے ان کو دیکھ کر ہی شعر کے دل آویز پیرایے میں فرمایا تھا ؎

با یں مکتب باین دانش چہ نازی
کہ ناں برکف ندا دو جاں زتن بُرد

یہ ہے خلاصہ اُس وقت کے عالمِ اسلام کی بُری حالت کا جو میں نے اپنی سیاحت میں دیکھی۔ بے شک یہ سخت تنقید تھی لیکن اس میں جاں بر ہونے کی تدبیر بھی تھی اور اس کے بغیر دینِ حق کا ظہور اور متمدن دنیا میں ہدایت اسلام کا فروغ بھی ممکن نہ تھا جس طرح کہ کبھی عہدِ رسالت اور خلافتِ راشدہ کے زمانے میں اسے میسر تھا۔

مجھے جو کچھ کہنا تھا میں نے کہا۔ اس کے بعد وہ مشہور حادثہ رونما ہوا۔ ترکستان، ترکی اور روس میں جو انقلاب آیا جس میں نہ تو شرعی عدالتیں بچیں اور نہ مکاتب اور دینی مدرسے اور یہ سب کے سب اپنے ہی اجتماعی اور سیاسی گناہوں کے ملبوں کے نیچے اس طرح دفن ہوئے کہ نہ تو آسمان نے ان پر آنسو بہائے اور نہ وہاں کے رہنے والوں میں سے کسی کی آنکھ اُن کی اس تباہی سے تر ہوئی۔

یہ جو کچھ ہوا ہوا، جس طرح ثمود تباہ ہوئے اُسی طرح مدین بھی تباہ ہوا۔" یاد رہے کہ ان شرعی عدالتوں اور دینی مدرسوں کو کسی باہر کی قوت نے تباہ نہیں کیا تھا۔ یہ تو صدیوں سے

پہلے ہی اس ٹوٹی پھوٹی حالت میں تھے لیکن جب انقلاب کے ہولناک شعلے بھڑکے تو اس وقت جاکر لوگوں کو اُن کی اس ٹوٹی پھوٹی حالت کا پتہ چلا یعنی موت تو کئی صدی پہلے ہی ان کو آچکی تھی مگر اہلِ غفلت کو اس وقت معلوم ہوا کہ جب انقلاب کے گھن نے اُن کے سہارے کو کھالیا اور وہ دھڑسے زمین پر آرہے۔ اُس وقت غافلوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ کاش وہ اس حقیقت کو پہلے سے جانتے تو اتنے عرصے تک اس گمراہی میں مبتلا نہ رہتے۔

یہ سب مصائب اور تباہیاں آج ہم پر گزر چکی ہیں اور ہندوستان والو! کل یا پرسوں تمہارے مدارس کی باری ہے۔ ہم سے عبرت حاصل کرو اور قرآن مجید کے الفاظ میں "وَمَا قَوم لُوطٍ منکم ببعید" یعنی ہماری حالت تم سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

خدا کے فضل سے ہندوستان میں دینی مدارس کی کمی نہیں، کوئی سینکڑوں اور ہزاروں ہی تو ہیں اور سب مدارس کا نظامِ تعلیم اور ان کے علوم کا نصاب بھی کم و بیش ایک ہی سا ہے۔ اور اس وقت ان کی جو حالت ہے پہلے سے کہیں زیادہ بُری ہے۔ نیز دینی مدارس اور نئی یونیورسٹیوں میں زمین آسمان کا فرق پیدا ہوگیا ہے اور ان دینی مدارس کے جو چلانے والے اور ان میں جو پڑھانے والے ہیں وہ ایسی غفلت میں پڑے ہوئے ہیں کہ اُنھیں کچھ ہوش نہیں۔ وہ مدارس کی زبوں حالی کو دیکھتے ہیں اور اُنھیں اس کی خبر نہیں ہوتی۔ ان کے دماغوں اور ان کی عقلوں میں خواب کی سی مدہوشی ہے اور اُن کے سینوں میں طرح طرح کی آرزوئیں پل رہی ہیں۔ وہ اس زمین پر رہتے ہوئے آسمانوں پر کرسی بچھائے بیٹھے ہیں اور چاہتے ہیں کہ زمین پر ربانی اور الٰہی حکومتیں قائم کریں جن کے وہ امیر اور خلیفہ ہیں لیکن اس کی نہ تو انھوں نے کوئی تیاری کی ہے اور نہ ان میں اس بلند خیالی کی استعداد ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جو شخص قبل از وقت کسی چیز کو حاصل کرنے کے لئے عجلت کرتا ہے، وہ ہمیشہ اس سے محروم رہتا ہے۔

اپنے وطن کے زمانۂ قیام کے دوران میں جب میں نے دیکھا کہ تمام ابتدائی مکاتب اور دینی مدارس بند ہوگئے ہیں تو میں نے خود علوم دین کی تدریس کی طرح ڈالنے کی نیت کی۔ میں نے

طے کیا کہ میں اکیلا ہی پڑھاؤں گا اور اس میں کسی سے مدد نہیں لوں گا۔ اس مقصد کے پیش نظر میں نے نظام درس کے متعلق کچھ اصول مرتب کیے اور اپنی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایشیائی اور روسی ترکستان میں مسلمانوں کی بستیوں میں گذرا اور وہاں کے رہنے والوں کے سامنے اپنی تجویز اور علوم دین کی تدریس کا پروگرام پیش کیا اور اس کو چلانے کے لئے نہ تو کہیں سے ایک پیسہ مانگا اور نہ کسی کے خوف کو اپنے دل میں جگہ دی۔

اس زمانے میں ایک سال تین طالب علم میرے پاس آئے۔ سب سے پہلے تو میں نے اُن کے ساتھ عربی ادب پڑھنا شروع کیا۔ سات ماہ تک ہر روز ایک سبق ہم ادب عربی کا پڑھتے رہے اور اس مدت میں ہم نے بہت سوچ سمجھ کر اور خوب ذہن نشین کرکے ادب عربی کے اتنے فنون حاصل کرلیے جو گنتی میں ان مہینوں سے جن میں ہم یہ فنون پڑھتے رہے کہیں زیادہ تھے۔ تعلیم و تدریس کے اس زمانے میں مجھے اس بات کا یقین ہوگیا کہ اگر استاد اہتمام اور محنت سے پڑھائے اور شاگرد توجہ اور شوق سے پڑھے تو شاگرد کے لیے طلب علم مشکل نہیں رہتا۔

غرضیکہ ان دنوں دینی مدارس کے مہتمموں اور ان کے اساتذہ کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ مدارسِ دینیہ کے نظامِ تعلیم کی اصلاح کریں اور وہاں جو علوم پڑھائے جاتے ہیں، ان کی تکمیل کے ذرائع بہم پہنچائیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اور سب مسلمان قوموں کے مقابلے میں اس امر کی زیادہ استطاعت رکھتے ہیں کہ جامعہ اسلامیہ علمیہ قائم کریں۔ یوں تو ہندوستان میں بہت سی اسلامی جامعات ہیں، لیکن ان سب میں ہمارے نزدیک جو درس گاہ اصلاح کے لئے اقرب ترین ہے اور وہ اس کی صلاحیت بھی رکھتی ہے کہ اُسے جامعہ اسلامیہ علمیہ بنا دیا جائے، وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ہے۔

ہم نے شروع ہی میں بتا دیا ہے کہ ہم جب "جامعہ اسلامیہ" کہتے ہیں تو اس سے ہماری کیا مراد ہے اور جب ہم "جامعہ علمیہ" کا نام لیتے ہیں تو اس سے ہمارا مطلب کیا ہے۔ اب میں زیر تجویز "جامعہ اسلامیہ علمیہ" کے تعلیمی نظام اور اُس کے نصابِ تعلیم کے بارے میں جو تصور

لکھتا ہوں اُس کو اربابِ حل وعقد، اہلِ علم اور اساتذۂ مدارس کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ نظامِ تعلیم جو میں یہاں پیش کر رہا ہوں مجوزہ جامعہ اسلامیہ علیہ کے بنانے والے جب اُس کے لئے مکمل اور وسیع تر نظام بنائیں گے تو یہ ان کے لئے ایک ابتدائی نمونے کا کام دے گا۔

ابھی حال میں مدرسۂ عالیہ رام پور کے نظامِ تعلیم کے متعلق میں نے ایک کتاب دیکھی ہے یہ نظام بھی کم و بیش مدرسۂ دیوبند کے نظام سے ملتا جلتا ہے۔

درس وتدریس کا پروگرام

(۱) اس سلسلے میں پہلا اصول جو سب سے اہم اور عام ہے یہ ہے کہ علوم اسلامیہ کی تعلیم میں ضروری ترتیب کا خیال رکھا جائے، مثلاً دینی علوم کی تعلیم سے پہلے ادبی علوم کی تعلیم ہونی چاہئے اور قرآن کریم کے مطالب اور احادیث نبوی کے مجموعوں کی تعلیم پر لغت، صرف و نحو اور بلاغت کی تعلیم کو مقدم رکھا جائے اور علوم فقہ اور علوم کلام پر قرآن کریم اور سنت نبوی کی تعلیم کو۔ بات یہ ہے کہ فقہ اسلامی اور شریعتِ اسلامی کے یہ جو سارے علوم ہیں ان کا اصل سرچشمہ تو کتاب وسنت ہی ہے۔ اب اگر ایک شخص فقہ وعقائد کی تعلیم تو حاصل کرتا ہے لیکن وہ قرآن وسنت سے بے بہرہ ہے تو ظاہر ہے اس کی یہ ساری محنت اکارت جائے گی اور ایسی حالت میں وہ کتب فقہ سے فراغت حاصل کرلے گا لیکن نہ اُس کے دل میں البتہ اس کے دماغ ہی میں اسلام کی روح اور اس کی سمجھ پیدا ہوگی۔ علوم اسلامی کی تعلیم میں ضروری ترتیب کو ملحوظ نہ رکھنے کا ایک اور نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ اُس کی وجہ سے طالب علم کوئی کتاب شرح اور حواشی کی مدد کے بغیر سمجھ نہیں پاتا۔ طالب علم کا اپنے سبق کو سمجھنے کے لئے شرح وحاشیے کا محتاج ہونا اور متنِ کتاب کی بجائے اُس کی طویل شرحوں اور حاشیہ در حاشیہ کے مطالعے میں اس کا لگا رہنا موجودہ دینی تعلیم کی خرابی کا بہت بڑا سبب

ہے۔ اب اگر پہلے عربی زبان کی تحصیل ضروری قرار دی جائے اور اس کے بعد قرآن وسنت کی تعلیم ہو اور پھر فقہ وکلام کی باری آئے تو یہ جو موجودہ نظامِ تعلیم کو بے اثر بنا رہے ہیں، مٹ جائیں گے۔

(۲) اس ضمن میں دوسرا اہم اصول یہ ہے کہ ہر فن اور ہر علم کو معہ اس کے تمام مسائل کے اپنی اپنی باری سے پڑھایا جائے یعنی یہ نہ ہونا چاہئے کہ ایک وقت میں ایک فن کے بعض مسائل پر اکتفا کرلیا جائے یا ایک فن کی کسی کتاب کی بعض فصلوں کا پڑھ لینا کافی سمجھ لیا جائے۔ اگر تعلیم میں اس پہلے اور دوسرے اصول کا لحاظ رکھا جائے گا تو طالبِ علم شروح اور حواشی سے بالکل مستغنی ہو جائے گا اور وہ اپنے اسباق کو اچھی طرح سے سمجھ بھی سکے گا اور انھیں یاد بھی کرے گا۔ اور اس طرح جو کچھ بھی وہ حاصل کرے گا وہ اس کے لئے زندگی بخش ہوگا اور اُس کے دل کو اس سے اطمینان نصیب ہوگا اور آگے چل کر تحصیل علم میں اُسے کوئی دقت نہ ہوگی۔

(۳) عربی ادب کی تدریس کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ طالبِ علم قرآنِ کریم اور سنت نبوی کے مطالب ومعانی کو سمجھ سکے۔ اس لئے اس ضمن میں مناسب اور مفید یہ ہے کہ پڑھانے کے لئے ادب میں سلفِ قدیم کی کتابوں کا انتخاب کیا جائے یا ادب کی ایسی کتابیں جنہیں جو سلفِ قدیم کے اصولوں پر مدوّن کی گئی ہوں۔ اور نیز مستعد معلّم کو چاہئے کہ وہ عربی ادب کی تعلیم کے ضمن میں جو ضروری فن ہیں اُن کے مسائل کو اجمالی طور پر طالبِ علم کے سامنے زبانی بیان کرے، مثلاً نحو میں وہ "الدروس النحویہ" ایسی کتاب سے جو نحو کے فن کو آسان بنانے کے لئے مدون کی گئی ہے، مدد لے سکتا ہے۔

(۴) جہاں تک علم صرف کا تعلق ہے مستعد معلم "شافیہ" اور "المزہر" کے مسائل شاگردوں کو زبانی پڑھا سکتا ہے۔ اس ضمن میں اس بات کا خیال رہے کہ اصل مقصود "شافیہ" اور "المزہر" کے مسائلِ صرف کو ذہن نشین کرنا ہے نہ کہ ان کتابوں کی عبارتوں کو حل کرنا۔

علم نحو میں "کافیہ" کے مسائل اور اس کی شرح جو رضی کی ہے اور اسی طرح "الفیہ" اور اس کی شرح جو اشمونی نے لکھی ہے یہ دونوں کتابیں اور اُن کی یہ شرحیں کافی ہیں۔ یہاں ہم پھر یہ کہے دیتے ہیں کہ ان کتابوں کے ذکر سے ہماری مراد یہ ہے کہ ان میں نحو کے جو مسائل درج ہیں طالب علم ان کو سمجھ جائے۔ چنانچہ جو طالب علم ان مسائل کو سمجھ لے اور ان کو ضبط کرلے وہ صحیح معنوں میں نحوی ہے اور وہ اس قابل ہے کہ قرآن کریم کے معانی اور سنت نبوی کے مطالب کو بڑی آسانی سے بہت اچھی طرح سمجھ سکے۔

ظاہر ہے علوم صرف و نحو کی تحصیل کے دوران میں طالب علم عربی زبان کو بھی بہت کچھ سیکھ لے گا چنانچہ اس سے اس میں اتنی استعداد پیدا ہو جائے گی کہ عربی جملوں کو سمجھ لے اور اسمار، افعال اور حروف کے معانی کو جب وہ زبان سے بولے جائیں یا لکھے جائیں، جان لے اور اس قابل ہو جائے کہ عربی میں بول سکے اور لکھ سکے۔

(۵) عربی ادب اور صرف و نحو میں اس طرح دسترس حاصل کرنے کے بعد طالب علم کے لئے عروض اور قوافی کا علم حاصل کرنا کچھ مشکل نہیں رہے گا۔ اس غرض کے لئے "متن الکافی" "منظومۃ الصبان" اور "الخزرجیہ" کتابیں ٹھیک رہیں گی۔

(۶) اس کے بعد طالب علم ایک قدم اور آگے بڑھائے اور وہ عربی اشعار کے دیوان اور عہد جاہلیت کے تاریخی واقعات کا مطالعہ کرے۔ واقعہ یہ ہے کہ ادب عربی کا یہ بہت بڑا سرمایہ ہے۔ اسی میں ائمہ ادب نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ بھی آجاتی ہیں۔ اس ضمن میں طالب علم کو بہت محنت کرنی چاہیئے۔ چنانچہ کتب ادب کا جتنا زیادہ سے زیادہ وہ مطالعہ کرسکے، اُس کے لئے اچھا ہوگا۔

شعرائے ادب کے یہ جو دیوان ہیں اور عہدِ جاہلیت کے متعلق ائمہ ادب نے اپنی کتابوں میں جو معلومات جمع کی ہیں اسی میں دراصل سرچشمہ ہے قرآن کریم اور سنت نبوی کی زبان کا اور انہی میں آپ کو قرآن کریم اور سنت نبوی میں مستعمل شدہ الفاظ و کلمات کے شواہد

مل سکتے ہیں اور نیز انھی ادبی کتابوں سے عربوں کی تاریخ، ان کی زندگی کے نظام، اُن کی معاشرت کے آداب، ان کے اخلاق اور ان کے علوم و تحصیلات کا پتہ چلتا ہے جس سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ جزیرۂ عرب میں اسلام کا ظہور تاریخ کا کوئی شاذ واقعہ نہیں۔ اس سلسلے میں "کتاب الاغانی" خاص طور پر مفید ہے۔

(۷) جب طالب علم اوپر کی ان سب منزلوں سے گذر چکے تو پھر اُسے سنت اور حدیث کی کتابیں شروع کرنی چاہئیں۔ مستعد معلم کو چاہیئے کہ وہ سنت اور حدیث میں موطا امام مالک اور تجرید بخاری سے ابتدا کرے اور چند مہینوں کے اسباق میں انھیں ختم کرا دے۔ موطا اور تجرید بخاری کو پڑھانے کے دوران میں اصولِ حدیث کے سلسلے میں اہل علم کی جو اصطلاحیں ہیں معلم کتاب "النخبۃ والنزہتہ" کی مدد سے ان کو شاگردوں کے ذہن نشین کرا سکتا ہے۔ اصولِ حدیث کے موضوع پر کتاب "النخبۃ" مختصر بھی ہے اور مفید اور اصل مقصد کو بھی پورا کرنے والی ہے۔

موطا اور تجرید پڑھ لینے کے بعد صحیح احادیث کی جو چھ کتابیں ہیں ان کو پڑھایا جائے۔ اس کے بعد امام طحاوی کی کتاب "معانی الآثار" کو استاد شاگردوں کے سامنے خود پڑھتا چلا جائے اور اس میں نہ تو اُسے تشریح کرنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی حاشیے سے مدد لینے کی، کیونکہ طلبہ میں تو اُسے سمجھنے کی پہلے ہی سے استعداد پیدا ہو چکی ہوگی۔ ہاں اس ضمن میں استاد کی کوئی اپنی خاص تحقیقات ہوں تو وہ "معانی الآثار" پڑھتے وقت طلبہ کے گوش گذار کر سکتا ہے۔

(۸) علم حدیث کے بعد قرآن کریم کے مطالب و معانی کی تعلیم ہونی چاہیئے۔ اس میں استاد علوم قرآن کے متعلق جو مختصر کتابیں ہیں پہلے ان کو شروع کرے، مثلاً امام شاطبی کی "اللامیہ والعقیلۃ" اور امام الجزری کی "الالفیۃ الطیبۃ"۔ اس کے بعد استاد قرآنِ کریم کے مطالب و معانی کی شروع سے لے کر آخر تک شاگردوں کے سامنے تشریح کرتا چلا جائے۔

اور اس میں وہ "جلالین" اور "بیضاوی" سے مدد لے سکتا ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن کریم کے مطالب ومعانی کے سلسلے میں اصل چیز قرآن کی آیات کے نظم وترتیب کا سمجھنا ہے اور اس معاملے میں نہ تو کسی شخص کی رائے کافی ہے، اور نہ کتب احادیث میں اس ضمن میں جو کچھ مذکور ہے وہ ہماری پوری رہنمائی کرسکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ آیاتِ قرآنی کے نظم کا مسئلہ ان سب چیزوں سے بلند اور وسیع تر ہے اور جہاں تک کہ آیات کے اسباب نزول کا تعلق ہے وہ تمام کا تمام ثابت نہیں اور جو ثابت بھی ہے وہ نظم آیات میں پوری طرح مدد نہیں دیتا۔ ہاں اس میں شک نہیں وہ بھی فائدے سے خالی نہیں ہے۔

(۹) اس کے بعد علم عقیدہ یا کلام کی باری آتی ہے۔ اس ضمن میں امام طحاوی کی کتاب "بیان السنۃ" یا شیخ محمد عبدہ کا رسالہ "توحید" مناسب رہے گا۔ علم کلام میں کتاب "المواقف" سب سے بہتر ہے۔ اور کتاب "مدارج السالکین" میں اصولِ کلام اور اور اصول تصوف کو بہت اچھے پیرایے میں بیان کیا گیا ہے۔ قدیم فلسفہ الٰہی کے لیے "حکمۃ العین" اچھی رہے گی، اور منطق میں "مختصر" اور "التہذیب" کو پڑھنا چاہیے۔ ان کتابوں کو دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ دو سال کی مدت میں ختم کیا جاسکتا ہے۔

(۱۰) فقہ کے لیے "تنویر الابصار" ایسی مختصر کتاب ٹھیک ہے اور اصولِ فقہ میں "التوضیح" اور "المستصفی" پڑھنی چاہیے۔ اس کے بعد "الہدایہ" اور "مجلۃ الاحکام العدلیہ" کو پڑھا جائے۔

(۱۱) سیرت نبوی کے موضوع پر سب سے بہتر کتاب "زاد المعاد" ہے۔ اس میں رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت بھی ہے اور آپ کی احادیث اور سیرت سے سیاسی اور اجتماعی زندگی کے بارے میں فقہی احکام بھی مستنبط کئے گئے ہیں۔ اگر طالب علم اس کتاب کو پڑھ لیں تو ان کے اندر اجتہاد اور مسائل کو استنباط کرنے کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" شریعت کے اصول اور ان کی حکمت کے موضوع پر سب سے اچھی کتاب ہے۔ یہ کتاب دراصل اُصولِ فقہ کی ہے۔ اس کے پڑھنے سے آج کے ملکی اور اقتصادی قوانین پر شرعِ اسلامی کو جو فضیلت حاصل ہے اس کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔

(۱۲) ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں فرائض دین اور احکام الٰہی سے کہیں زیادہ کائنات آسمانوں، ستاروں، سیاروں اور افلاک کا ذکر آتا ہے لیکن ان کی تشریح میں تفسیروں میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بالکل ناکافی ہے۔ جامعہ اسلامیہ کا فرض ہے کہ وہ تخلیق سماوی کے ان عجائبات کو طلبہ کے ذہن نشین کرنے کے لئے قدیم اور جدید ہیئت کو نصاب میں داخل کرے اور آج کل متمدن ملکوں میں نظام شمسی اور ستاروں کے جو اطلس چھپ چکے ہیں علم الافلاک کو پڑھانے میں ان سے کام لے۔ آسمانوں اور کواکب کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں آیا ہے، اس کو سمجھنے کے لئے ہر مسلمان عالمِ دین کو چاہئے کہ آج کل متمدن دنیا میں جو اطلس فلکی رائج ہیں اُن سے ضرور استفادہ کرے۔ سچ پوچھئے تو یہ ایک علمی اور مذہبی فریضہ ہے۔

پچھلے زمانے میں مسلمانوں کے ہاں قدیم ہیئت کا رواج رہا ہے، اگرچہ قرآن حکیم اور اس ہیئت میں ہر لحاظ سے اختلاف ہے لیکن اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ افلاک و کواکب کی نقل و حرکت کا اس ہیئت کے ذریعے بہت ہی اچھا اور مکمل نظام سوچا گیا تھا اور یہ نتیجہ تھا دنیا کے بڑے بڑے فلسفی دماغوں کی محنت کا اور پھر مسلمانوں کے ہاں بڑے بڑے فلسفی دماغ مثال کے طور پر فارابی، ابن سینا اور نصیرالدین طوسی وغیرہ بھی اس کے فریب میں آگئے، چنانچہ مفسرین نے اسی ہیئت کو ٹھیک سمجھ کر قرآن کریم کی تفسیریں بھی لکھیں۔ قدیم ہیئت کی اس تاریخی اہمیت کے خیال سے جامعہ اسلامیہ کے نصاب میں اس کو ضرور شامل کرنا چاہئے۔

(۱۳) علوم اسلام، فلسفہ و حکمت، تصوف اور ادب میں مسلمان علماء نے جو کچھ بھی لکھا ہے، اور نہ صرف تاریخ اسلام میں بلکہ کل تاریخ انسانی میں جو بھی بڑے بڑے شعراء گذرے ہیں،

اور انھوں نے جو منظومات چھوڑے ہیں ان کا اہم ترین حصہ فارسی زبان میں ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ جامعہ اسلامیہ میں فارسی زبان یعنی سعدی اور جامی کی زبان بھی پڑھائی جائے تاکہ طلبار ان حکمار اور شعرار کے آثار اور ان کے دواوین کا مطالعہ کرسکیں۔ اس ضمن میں مولانا رومی کی مثنوی اور خاقانی، نظامی اور جامی کی کلیات اور اسی قبیل کے دوسرے شعرار کا کلام ضرور پڑھنا چاہیئے۔

(۱۴) اگر میرے ہاتھ میں اختیار ہو تو میں عربی ادب کی تعلیم کے ذیل میں مشہور یونانی شاعر ہومر کی کتاب "الیادہ" کا جو عربی زبان میں ترجمہ معہ ہے اس ترجمے اور اس کے مقدمے کو ضرور داخلِ نصاب کروں۔ واقعہ یہ ہے کہ عربی میں یہ مفید ترین کتاب ہے اور میرے نزدیک عربی شعرار کے دواوین اور عرب ادبار کی کتابوں کو پڑھنے کے بعد "الیادہ" کے عربی ترجمے کا مطالعہ ادبی اور علمی لحاظ سے بہت ضروری ہے۔

(۱۵) مجوزہ جامعہ اسلامیہ علیہ میں علوم اسلامیہ کا جو نصاب ہونا چاہیئے اُس کا خاکہ جو میرے ذہن میں تھا وہ تو میں نے پیش کر دیا۔ باقی رہا اس جامعہ کے علمی شعبے میں کون سے مضامین پڑھائے جائیں ان کا بیان کسی تفصیل کا محتاج نہیں۔ آج کل کی متمدن دنیا کے مدارس میں اعلیٰ ثانوی جامعتوں میں جو علوم پڑھائے جاتے ہیں وہ اس جامعہ کے نصاب میں داخل ہونے چاہئیں۔

(۱۶) نیز اگر میرے ہاتھ میں اختیار ہوتا اور میں اس کی قدرت رکھتا تو مجوزہ جامعہ کے اسلامی علوم کی تعلیم میں انجیل و تورات کو ضرور داخل کرتا۔ میرے نزدیک علمائے اسلام کے لئے انجیل و تورات کا جاننا بے حد ضروری ہے، اس لئے جامعہ اسلامیہ کے نصاب تعلیم میں ان کا نہ ہونا کسی طرح بھی ٹھیک نہیں اور نہ طلبہ کا ان کی تعلیم سے محروم رہنا مناسب ہے۔ بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں بڑی کافی تعداد میں انجیل و تورات کے قصوں کا ذکر آیا ہے اور اکثر آیات میں ان کے احکام و قوانین کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے اور بہت سی جگہوں میں انجیل و تورات کے مذکورہ شدہ حالات و واقعات کی تصحیح فرمائی گئی ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم کو بالاستیعاب

سمجھنے کے لئے ان دونوں صحیفوں کا مطالعہ ضروری ہے۔

ہمارے علمائے اسلاف انجیل و تورات کا برابر مطالعہ کرتے تھے۔ چنانچہ اس ضمن میں انھوں نے بڑی بڑی بحثیں کی ہیں مثلاً امام رازی کی تفسیر میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، جس کا ایک حصہ تو واقعی قابلِ قبول ہے لیکن ایک حصہ رد کئے جانے کے قابل! اسی طرح امام قرافی نے اپنی کتاب "الاجوبۃ الفاخرۃ" میں انجیل و تورات کے جو اقتباسات دئے ہیں وہ بالکل صحیح ہیں۔ امام موصوف ان سب علمار اسلام میں جنھوں نے کہ ان دونوں صحیفوں کو پڑھا، پرکھا اور ان کی جانچ پڑتال کی، علمی اعتبار سے سب سے اونچے درجے پر ہیں۔ امام آلوسی نے بھی اس ضمن میں اپنی کتاب "القول الفصیح فی مانفقہ عبدالمسیح" میں جو کچھ لکھا ہے بہت اچھا اور بلند پایے کا ہے۔ اور مولانا رحمت اللہ سہندی کی کتاب "اظہار الحق" کی تو تعریف نہیں ہو سکتی انھوں نے یہ کتاب لکھ کر گویا عیسائی مشنریوں کی زبانیں ہمیشہ کے لئے بند کردیں۔

بے شک علمائے اسلام کی بہت بڑی تعداد انجیل و تورات کی تحریف اور نسخ کی قائل ہے لیکن ہمیں یہاں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں بلکہ ان دو صحیفوں کے جو بھی ترجمے اس وقت ہمارے سامنے ہیں ہمیں ان کو قبول کرلینا چاہئے۔ اگر ہم اہلِ کتاب اور اپنے درمیان انھیں کو بطور حجت کے مان لیں تو اس سے بھی قرآن کریم کی عظمت کے بہت سے شواہد ہمیں مل جائیں گے۔

میرے نزدیک جامعہ اسلامیہ کے نصاب میں انجیل و تورات کی تعلیم ضرور ہونی چاہئے، اس لئے نہیں کہ ان کو پڑھ کر ہم اہلِ کتاب سے مجادلہ و مناظرہ کریں، بلکہ اس لئے کہ قرآن کریم کی سینکڑوں آیات کو ان کی مدد سے سمجھیں۔

الغرض عالم اسلام کو ایک ایسی جامعہ اسلامیہ علمیہ کی اشد ترین ضرورت ہے جس کا یہ نصاب تعلیم ہو، اور اس میں دینیہ اسلامی اور عصری علوم پڑھائے جائیں بات یہ ہے کہ آج کی متمدن

دنیا میں جو بھی یونیورسٹیاں اور کالج ہیں کسی میں بھی علوم اسلامی کی تعلیم کا پورا انتظام نہیں ہے ۔ اس لئے ایک مسلمان طالب علم کو ان علوم میں تکمیل کرنے کا کہیں موقع نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ اس جامعہ میں جو بھی نوجوان مسلمان طلبہ اور طالبات تعلیم پائیں، وہ اپنے آپ کو دین اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیں۔ اب رہا دوسرے علوم وفنون کا مسئلہ جو آج کل ہر متمدن ملک کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ عالم اسلام میں موجودہ دور میں ان میں سے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے ۔ اس لئے مسلمان نوجوانوں کو چاہیئے کہ وہ متمدن ملکوں کی ان یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ان علوم وفنون کو حاصل کریں۔

امید ہے اللہ تعالیٰ عالم اسلامی کو اس امر کی ہدایت دے گا کہ وہ اپنے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو متمدن ملکوں کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ہر نوع کے نئے علوم وفنون کی تعلیم دلائے تاکہ وہ بھی تہذیب و تمدن اور علم و حکمت میں متمدن ملکوں کا ہم پایہ ہو جائے یا ان سے بھی سبقت لے جائے، اور یہ چیز اگر اللہ تعالیٰ کارسازی فرمائے تو کچھ بعید تو ہے نہیں۔

یہ ہے ہماری آرزو اسلام کے مستقبل کے متعلق ۔

یہ چند خیالات تھے جو میں اہلِ علم اور ارباب اقتدار کے روبرو پیش کرنا چاہتا تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ وہ ان چیزوں کو مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ والسّلام

موسیٰ جاراللہ

بہار کے بادل

روشنی کی رنگینی   چاندنی کی رعنائی
کہکشاں کا مینا ہے   آسماں کی پہنائی

سب ہمیں ودیعت ہے
یہ ہماری ساعت ہے

وادیوں کی سرسبزی   ندیوں کے پیچ و خم
رنگ ہائے گوناگوں   صوت ہائے زیر و بم

سب ہمیں ودیعت ہے
یہ ہماری ساعت ہے

نغمہ ریز جوئبار   شبنم آگیں برگِ گل
شاعرِ بہارِ مست   جوشِ عشق و جوشِ مُل

سب ہمیں ودیعت ہے
یہ ہماری ساعت ہے

عرش کے حسیں میرے   فرش کے صنم میرے
تیز ہے نظر میری   تیز ہیں قدم میرے

سب ہمیں ودیعت ہے
یہ ہماری ساعت ہے

شوخ ہو شفق اپنا خونِ دل بہائیں گے
نیستی و ہستی کی مشکلیں اٹھائیں گے
غیر جاوداں کو ہم جاوداں بنائیں گے
بستیاں اُجڑتی ہیں بستیاں بسائیں گے
شاہدانِ شوخ و شنگ میرے گیت گائیں گے
یہ ہماری ساعت ہے نوبتیں بجائیں گے

گھیریں گے پہاڑوں کو
آسماں پہ چھائیں گے

اختر حمید خاں

زمین سے محروم مزدور

"ہندوستان کی سیاسی آزادی جتنی قریب آتی جاتی ہے اتنی ہی معاشی مسائل کی طرف ملک کی توجہ بڑھتی جاتی ہے۔ ملک کا سب سے اہم معاشی سوال ان طبقوں کا معیار زندگی بلند کرنا ہے جن کی محنت سے ملک کی ساری دولت پیدا ہوتی ہے مگر خود انھیں اس کا بہت کم حصہ ملتا ہے ہندوستان کے کسان کا افلاس ضرب المثل ہو چکا ہے۔ مگر زراعت پیشہ آبادی میں بھی وہ طبقہ سب سے زیادہ پست اور مظلوم ہے جو زمین سے محروم ہوتے ہوئے بھی زمین ہی پر مزدوری کرنے پر مجبور ہے۔

آل انڈیا ریڈیو کے بمبئی اسٹیشن نے حال ہی میں THE TOILERS. "محنت کش طبقے" کے عنوان سے تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس سلسلے کی ایک تقریر میں بمبئی یونیورسٹی کے شعبۂ معاشیات کے رکن پروفیسر ایم۔ ایل۔ دانٹ والا نے "زمین سے محروم مزدور" سے بحث کی ہے۔ اس تقریر کا ترجمہ آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے پیش کیا جاتا ہے۔"

مترجم

ہندوستان کے کروڑوں محنت کش انسانوں میں وہ مزدور سب سے نیچے کے درجے پر ہے جو زمین سے محروم ہے مگر زراعت کو اپنا پیشہ بنانے پر مجبور ہے۔ یہ مزدور اس وسیع ملک میں پھیلے ہوئے سات لاکھ دیہاتوں کے تنگ و تاریک گوشوں میں رہتا ہے اور اس غریب کی آواز شہریوں کے کانوں کو شاذ و نادر ہی سنائی دیتی ہے۔ اس کے حریف پراگندہ کہیں سے زیادہ واقف ہیں اور اپنی تصویر دنیا کے سامنے پیش کرنے اور اپنی آواز دنیا کے کانوں تک پہنچانے میں آسانی سے کامیاب ہوتے ہیں۔ مگر اس غریب کی

تکلیفوں، مصیبتوں اور پریشانیوں کی کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی۔ آج کل کی دنیا میں شہر ہی خبروں کے مرکز بن گئے ہیں اور اخبار نویس اور سیاست دان اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ دنیا کو بڑی اہم خبر بنانے کے لئے یا جوشیلی تقریریں کرنے کے لئے گرد و غبار سے اٹی ہوئی دیہاتی سڑکوں یا پگ ڈنڈیوں سے گذر کر ان مقامات پر پہنچیں جو ان غریبوں کا مسکن ہیں۔ جمہوریت کی حمایت میں دنیا کی دو بڑی جنگوں سے گذر جانے کے بعد بھی ہمارے زمین سے محروم مزدور کو ابھی رائے دینے کا حق حاصل نہیں ہوا ہے اور اسی وجہ سے اس غریب کو کسی قسم کی سیاسی اہمیت حاصل نہیں ہے۔

پھر بھی زمین سے محروم مزدور ہندوستان کی کُل مزدور آبادی کا پانچواں حصہ ہے اور اس کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۳۱ء کے عرصے میں زمین سے محروم مزدوروں کی تعداد دو کروڑ پندرہ لاکھ سے بڑھ کر تین کروڑ تیس لاکھ ہوگئی۔ ۱۹۳۱ء میں ہر ایسے ایک ہزار کسانوں کے مقابلے میں جو خود اپنی ملکیت کی زمین کاشت کرتے تھے یا دوسروں کی زمینوں پر کاشتکار تھے ۴۰۷ ایسے زرعی مزدور تھے جن کے پاس نہ تو خود اپنی زمین تھی نہ وہ کسی کی زمین پر مستقل کاشتکار کی حیثیت سے کام کرتے تھے بلکہ جن کی حیثیت صرف مزدوروں کی تھی۔ اس سال کے بعد کے اعداد ابھی حاصل نہیں ہو سکے ہیں مگر زمین کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ اور زراعت کے اخراجات میں بھی اضافے کو دیکھتے ہوئے یہ باور کرنے کے لئے کافی وجوہ موجود ہیں کہ ہمارے ملک میں چھوٹے کاشتکاروں کے دائرے سے نکل کر زمین سے محروم مزدوروں کی صف میں پہنچنے کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی کہہ دینی چاہئے کہ یہی وہ طبقہ ہے جس میں ایسے افراد کی تعداد کافی صدی تناسب سے زیادہ ہوتا ہے جو کارکردگی کی قابلیت رکھتے ہوئے بھی خاندان کی کفالت کرنے والے بیر بار ہوا کرتے ہیں۔ زراعت میں مکانکی طریقوں کے رواج سے قطع نظر کرکے اگر سر دست صرف یہ بھی مان لیا جائے کہ زراعت میں محض عقلی طریقوں سے کام لیا جائیگا تب بھی کاشتکاروں کے زمین سے محروم مزدوروں میں تبدیل ہوتے رہنے کے سلسلے کی رفتار بہت زیادہ تیز ہونے کا امکان ہے۔

ایسے چھوٹے کھیت جن کی کاشت انفرادی طور پر معاشی حیثیت سے مفید نہیں ہے انھیں ملا کر

ایسی بڑی اکائیوں میں تبدیل کیا جن کی کاشت معاشی لحاظ سے مفید ہوگی تو ہمارے ملک میں کم از کم بیس کاشتکار یا خود اپنی زمین کاشت کرنے والے کسان بے دخل ہوں گے اور اس طرح بے زمین سے محروم مزدوروں کی تعداد پانچ چھ کروڑ تک جا پہنچے گی۔ اور ہماری زراعت کے لئے غالباً ڈھائی تین کروڑ سے زیادہ مزدوروں کی ضرورت نہیں ہے۔

ہندوستان میں بیکاروں کی نظر سب سے آخر میں جس جگہ پڑتی ہے وہ زراعتی مزدوری ہے مزدوروں کا یہ طبقہ ہماری قومی معیشت کا کوڑا کرکٹ ہے۔ جب کوئی شخص کسی اور کام میں نہ کھپ سکے تو اس کے لئے سب سے زیادہ بے ضرر جگہ زراعتی مزدوری ہے۔ یہ وہ پیشہ ہے جس میں افلاس کے جس درجے تک آدمی گر سکتا ہے۔ اس کی انتہائی حد مقرر ہی نہیں ہے۔ یہ وہ "پرامن گوشہ" ہے جس میں انسانی شرافت یا سیاسی ضرورت کا خیال کوئی چیز بھی آپ کے سکون میں خلل نہیں ڈال سکتی۔ یہ ایسے لوگوں کے لئے جن کی اور کہیں ضرورت نہ ہو مخصوص خطہ ہے۔ تمام بیکار اس خطے کی طرف ہجرت کر سکتے ہیں، اور بلا کسی پروانہ راہ داری کے اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔

ادھر کچھ عرصے سے ہمارے کانوں میں یہ آواز برابر آتی رہی ہے کہ افراد کے لئے کام پر آمادہ کرنے والا کوئی محرک چاہئے۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ اگر اس محرک کو ختم کر دیا گیا تو پیداوار کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ مہابلیشور[1] یا کسی اور پہاڑی مقام پر ایک ہوا دار بنگلہ، چند موٹریں۔ اور زیادہ نہیں تو نصف درجن ملازم۔ یہ وہ کم سے کم چیزیں ہیں جن کی ہمیں ایک سرمایہ دار کے لئے اجازت دینی چاہئے تاکہ ہم اسے اس بات پر آمادہ کر سکیں کہ وہ صنعت میں اپنا سرمایہ لگا کر پیداوار کا سلسلہ جاری رکھے۔ خدا کا لاکھ شکر ہے کہ ہمارے ملک سے زمینوں سے محروم کسانوں نے "پیداوار کے محرک" کا یہ مقدس لفظ یا کم از کم اس کی وہ تعریف جو ہم نے ابھی ابھی کی ہے نہیں سنی ہے ورنہ پچھلے تمام برسوں میں ہمیں ایک چھٹانک گیہوں چاول یا روئی دستیاب نہ ہوتی۔ سالہا سال سے ہندوستانی کسان وہ تمام غلہ پیدا کر رہا ہے جو ہم صرف کرتے ہیں اور وہ تمام روئی بھی وہی کسان پیدا کر رہا ہے جس سے ہمیں اپنی ضرورت کا سارا کپڑا ملتا ہے

---

[1] پونا کے قریب ایک بہت ہی پُرفضا پہاڑی مقام۔

اور ہمارے مالکان ہل کو پہاڑ پر جا کر آرام کرنے کے لیئے ضروری سامان بھی اس سے ملتا ہے اور اس غریب کسان کے لئے اس سارے کام کا محرک ایک امید موہوم کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ بہت قابل محققوں نے ایسے اعداد و شمار فراہم کئے ہیں جن سے ہمارے کسان کی آمدنی کا اس کے ضروری اخراجات کے مقابلے میں بہت کم ہونا ثابت ہوتا ہے۔ زمین سے محروم مزدور فصل پیدا کرنے کے لیئے محض اس لئے محنت کرتا ہے اور چلچلاتی دھوپ اور گرمی میں اپنا پسینہ اس لئے بہاتا ہے کہ موت کو اپنے سے دور رکھے بس یہی ایک محرک ہے جو اسے کام پر مجبور کرتا ہے۔ ہمارے کسان نے اپنی جائداد رہن رکھی اور پھر بھی پیداوار کا سلسلہ جاری رکھا اور جب اس سے بھی کام نہ چلا تو اس نے اپنی زمین فروخت کر دی اور خود زمین سے محروم مزدور بن گیا اور اس کے بعد بھی محنت کرتا رہا اور سارا ناج پیدا کرتا رہا۔ اس کا کھیت ہی اس کا کھانا کھانے کا کمرہ ہے اس کا ملاقاتی کمرہ بھی اور وہ پہاڑی مقام بھی جہاں وہ تبدیل آب و ہوا کے لئے جا سکتا ہے۔

کسی تجارتی انجمن نے نہ تو اسے "پیداوار کے محرک" کا مطلب بتایا ہے، نہ اس کی اہمیت ذہن نشین کرائی ہے۔

زمین سے محروم مزدور کی مزدوری (جنگ کے زمانے سے قطع نظر) ایک ایسی صنعت ہے جس میں ہمیشہ گھاٹا ہی گھاٹا رہتا ہے اور یہی مزدور سب سے زیادہ غریب اور مفلس بھی ہے۔ پر اس بات پر ہمیں حیرت نہ ہونی چاہیئے۔ ہمارے ملک میں وہ صنعتیں بھی ہیں جنہوں نے جنگ کے زمانے میں کروڑوں بلکہ اربوں روپیہ منافع حاصل کیا پھر بھی وہ اپنے مزدوروں کو اتنی اقل قلیل اُجرت بھی نہیں دیتیں جو اپنی معمولی انسانی ضرورتیں پوری کرنے کے لیئے ان مزدوروں کو ملنی چاہئیں۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ زراعت میں کام کرنے والے مزدوروں کو اتنی اقل قلیل اُجرت مل سکے؟ اگر زراعت ایسی اجرت نہیں دے سکتی تو اس کا الزام جتنا زراعت پر ہے اتنا ہی ہماری بقیہ قومی معیشت پر بھی ہے۔ ہماری بقیہ معیشت اس کے لیئے تیار نہیں ہوتی کہ زرعی پیداوار کی معقول قیمتیں ادا کرے اور چونکہ وہ نسبتاً زیادہ منظم ہے اس لئے زراعت سے اپنی شرائط منوا سکتی ہے۔ زراعت پیشہ ہندوستانی سوائے بہت بڑے

زمیندار کے ــــ اتنی کمزور حالت میں ہے کہ اسے پیداوار کا سلسلہ جاری رکھنا پڑتا ہے۔ خواہ اس میں نفع ہو یا نہ ہو محض اس لئے کہ اس کے بل پر وہ مہاجن سے قرض حاصل کر سکتا ہے۔ جب تک زراعت کے پیشے کے ساتھ ہونے والی اس سب سے بڑی ناانصافی کا علاج نہ کیا جائے اس وقت تک زمین سے محروم مزدور جو اس سلسلے کی سب سے کمزور کڑی اور سب سے زیادہ مظلوم طبقہ ہے اس کی نجات کی کوئی اُمید نہیں کی جا سکتی۔

معاشی ظلم و ستم اور لوٹ کھسوٹ کی ایک انتہائی سفاکانہ مثال کے طور پر آئیے ہم ضلع سورت کے بالیوں[1] پر نظر ڈالیں۔ ایک "دبلا" اپنی شادی کے موقع پر ایک سو روپیہ قرض لیتا ہے اور اسکے معاوضے میں اپنے مہاجن سے جسے "دھاریا" کہا جاتا ہے، وعدہ کرتا ہے کہ اپنی بقیہ زندگی بھر یا قرض کی ادائیگی تک اس کے ہاں ملازمت کرے گا۔ مگر یہ قرض اس کی زندگی پوری ہونے سے پہلے کبھی ادا نہیں ہوتا اور اس ملازمت کے عوض اسے صرف کھانا اور کپڑا ملتا ہے جس کی مقدار بہت کم ہوتی ہے اور جس کی قسم ادنیٰ ہوتی ہے۔ صوبہ بمبئی کی سنہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ میں اس طبقے کی حالت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:-

> "حقیقت میں ان بالیوں اور امریکن سول وار سے قبل امریکن باغات میں کام کرنے والے غلاموں میں کوئی فرق نہیں ہے سوائے اس کے کہ عدالتیں ایک بالی کے جسم اور اس کی خدمات پر مالک کا حق مطلق طور پر تسلیم نہیں کرتیں۔ مگر اس ملک میں جہاں غالباً اور ملکوں کے مقابلے میں اس بات کا امکان کہیں زیادہ ہے کہ عدالتوں میں غریبوں کے مقابلہ میں مالداروں کی زیادہ شنوائی ہوتی ہے۔ اس قانونی فرق کی اہمیت بالکل گھٹ

---

[1] گجرات میں ان لوگوں کو جن کے پاس اپنی زمینیں نہیں ہوتیں اور جو دوسرے کسانوں کی زمینوں پر مزدوروں کی حیثیت سے کام کرتے ہیں "بالی" کہا جاتا ہے۔ یہ طبقہ ہندوستان کے ہر حصے میں پایا جاتا ہے۔ سندھ میں انھیں "ہاری" کہتے ہیں۔ [2] گجرات کا ایک نہایت غریب طبقہ۔ اس طبقے کے لوگوں کو اچھوت نہیں سمجھا جاتا اس لئے چھوت چھات ماننے والے ہندو بھی ان سے گھریلو ملازموں کا کام لیتے ہیں (مترجم)

جاتی ہے۔ ہم اس صورت حال کو یہ کہہ کر ٹھیک بیان کرسکتے ہیں کہ یہ لوگ قانون کی نظر میں تو آزاد، مگر حقیقت میں غلام اور محکوم ہیں۔

ابتدا میں میں کہہ چکا ہوں کہ زمین سے محروم مزدور انتہا درجہ مفلس اور ان پڑھ ہونے کی وجہ سے رائے دہندگی کے حق سے محروم ہے اور اس وجہ سے اس غریب کو کسی قسم کی سیاسی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ میں نے یہ بات اس لئے کہی کہ باوجود اس کے کہ وہ ہندوستانی سماج کا سب سے نیچے کا طبقہ ہے پھر بھی اس کے حقوق و مفاد کے تحفظ کے لئے شاید ہی حکومت نے کوئی قانون ابھی تک بنایا ہو۔ ہمارے ملک کے کارخانہ داروں کی غیر ملکی مقابلے سے حفاظت کے لئے حکومت نے قوانین بنائے ہیں۔ کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے مفاد کی حفاظت کے لئے قوانین موجود ہیں۔ کسانوں کے فائدے کے لئے زرعی پیداوار کی قیمتیں ایک خاص سطح پر رکھنے کے سوال پر غور کیا جا رہا ہے کاشتکاروں کی حفاظت کے لئے قوانین بنائے جا چکے ہیں مگر جہاں تک ہمیں علم ہے زمین سے محروم مزدوروں کی حفاظت کے لئے ابھی تک کوئی قانون نہیں بنا ہے۔ ہاں مجھے یہ کہنا چاہئے کہ حال ہی میں حکومت ہند کے لیبر ڈپارٹمنٹ نے زرعی مزدوروں کے حالات معلوم کرنے کے لئے تحقیقات شروع کی ہے جس کا مقصد یہ پتہ چلانا ہے کہ ان کی آمدنیوں کی سطح کیا ہے۔ ان کی زندگی کا معیار کیا ہے، ان کے لئے کام حاصل کرنے کے کیا مواقع ہیں تاکہ اس معلومات کی روشنی میں یہ طے کیا جاسکے کہ ان کی حفاظت اور ان کی حالت کی اصلاح کے لئے کیا قدم اٹھانے چاہئیں۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ ارادہ اور عمل کا درمیانی فاصلہ کچھ کم نہیں ہوا کرتا۔

زرعی معیشت سے جن لوگوں کے مفاد وابستہ ہیں ان میں اس وقت ایک طرح کا چوکونی مقابلہ جاری ہے۔ اس چوکونی کے ایک گوشے میں خریدار ہے اور اس جماعت میں وہ طاقتور صنعتی خریدار بھی شامل ہے جو زرعی پیداوار اپنے کارخانوں میں بطور اشیائے خام استعمال کرنے کے لئے خریدتا ہے اس کی فوری خواہش اور کوشش بس یہ ہے کہ زرعی پیداوار سستے سے سستے داموں خریدی جائے۔ چوکونی کے باقی تینوں گوشوں میں زمیندار، کسان اور زرعی مزدور کھڑے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اس کوشش میں ہے کہ اپنی سودے بازی کی طاقت کے ذریعے مجموعی پیداوار کا جتنا حصہ بھی حاصل کرسکے حاصل کرلے۔

پھر آخر اس کا علاج کیا ہے؟ کوئی ایسا علاج نہیں ہے جو فوراً ہی ان خرابیوں کو دور کر سکے البتہ یہ ضرور ہے کہ بالیوں کی ... اسی قسم کی جو خرابیاں ہیں ان کا فوراً خاتمہ کر دینا چاہئے اور اگر ضرورت ہو تو اس کام میں قانون کی مدد بھی لینی چاہئے مگر معیار زندگی کو اونچا کرنے کا جو سوال ہے اس کا تعلق ہماری معیشت سے اور خاص کر زرعی معیشت کی از سر نو تنظیم سے ہے۔ اس ضمن میں پہلی بات یہ ہونی چاہئے کہ شہر میں ضرورت کی پیداوار اور شہر میں آبادی کے فائدے کیلئے زراعت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا سلسلہ ختم ہو جانا چاہئے۔ اس کا انحصار خاصکر زرعی پیداوار کی قیمتوں کے سوالوں پر ہے۔ دوسری بات یہ ہونی چاہئے کہ بلا محنت کے فائدہ اٹھانے والے یا مفت خور طبقے شلاً وہ زمیندار جو کبھی اپنی زمین کی شکل تک نہیں دیکھتے مگر اس کی پیداوار میں حصہ ضرور بٹاتے ہیں اور بڑی بھاری شرح سود لینے والے مہاجن جو ہماری زرعی پیداوار پر جیتے ہیں انھیں جلد سے جلد مٹا دینا چاہئے۔ تیسری بات یہ ہے کہ زرعی پیداوار زیادہ بہتر طریقوں سے حاصل کی جانی چاہئے اس سلسلے میں بہتر بیج کے استعمال سے لے کر بہتر طریقوں سے پیداوار کی فروخت تک کی تمام اصلاحات شامل کرنی ہوں گی۔ صرف اس صورت میں ہم زرعی مزدوروں یا زمین سے محروم مزدوروں کو معقول معیار زندگی دلا سکتے ہیں۔ جب ہم زراعت کو ایک صنعت کی حیثیت سے معقول اور مضبوط بنیادوں پر قایم کریں گے۔

اس سوال کے حل کے دو اور طریقے بھی ہو سکتے ہیں۔ اگر نئی زمینیں زیرِ کاشت لائی جا سکیں تو زمینوں سے محروم مزدوروں کو ان زمینوں پر آباد کیا جا سکیگا۔ کتنی نئی زمین زیرِ کاشت لائی جا سکتی ہے۔ یہ سوال ہماری اس وقت کی گفتگو سے باہر ہے۔ بڑے بڑے اسٹیٹوں یا زمینداریوں کو ختم کر کے جو زمین حاصل کی جا سکتی ہے اس کا ذکر ہم قصداً نہیں کریں گے کیونکہ اس سلسلے میں خود ان زمینوں پر کاشت کرنے والے کاشتکاروں کے مطالبے پر غور کرنا ہوگا۔ دوسرا اور سب سے اہم علاج یہ ہے کہ زمین سے محروم مزدوروں کے لئے غیر زرعی پیشوں میں کام تلاش کیا جائے۔ شروع میں ہم کہہ چکے ہیں کہ اگر ہماری زراعت کی ٹھیک تنظیم کی گئی تو کوئی ڈھائی تین کروڑ مزدور ضرورت سے زیادہ ثابت ہوں گے۔ اگر ہماری قومی معیشت کا غیر زرعی حصہ اس بوجھ کو کم نہ کرے تو اس طبقے کے معیار زندگی کو بہتر بنانے کی کچھ

زیادہ امید نہیں کی جاسکتی۔ یہ بہت بڑا اور بڑا ہی پیچیدہ کام ہے، مگر مجھے امید ہے کہ اب ہم سب کو اس بات کا یقین ہوگیا ہے کہ ایک بڑی بھاری کوشش سے کم درجے کی کوئی چیز ہندوستانی معیشت کو مضبوط اور اسی کے ساتھ منصفانہ بنیادوں پر قایم نہیں کرسکتی۔

(م - ح)

انگلستان کی مَعاشی حالت

(الف)

قوم کے سامنے وہی مسائل ہیں جو آپ کو خود اپنے گھر میں پیش آتے ہیں۔ یعنی یہ کہ کھانا، کپڑا، مکان، ایندھن، تعلیم اور دوسری چیزیں جو ایک مکمل زندگی کے لئے درکار ہیں کیونکر مہیا کئے جائیں؟ خاندان کا ہر رکن کیا کام کرے اور کتنا کرے؟ فرصت اور تفریح کے لئے کتنا وقت دیا جاسکتا ہے؟ مختصر یہ موجودہ حالات میں ہم کیونکر روزی کما سکتے ہیں اور ہماری زندگی کا معیار کیا ہوسکتا ہے۔

مگر ان مسائل کو پوری قوم کے لئے حل کرنا محض ایک خاندان کے لئے حل کرنے سے زیادہ مشکل اور دیر طلب ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب وہ قوم چھ سال تک جنگ میں مصروف رہ چکی ہو، اور اس نے اپنے آپ کو اور دوسروں کو تباہی سے بچانے کے لئے اپنا سب کچھ فتح حاصل کرنے میں کھپا دیا ہو۔ فتح کے بعد ہمیں جنگی تیاریوں کے عمل کا رُخ پلٹنا پڑا۔ وہ جائزہ جو حال میں لیا گیا ہے ظاہر کرتا ہے کہ ہم بڑے شد و مد سے حالت امن کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ لاکھوں کروڑوں مرد اور عورتیں فوج سے اور جنگی کارخانوں سے نکل کر شہری زندگی میں واپس آگئی ہیں۔ صنعتی کارخانوں نے زور شور سے دوبارہ کام کرنا شروع کردیا ہے اور ان میں اس سے زیادہ آدمی کام کر رہے ہیں جتنے ۱۹۳۸ء میں کر رہے تھے۔ اشیا کی پیداوار ۱۹۴۶ء کے آخر میں تقریباً زمانہ قبل جنگ کی سطح تک اور برآمد اس سطح سے اوپر پہنچ چکی تھی۔ مزدوروں اور منتظموں نے بڑے شاندار طریقے سے کام شروع کردیا ہے۔ یہ ایسا کارنامہ ہے جس پر ہم بجا طور پر فخر کرسکتے ہیں ....

ہمارے لئے اس وقت سب سے اہم یہ ہے کہ کوئلہ گیس، زراعت، نقل وحمل، لوہے

اور فولاد کی صنعتوں کو جتنے آدمیوں کی اور سامان کی ضرورت ہے وہ مہیا ہو جائے۔ اگرچہ دوسری صنعتوں کو اس طرح چلانا بھی ہمارے معاشی مستقبل کو سنوارنے کے لئے ضروری ہے لیکن ان بنیادی صنعتوں کی ترقی تو ہمارے قومی منصوبے کی جان ہے .... اس کے علاوہ ہمیں اپنی آمد کو بڑھانا بھی ضروری ہے .... مگر ہمارے پاس آدمیوں کی کمی ہے۔ جتنا کام ہمیں کرنا ہے اس کے لئے کرنے والے کافی نہیں۔ ہمیں غیر ملکی مزدوروں سے کچھ مدد مل رہی ہے مگر اس سے کام نہیں چل سکتا .... ہم میں سے ہر شخص کو جو کام کرنے کے قابل ہے اپنی سی کرنی چاہئے محنت ضائع نہ ہونے پائے۔ سائنس، قوتِ ایجاد اور حسنِ انتظام کی مدد سے محنت کا استعمال اس طرح کرنا چاہئے کہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جا سکے ....

دوسرے ملکوں میں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اب انگلستان ختم ہو چکا۔ ان میں سے بعض حضرات جنگ میں بھی یہی سمجھتے تھے۔ مگر ان پر یہ حقیقت کھل گئی کہ ان کا خیال غلط تھا۔ برطانیہ کے لوگ مشکلات سے دبنے والے نہیں۔ جتنا زیادہ نازک موقع ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ مستعدی سے وہ خدمت کی صدا پر لبیک کہتے ہیں ہم امن میں بھی اسی طرح جیتیںگے جیسے جنگ میں جیتے ہیں ....

(مسٹر ایٹلی وزیراعظم برطانیہ)

(ب)

مسٹر ایٹلی نے فرمایا تھا کہ وہ اپنی تقریر میں اپنی پارٹی کی بچ نہیں کریں گے لیکن جس چیز کو وہ اپنا مقولہ کہتے ہیں یعنی نقل وحمل اور بجلی وغیرہ کی صنعتوں کو حکومت کی ملکیت قرار دینا اور حکومت کی طرف سے چلانا وہ خود پارٹی کی سیاست کا سب سے بڑا اختلافی مسئلہ ہے۔ اس کی بنیاد پر پوری قوم میں اتفاق نہیں ہو سکتا۔ پچھلے عام انتخابات کے اعداد وشمار کو دیکھئے تو ظاہر ہو جائے گا کہ نصف کے قریب افراد قوم ان مسائل میں حکومت سے اختلاف رکھتے تھے۔ بہر حال خواہ یہ منصوبے اچھے ہوں یا برے ان سے ہماری موجودہ مشکلات حل نہیں ہو سکتیں۔ ان کا اثر محض یہ ہے کہ کارخانوں کے مالکوں پر ایک پریشانی اور بے بسی کی کیفیت طاری ہو گئی ہے اور سرکاری ملازموں کی میزوں پر کاغذات کا انبار ہے۔

جس کی وجہ سے وہ ان کاموں کی طرف توجہ نہیں کر سکتے جو ان کی فوری توجہ کے محتاج ہیں۔ اگرچہ آئندہ کے لئے ہمیں آزادی ملنی چاہیے لیکن یہ کوئی نہیں کہتا کہ حکومت جو قوانین اب تک بنا چکی ہے انھیں واپس لے البتہ مجھے حکومت سے یہ ضرور کہنا ہے کہ ہر چیز کو قومی ملکیت بنانے کی راہ میں سرپٹ دوڑنا موقوف کر دو اور ان چیزوں کی طرف توجہ کرو جو اس وقت بہت زیادہ اہم ہیں ــــ غذا، کوئلہ گیس وغیرہ، مکان کپڑا، تجارت کا توازن، ملکی زراعت۔ یاد رکھو ۱۹۴۷ء میں ملکی زراعت کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہوگا۔ کاشتکاروں کو ہماری زیادہ سے زیادہ مدد درکار ہوگی۔ یہ مسائل ہیں جن میں حکومت کو سر کھپانا چاہیے نہ یہ کہ ۱۹۴۸ء میں بجلی پر حکومت کا اجارہ ہوگا یا نہیں۔

مجھے تو اب اور بھی زیادہ یقین ہو گیا ہے کہ حکومت کے بڑے بڑے اجاروں سے قومی مشکلات حل نہیں ہو سکتیں بلکہ ایک متمدن ریاست کی کامیابی اور استحکام اس پر منحصر ہے کہ وہ اپنے شہریوں میں ذاتی ملکیت کے اصول کو زیادہ سے زیادہ رواج دے۔ یہ ہمارا عقیدہ ہے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس میں اور اشتراکیت میں بعد المشرقین ہے.......

(مسٹر ایڈن)

مسئلہ فلسطین اور یو۔ ان۔ او

فلسطین کے مسئلے پر کمیٹیوں اور کمیشنوں نے جتنی رپورٹیں پیش کی ہیں اور جتنے حل پیش کئے ہیں شاید ہی کسی اور مسئلہ کو ان سے سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ لیکن اتنی وافر توجہ اور بظاہر غیر معمولی کوشش کے باوجود یہ مسئلہ اتنا ہی لاینحل ہے جتنا روز اول تھا۔ عام طور پر ایک کمیٹی یا کمیشن فلسطین کی سڑکوں پر کافی خون بہنے کے بعد معرض وجود میں آتا ہے کچھ توقعات بیدار ہو جاتی ہیں خون کی ہولی مدھم پڑنے لگتی ہے بہیمیت اور بربریت کچھ عرصے کے لئے دب جاتی ہے رپورٹ شائع ہوتی ہے۔ دونوں فریقین اسے رد کر دیتے ہیں اور خون کی ہولی پھر شروع ہو جاتی ہے۔

دہشت پسندی کی موجودہ گرم بازاری اس بار یہودیوں کی لائی ہوئی ہے۔ انگریز عہدیداروں کو یہودی دہشت پسندوں کے ہاتھوں کافی مظالم برداشت کرنا پڑے ہیں۔ اور بظاہر برطانوی حکومت اس مسئلہ کے حل کے لئے بیچین ہے لیکن برطانوی حکومت کا کہنا ہے کہ یہ مسئلہ وہ اکیلے حل نہیں کر سکتی۔ اور اس لئے ابھی پچھلے دنوں اقوام متحدہ کا ایک خاص جلسہ برطانیہ کی درخواست پر بلایا گیا تھا کہ اقوام عالم کی یہ انجمن اس مسئلہ پر سوچ بچار کر کے کوئی حل تجویز کرے۔ بہت سے لوگ جو برطانوی سیاست کے ڈھنگ سے واقف ہیں اس اعتراف شکست کو ایک چال سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ برطانوی حکومت عربوں سے کھلم کھلا بگاڑ نہیں کر سکتی کیونکہ اس سے مشرق قریب کے اسلامی ممالک میں اس کے اثر اور اقتدار کو دھچکا لگنے کا اندیشہ ہے دوسری طرف امریکہ کو خوش کرنے کے لئے ایسا حل ناگزیر ہے جو عربوں کے خلاف ہو اس پیچیدگی سے نکلنے کی صورت یہ ہے کہ ذمہ داری "اقوام عالم" پر ڈال دی جائے۔

برطانوی حکومت کی نیت کے متعلق یہ شبہے صحیح ہوں یا غلط، مجموعی حیثیت سے اقوام

عالم کے نمایندوں نے جو مظاہرہ کیا وہ کچھ قابل فخر نہیں۔ آغاز سے ہی جلسہ کی کارروائیاں پس پردہ سازشوں کے پس منظر میں ہوئیں اور مجموعی حیثیت سے یہ اثر شاید غلط نہ ہوگا کہ انجمن اقوام سے جس غیر جانبداری اور انصاف پسندی کی امید کی جاسکتی تھی اس کا مظاہرہ نہیں ہوا۔ بحث کی ابتدا اس سوال سے ہوئی کہ ایجنڈا کیا ہو؟ برطانوی حکومت نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ اقوام متحدہ کی طرف سے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جائے جو فلسطین کے مسئلہ کی چھان بین کرے۔ عرب ممالک کی طرف سے یہ مطالبہ پیش کیا گیا تھا کہ فلسطین میں انتداب "Mandate" کے اختتام اور فلسطین کی آزادی کے سوال پر بھی بحث ہو عربوں کا مطالبہ بالکل جائز تھا جنگ عظیم کے بعد مجلس اقوام نے جب فلسطین کا مینڈیٹ برطانیہ کے حوالے کیا تھا تو فلسطین کی آزادی کو ہی مطمع نظر قرار دیا تھا اتنے سال گذر جانے کے بعد یقیناً انھیں اس آخری مقصد کے پورا کئے جانے کا مطالبہ کرنے کا حق تھا پھر عربوں نے یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ فوراً ہی فلسطین کو آزادی دے دیجائے اس سے قطع نظر اگر یہ مطالبہ ناجائز یا قبل از وقت تھا تو متحدہ اقوام اسے رد کر سکتی تھیں۔ انھیں کوئی بات عربوں کے اس مطالبہ کو اسی شکل میں منظور کر لینے پر مجبور نہ کر سکتی تھی۔ لیکن اینگلو امریکن جماعت اس تجویز کے خلاف تھی اور بھلا ہو جنوبی امریکہ کے لاتعداد ووٹوں کا، کوئی ایسی تجویز منظور نہیں ہوسکتی جو اس جماعت کو پسند نہ ہو اس صورت حال کا اندازہ کر کے ہندوستانی نمایندے مسٹر آصف علی نے عربوں سے اپیل کی کہ وہ اس تجویز پر رائے شماری کا مطالبہ نہ کریں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے یہ آصف علی صاحب کی یہودیت نوازی کی ابتدا تھی۔ یہ الزام صحیح ہو یا غلط، اس سے عربوں کی سوجھ بوجھ کی کچھ بڑی قدر افزائی نہیں ہوتی۔ یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ آگے چلکر آصف علی صاحب نے ہی یہ بھی تجویز کیا کہ تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشات میں آزادی کا سوال ضرور شامل کیا جائے اور تقریباً سبھی عرب نمایندوں نے آصف علی صاحب اور ہندوستان کے رویہ کی تعریف کی ہے۔

اپنی غیر جانبداری کے متعلق اس جلسہ نے شبہ کا ایک اور سبب بھی فراہم کر دیا کہ فلسطین عربوں کا ہے۔ اس لئے فلسطین کا مستقبل ان کے لئے زندگی و موت کے سوال کی طرح

اہم ہے ۔ روس کی تجویز تھی کہ یہودیوں کو اس جلسے کی کارروائی میں حصہ لینے کا پورا پورا موقع دیا جائے لیکن یہودی جنرل اسمبلی کے ممبر نہیں اس لئے یہ دقت پیدا ہوئی تھی کہ انھیں کس حیثیت سے اپنا معاملہ پیش کرنے کا موقع دیا جائے فلسطین کے مسئلے سے یہودیوں کو گہرا تعلق ہے اس لئے یہ بالکل انصاف کا تقاضہ تھا کہ انھیں بھی اس مسئلہ پر روشنی ڈالنے کا موقع دیا جائے لیکن پھر یہی حق عربوں کو بھی ملنا چاہیئے تھا لیکن عربوں کے نقطۂ نظر کی شنوائی اتنی ضروری نہیں خیال کی گئی ۔ آصف علی صاحب نے اصرار کیا کہ عربوں کو بھی یہ حق بالکل اسی طرح ملنا چاہئیے جیسے یہودیوں کو ۔ بڑے لیت ولعل کے بعد یہ بات مان لی گئی ۔

جنرل اسمبلی نے فیصلہ یہ کیا ہے کہ گیارہ "غیر جانبدار" اقوام کے نمایندوں پر مشتمل ایک کمیٹی فلسطین کے مسئلے کی تحقیقات کرے لیکن فلسطین کے معاملہ پر تحقیقات سے کن نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے ، یہ آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا ۔ فلسطین میں جھگڑا یہ ہے کہ برطانوی حکومت نے مختلف اوقات میں عربوں اور یہودیوں سے متضاد قسم کے وعدے کئے ہیں اور دونوں سے ان وعدوں کا ایفا ناممکن ہے ۔ عربوں کا کہنا ہے کہ فلسطین کو آزاد کردیا جائے اور بحیثیت اکثریت کے نمایندوں کے زمام اختیارات ان کے ہاتھ میں سونپ دی جانی چاہیئے ۔ ان یہودیوں سے کوئی تعرض نہیں کرنا چاہتے جو فلسطین میں بس چکے ہیں لیکن وہ بین الاقوامی صیہونیت کی اس جارحانہ کارروائی کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں جس کا مقصد فلسطین میں باہر سے لاکر یہودیوں کی اکثریت قائم کردینا اور اس طرح ایک یہودی ریاست کی تعمیر کرنا ہے یہ جنگ جارحانہ کارروائیوں کو روکنے کے لئے لڑی گئی ہے اس لئے عربوں کے حق میں فیصلہ کی توقع بیجا اور غلط نہیں ، بہرحال سوال صرف یہ ہے کہ اس جھگڑے کو طے کیونکر کیا جائے ؟ جنرل اسمبلی نے یہ طے کرکے کہ آزادی کے مسئلہ پر تحقیقاتی کمیٹی کوئی سفارش پیش نہیں کرسکے گی دراصل یہودیوں کے مطالبہ کی تائید کردی ہے ۔ تحقیقاتی کمیٹی کے متعلق اس بات پر بڑا زور دیا گیا ہے کہ وہ ایک غیر جانبدار جماعت ہے ۔ بین الاقوامی رشتوں کے موجودہ دور میں مثلاً گوئٹمالا ، اور

یوگوسلاویا کو غیر جانبدار" کہنا کتنا صحیح ہے۔ یہ سمجھنا زیادہ دشوار نہیں۔ لیکن اس کمیٹی کی تحقیقات کے بعد جو سفارشیں پیش کی جائیں گی ان پر عمل کرنے کی ذمہ داری کسی نے قبول نہیں کی ہے چنانچہ آصف علی صاحب کے ایک سوال کے جواب میں سر الکزنڈر کیڈوگن نے یہ وعدہ کرنے سے انکار کیا کہ برطانوی حکومت ان سفارشات پر عمل کرنے کی بھی ذمہ داری لے لے گی۔

بہرحال کمیٹی نے اپنا کام شروع کر دیا ہے اور ستمبر تک کے لئے یہ معاملہ پھر ٹل گیا ہے۔ اس سوال کے حل کرنے کی امید کرنا ذرا دشوار ہے کم از کم آثار تو مساعد نہیں۔ انجمن اقوام نے فلسطین میں امن کی اپیل کی ہے۔ یہودی دہشت پسندوں کی طرف سے اس اپیل کا جو جواب دیا گیا ہے وہ کسی طور خاطر خواہ نہیں کہا جا سکتا۔ ادھر امریکہ کے یہودیوں کی طرف سے ان کی مزید ہمت افزائی کی گئی ہے۔ عرب اس فیصلہ پر بجا طور پر بد دل ہیں اور اگرچہ اب تک انھوں نے یہ فیصلہ نہیں کیا ہے کہ وہ اس تحقیقاتی کمیٹی کے ساتھ تعاون کریں گے یا نہیں لیکن آثار اچھے نہیں۔ عراق کے وزیر اعظم نے مطالبہ کیا ہے کہ عرب لیگ بلودان کے عہدنامہ پر عمل کرنے کا مطالبہ کرے۔ اس معاہدہ کی شرائط بھی یہ ہیں کہ عرب لیگ کی ممبر حکومتیں برطانیہ اور امریکہ سے اپنے تجارتی اور مالی معاہدے منسوخ کر دیں، برطانوی اور امریکی مال کا بائیکاٹ کیا جائے اور سیاسی تعلقات پر نظر ثانی کی جائے۔ عمل کی یہ دھمکی شاید کارگر نہ ہو۔ کیونکہ برطانیہ اور امریکہ دونوں کو معلوم ہے کہ اسلامی ممالک میں جو طبقے آج برسر اقتدار ہیں وہ روس سے دوستی کر کے اپنا وجود کسی خطرہ میں ڈالنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ فیصلہ یکسر ان کے خلاف بھی نہ کیا جا سکے گا کیونکہ اس سے فلسطین کے عرب مطمئن نہ ہوں گے اور اگر انھوں نے ہنگامے شروع کر دئے تو روس کو مداخلت کا موقع ملیگا۔ غرض پاور پالٹیکس کی ضروریات پر اس بات کا فیصلہ کیا جائے گا کہ آخری حل کیا ہو۔ فلسطین کی مکمل آزادی بہرحال ایک خواب ہے جو منت کش تعبیر نہ ہوگا کوئی ایسا طریقہ ایجاد کیا جائے گا جس سے برطانوی حکومت کے مالی معاشی اور جنگی مفاد کی حفاظت ہو سکے۔ یہ طریقہ خواہ کچھ بھی ہو اس سے ایک بات طے ہو جاتی ہے کہ یہ آزادی کا طریقہ نہیں ہوگا۔ ممکن ہے فلسطین کی

تقسیم کی تجویز آخرکار قبول کرلی جائے یہ بڑی ناانصافی ہوگی۔ اور اس سے برطانوی اقتدار اور بھی مضبوط ہوجائے گا۔ جبتک فلسطین بڑی طاقتوں کا میدان کارزار بنا رہا کوئی دائمی حل ممکن نہیں ہوگا۔ آصف علی صاحب نے متحدہ اقوام سے اپیل کی تھی کہ وہ عربوں اور یہودیوں کے درمیان کی خلیج کو پر کرنے، انھیں آپس میں ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کریں۔ لیکن اتحاد اور دوستی ورفاقت یہ برطانوی حکومت کے زیرسایہ پلنے والی چیزیں نہیں اور یہ اپیل نقارخانہ میں طوطی کی آواز ہوکر رہ گئی ہے۔

ابوسالم

تبصرے

جھگڑے: از ڈاکٹر رام پرتاپ بہادر، الہ آباد یونیورسٹی، ۲۸۸ صفحے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ: ہریش چندر ۳۳ کچہری روڈ، الہ آباد۔

اس کتاب میں تین مضمون تو ہندو مسلم مسئلے پر ہیں۔ اور باقی کے چار مضامین میں اردو ہندی کے سوال پر بحث کی گئی ہے۔ بقول مصنف "چونکہ اس کتاب میں سارے جھگڑے ہی ہیں اور جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ بھی جھگڑے ہی کی صورتیں پیدا کرتا ہے، اس لئے بھی اس کتاب کا نام جھگڑے ہی ہونا چاہیے"۔ مصنف نے "CONTROVERSIES" کا ترجمہ ہندوستانی میں جھگڑے کیا ہے۔

ہندو مسلم مسئلے پر اس زمانے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اور اب بھی لکھنے والے برابر لکھ رہے ہیں، لیکن اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہماری نظر سے گذر رہی ہے جس میں اس نازک اور پیچیدہ مسئلے پر نہایت ایمانداری اور بڑی غیر جانب داری سے بحث کی گئی ہے، اور کسی ایک فریق کی حمایت اور مخالفت کی بجائے مصنف نے ہندو مسلم مسئلے کو سمجھنے اور سمجھانے کی پوری کوشش کی ہے۔ موصوف الہ آباد یونیورسٹی میں شاید اقتصادیات کے پروفیسر ہیں۔ اردو ہندی دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں اور ان کے افسانوں کے دو مجموعے بھی شایع ہو چکے ہیں۔

مصنف کے نزدیک جب سے گاندھی جی کی قیادت میں کانگریس نے ہندو تجدید کا روپ دھارا اس وقت سے مسلمان اس سے دور ہوتے چلے گئے، اور آخر نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو نئی ہندو تہذیب کے اس سیلاب سے بچنے کے لئے ایک فرضی لیکن نہایت پُرامید تصور کی پناہ لینی پڑی۔ ڈاکٹر صاحب نے کانگریس کی موجودہ ہیئت ترکیبی کا بڑا اچھا تجزیہ فرمایا ہے، اور اسی طرح لیگ کی عمارت جن بنیادوں

ہمارے دیکھتے دیکھتے اٹھی ہے ان کو بڑے سیدھے سادے طریقے سے پیش کر دیا ہے۔ اور آخر میں وہ جس نتیجے پر پہنچے ہیں، وہ خود ان کے الفاظ میں یہ ہے:۔

"اس کا اگر کوئی حل ہے تو صرف ایک ہے، وہ یہ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کی ہر اس شکایت کو آج بالکل دور کرنا ہے، جس کی بنا پر ہندو مسلم جھگڑا اتنا سنگین بن گیا ہے۔ لیکن بقول مصنف اگر ہندو مسلمانوں میں کسی قسم کا سیاسی سمجھوتہ ہو بھی گیا تب بھی یہ جھگڑا ختم نہیں ہوگا، کیونکہ یہ سماجی، مذہبی اور کلچرل شکلیں اختیار کر چکا ہے۔

اس جھگڑے کی ایک شکل ہندی اور اردو کی موجودہ کش مکش ہے، مصنف نے اس مسئلے پر بھی بڑی تفصیل سے بحث کی ہے، اور ہندی اور اردو دونوں کو خوب کھری کھری سنائی ہیں۔ موصوف کے نزدیک کوئی کتنا ہی فرقہ وارانہ نظریہ کیوں نہ رکھتا ہو، اسے کم سے کم اس اصلیت سے اختلاف نہیں ہو سکتا کہ ہندی اور اردو کو چاہے جس طرح دیکھا جائے، دونوں کی عمارتوں کی بنیادیں ایک ہی تھیں، اسی مشترک جزو کی وجہ سے ہم ہندی اور اردو سے محبت بھی رکھتے ہیں، لیکن آج اس مشترک جزو کو بہت تیزی سے ختم کیا جا رہا ہے۔"

الغرض "جھگڑے" بہت سی الجھنوں کو دور کرنے والی کتاب ہے۔ ضرورت ہے کہ ہر خیال کے لوگ اسے پڑھیں، شاید جھگڑوں کی اس افراط میں اس کے پڑھنے سے موجودہ تعصب کی کچھ اصلاح ہو سکے۔

آنسو اور پسینہ: ۲۸۸ صفحے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

"جھگڑے" کے مصنف ڈاکٹر رام پرتاپ بہادر کے کچھ افسانوں اور چند ایک مضامین کا یہ مجموعہ ہے۔ موصوف آسان ہندوستانی زبان لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ کا انداز تحریر سیدھا سادا اور مزاح اور ظرافت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ افسانوں میں پلاٹ اور ٹکنیک پر خاص زور نہیں ہے، بلکہ زندگی کے مشاہدات اور روار دات کو براہ راست پیش کر دیا گیا ہے۔ لیکن افسانوں اور مضامین کو ایک جگہ جمع کرنا کچھ اللہ بے جوڑ سی بات نظر آتی ہے۔

رہنمائے قرآن ۔ ملنے کا پتہ۔ ادارہ اشاعت اسلامیان حیدرآباد (دکن)

حیدرآباد دکن میں اسلامیات پر کتابیں شایع کرنے کے لئے ادارۂ اشاعت اسلامیات" کے نام سے ایک ادارہ قایم کیا گیا ہے، اس ادارے کی طرف سے یہ کتاب چھپی ہے۔ یہ کتاب دراصل اردو ترجمہ ہے۔ سرنظامت جنگ بہادر کی انگریزی کتاب کا جس میں موصوف نے انگریزی جاننے والے غیر مسلموں کو قرآن کے مطالعہ کی دعوت دی ہے۔ اس کا ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کے فلسفے کے پروفیسر ڈاکٹر میر ولی الدین نے کیا ہے۔

قرآن مجید کو علمی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے سمجھنے کے لئے یہ کتاب مفید رہنمائی کر سکتی ہے۔ اس میں قرآنی تعلیمات کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ قرآن کس طرح فرد اور معاشرے کی اصلاح کے لئے بہترین راہِ عمل پیش کرتا ہے۔ مصنف کی کوشش یہ ہے کہ وہ قرآن کی اُس قوم ساز قوت کو دریافت کرے جس کی وجہ سے دشتِ عرب کے وحشیوں نے چند ہی سال کے عرصے میں تاریخ عالم میں ایک زبردست اور مستقل قوم کی حیثیت سے اپنی جگہ بنالی۔

موضوع کی اہمیت کے اعتبار سے چاہئے یہ تھا کہ کتاب کچھ بہتر چھپتی، اور سرورق کو اتنا بھونڈا نہ بنایا جاتا۔

ضخامت کوئی سو صفحے ہے، اور کتاب پر قیمت درج نہیں۔

تبلیغ حق: ادارۂ اشاعتِ اسلامیات حیدرآباد نے یہ کتاب شایع کی ہے۔ یہ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے رسالے کا اردو ترجمہ ہے، اس میں ان غلط اور غیر اسلامی رسوم کی مخالفت کی گئی ہے جو مسلمانوں میں عام طور پر رائج ہیں، اسلام میں جیسا کہ سب جانتے ہیں، توحید پر بہت زور دیا گیا ہے، اور شرک سے ہر رنگ میں بچنے کی بڑی تاکید آئی ہے لیکن بدقسمتی سے ہندوستانی مسلمانوں میں خالص توحید سے بے اعتنائی اور اعمالِ شرک سے شوق کا مرض سب سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس کے تدارک کی اب تک بہت سی کوششیں ہو چکی ہیں، اور علمائے کرام نے اس ضمن میں بڑی جد وجہد کی ہے۔ امید ہے کہ اس سلسلے میں شاہ صاحب کی کتاب کا یہ اردو ترجمہ

مفید ثابت ہوگا۔

کتاب ۲۰۰ صفحے کی ہے۔ اور قیمت دو روپئے ہے۔

اسلامی سیاست: مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی جماعت اسلامی کے ایک مشہور صاحب قلم ابوالاسلام نعیم صدیقی زیر نظر کتاب کے مصنف ہیں۔

"جماعت اسلامی" ایک "انقلابی جماعت" ہے، جو آج کفر وجاہلیت کی دنیا کو اسلام کے ذریعہ مسخر کرنا اور اسے صحیح معنوں میں مسلمان بنانا چاہتی ہے۔ نعیم صاحب کی یہ تصنیف خود ان کے اپنے الفاظ میں ایک تلوار ہے جس کی نوک پلک درست کئے بغیر وہ اس کو میدان میں لے کر آئے ہیں۔ کتاب لکھتے وقت جو مقصد ان کے پیش نظر تھا، وہ یہ ہے کہ غیر اسلامی سیاست کے داعیوں نے اپنے فکر وعمل پر اسلام کا جو لیبل لگایا ہے، اس کے غلط استعمال کو وہ فاش کر دیں اور اسلام کا نام لے کر غیر اسلام کی طرف بلانے کی جو جعل سازی ہو رہی ہے اس سے عوام کو آگاہ کر دیں۔

"جماعتِ اسلامی" کے نقطۂ نظر سے اسلامی سیاست کو سمجھنے میں اس کتاب سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ کتاب کا اسلوب علمی نہیں بلکہ مبارزانہ اور جنگ جویانہ ہے۔ اس میں بات کو سمجھانے کی زیادہ کوشش نہیں کی گئی، بلکہ اُسے منوانے پر زور دیا گیا ہے۔ اور مصنف کا خود اپنا خیال بھی یہی ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ "تحریکِ اقامتِ دین" کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کر کے جن "حالتِ جنگ" میں مبتلا ہو گیا ہوں، وہ "حسنِ کار" سے کئی گنا زیادہ "سرعتِ کار" کا مطالبہ کرتی ہے۔ ہم لوگ اُصولوں کی جنگ میں "کتاب" اور "قلم" کو بطور سلاح جنگ کے استعمال کر رہے ہیں۔"

کتاب مکتبہ نشاۃ ثانیہ حیدر آباد سے چھپی۔ ۲۷۰ صفحے اس کی ضخامت ہے، قیمت دو روپئے۔

ایک اطلاع

مکتبہ جامعہ دلی، لکھنؤ اور بمبئی میں ... کتابیں ... ہیں۔

... حصہ ... الآرا ... Flow ... Don ...

... کا اس کی ... انقلاب سے پہلے ...

تصویر ہے۔ قیمت مکمل دو جلدیں ...

آپ بیتی۔ چیخوف کی افسانہ نگاری ... ایک ... قیمت ...

... شہ ... کے ...

تاریخ ہندوستان۔ ... عہد ... کی ... مشہور ... کے بعد ... کتاب میں متعدد تصویریں بھی ہیں۔ قیمت ...

ہلدر۔ ولیم کے ... ناول کا ترجمہ۔ ...

سحر ہونے تک۔ ... کے ایک مشہور ناول کا ترجمہ۔ ...

۴۵ء کی ... شعرا کی ... نظموں کا مجموعہ ...

ہیا ہیا۔ ... نظموں کا مجموعہ ...

سماج کا ارتقا ... ...

شعلۂ طور

حضرت جگر ...

...

... قیمت ...

گئودان

منشی پریم چند کا شاہکار ناول اس غیر فانی ... میں ہندوستان کے کسانوں کی ... اس کی ...

... قیمت ...

مکتبہ جامعہ

دلی، لکھنؤ، بمبئی

رجسٹر ایل نمبر ۱۸۹۲

مکتبہ جامعہ دہلی

[illegible] ... ایم اے، پی ایچ ڈی

[illegible] ... یہ کتاب بہترین نمونہ ہے

قیمت [illegible]

تعلیمی خطبات [illegible] ... تعلیمی [illegible]

[illegible] ... زبان و بیان

کے اعتبار سے بھی یہ ایک معیاری چیز ہے۔ قیمت قسم اوّل [illegible] قسم دوم [illegible]

تلاشِ ہند۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی تازہ تصنیف Discovery of India کا اردو ترجمہ۔ یہ کتاب پنڈت جی نے ۱۹۴۴ء کے زمانہ قید میں لکھی ہے۔ زمانۂ قدیم سے لے کر زمانۂ حال تک کی ہندوستان کی معاشرتی اور سیاسی تاریخ۔ قیمت مکمل دو حصے [illegible]

میری کہانی۔ پنڈت جواہر لال کی آپ بیتی۔ یہ کتاب عرصے سے ختم تھی۔ اس کا تازہ ایڈیشن ابھی ابھی چھپ کر آیا ہے۔ قیمت مکمل دو حصے [illegible]

تلاشِ حق۔ مہاتما گاندھی کی آپ بیتی۔ ترجمہ از ڈاکٹر سید عابد حسین۔ قیمت مکمل دو حصے [illegible]

ارتقائی اشتراکیت۔ پروفیسر جوڈ کی کتاب "موڈرن پولیٹیکل تھیوری" کا اردو ترجمہ از برکت علی فراق۔ [illegible] کتاب میں لبرلزم، انارکزم، سوشلزم وغیرہ کی عالمانہ تحلیل کی گئی ہے اور بتایا ہے کہ کونسی شکل زیادہ قابلِ عمل ہے۔ قیمت مجلد [illegible]

ہندوستانی قومیت۔ ڈاکٹر سید عابد حسین کی ایک معرکۃ الآرا تصنیف، قومیت کے مسئلے کو وقتی سیاست اور عارضی مصلحت کی سطح سے بلند ہو کر علمی سطح پر حل کرنے کی پہلی کوشش۔ ہندو تہذیب، اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کا جائزہ، مشترک قومیت اور مشترک تہذیب پر بے لاگ تنقیدی بحث۔ قیمت مکمل [illegible]

مکتبہ جامعہ

دہلی، لکھنؤ، بمبئی

جامعہ

زیرِ ادارت ڈاکٹر سیّد عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ ڈی

سالانہ چندہ ۵ر فی پرچہ ۸ر	بابت ماہ جون ۴۷ء	جلد ۳۴ نمبر ۶

فہرست مضامین

[illegible] پروفیسر محمد مجیب بی اے آکسن [illegible] پرنٹنگ پریس دہلی

انگلستان میں مشرقی زبانوں کی تدریس

لندن کے متعلق قاضی عبدالغفار اور ظفر علی خاں کی نثر اور نظم کے ان تاثرات کے ساتھ جو کئی سالوں سے ذہن میں مبہم طور پر محفوظ تھے ۱۹۳۷ء میں اکتوبر کی تیسری تاریخ کو میں لندن کے ایک ریلوے سٹیشن وکٹوریہ پر گاڑی سے اُترا۔ ایک دو ہندوستانی ہم سفر تھے انھوں نے سٹیشن پر اتر کر اپنے گھر کی راہ لی۔ میں نے ایک ٹیکسی کرایہ پر لی اور ٹیکسی والے کو وہ لفافہ دکھایا جس پر میرے ایک دوست کے اس دوست کا پتہ لکھا ہوا تھا جن کے پاس مستقل قیام کا انتظام ہونے سے قبل مجھے ٹھہرنا تھا۔ سنگین مکان ملگجی سیاہی سے لتھڑے ہوئے تھوڑی دور تک دھند میں لپٹے ہوئے نظر آرہے تھے۔ کچھ بوندیں پڑ رہی تھیں۔ درو دیوار پر غم انگیز دہشت برس رہی تھی میں اپنے ذہن کے کونوں سے قاضی صاحب اور مولوی صاحب کے بناتے ہوئے نقوش کرید کرید کر ان درو دیوار پر چسپاں کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ تو کہیں ٹھیک نہ بیٹھتے تھے۔ بالآخر مایوس ہو کر اس کوشش سے باز آگیا۔ پیرس سے آخر نصف شب کو روانہ ہوئے تھے خیال آیا کہ پیرس میں دن بھر بین الاقوامی نمائش دیکھتے رہے تھے اور چونکہ رات کو بھی آرام سے نہ سو سکے تھے اس لئے شاید تصور کی شگفتگی بروئے کار نہیں آئی۔ ورنہ لندن بہر صورت لندن ہی اور ویسا ہی ہوگا جیسے کہ مولوی صاحب اور قاضی صاحب نے دیکھا تھا۔ موٹر ایک خفیف سے جھٹکے کے ساتھ رک گئی اور ڈرائیور نے ایک ہاتھ سے تو موٹر کا دروازہ کھولا اور دوسرے ہاتھ سے میرا سامان نکال کر ایک مکان کے زینے پر رکھ دیا اور پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہہ سکوں اس نے مکان کی گھنٹی بجادی۔ پھر مجھے سلام کر دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ میرے "دام دلوایے" اتنے میں ایک خادمہ باہر نکلی اور میں ٹیکسی والے کے دام چکا کر مکان کے اندر داخل

ہوگیا۔ علیک سلیک کے بعد میں نے صاحب خانہ سے اپنے لندن آنے کا مقصد بیان کیا۔ اور ان کے مشورہ پر میں نے اسی وقت لندن یونیورسٹی کے اس پروفیسر کو ٹیلیفون کر دیا جن کے ساتھ مجھے آیندہ دو سال کام کرنا تھا۔ لندن جانے سے پہلے میں ان پروفیسروں سے خط و کتابت کر چکا تھا۔ جن کے سپرد میرے پی۔ ایچ ڈی کے کام کی نگرانی ہوئی تھی۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو دوسری طرف سے انگریزی میں آواز آئی :-

"ڈاکٹر بیلی بول رہا ہے۔"

میں نے بھی انگریزی میں آداب عرض کیا اور اپنا نام بتایا۔

اب ٹیلیفون سے کچھ اس قسم کی آواز آئی جس سے میں مانوس تو معلوم ہوتا تھا۔ لیکن الفاظ سے میں کچھ مفہوم معین نہ کرسکا کیونکہ یہ انگریزی کے الفاظ نہ تھے اور یہ الفاظ کچھ اتنی جلدی کہے گئے کہ میں ان کو سننے کے باوجود سمجھ نہ سکا۔ میں نے معذرت ظاہر کی اور پھر وہی الفاظ دہرائے گئے۔ اب کے مجھے معلوم ہوا کہ دوسری طرف سے ڈاکٹر بیلی پنجابی میں میری خیریت دریافت فرما رہے تھے۔ دل مانتا نہیں تھا لیکن کان تصدیق کر رہے تھے کہ لندن میں ایک انگریز سلیس اور خالص دیہاتی پنجابی ہو بہو پنجابیوں کی طرح بول رہا تھا۔

لندن میں مشرقی زبانوں سے متعلق یہ پہلا واقعہ تھا جو مجھے ہمیشہ یادگار رہے گا، بعد میں اسی طرح کے اور کئی واقعات یا حادثات سے دو چار ہونا پڑا جس سے یہ معلوم ہوا کہ سلطنت برطانیہ کے دل میں مشرقی زبانوں کا کس قدر چرچا ہے۔ ڈاکٹر بیلی لندن یونیورسٹی میں ہندوستان اور برما کی زبانوں کے شعبے کے صدر تھے اور اردو کے استاد ہونے کی وجہ سے سرکار نظام کی طرف سے ساڑھے تین سو پونڈ سالانہ وظیفہ پاتے تھے۔ یہ وظیفہ حضور نظام کی طرف سے لندن یونیورسٹی کے اردو کے استاد کو اب بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر بیلی میرے کام کے اس حصے کے نگران تھے جو اردو سے متعلق تھا۔ صرف انہی کی باتیں بیان کرنے لگوں تو شاید اس فرصت میں ختم نہ ہوں۔ اس لئے اپنے ایک اور استاد کا بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ آنجہانی

سرڈینیسن راس تھے ۔ فارسی کے کام میں میں آپ سے مدد لیتا تھا اور ان کی نگرانی میں کام کرتا تھا۔ آپ اس وقت لندن یونیورسٹی میں فارسی کے شعبہ کے صدر تھے پہلے دن ملاقات ہوئی تو "بیفرمائید" "تشریف رکھئے" سے گفتگو شروع ہوئی تو دو گھنٹے بے تکان فارسی میں گفتگو کرتے رہے میں نے ایک دو جملے فارسی کے پنجابی ڈھنگ سے بولے اور پھر یا تو خاموش رہا اور یا انگریزی میں جواب دیتا رہا تھوڑی دیر کے بعد بولے "آپ نے پنجاب سے فارسی کا ایم اے پاس کیا ہے آپ کا قصور نہیں" میں نے وضاحت چاہی تو بولے "آپ کے نصاب میں روزمرہ کی فارسی نہ داخل ہے اور نہ آپ کو فارسی بولنے کی مشق کرنے کا موقع دیا جاتا ہے علی گڈھ کے فارغ التحصیل طلبا کچھ فارسی بول لیتے ہیں۔ کیونکہ وہاں بول چال ایم اے کے نصاب میں داخل ہے" میں اپنی نااہلیت سے اتنا خجل نہیں تھا جتنا اس امر سے پریشان تھا کہ سرڈینیسن راس جو فارسی بولتے تھے اور جس لہجہ میں بولتے تھے وہ ہندوستان میں ہم نے کہیں نہیں سنی تھی۔ بعد میں ایرانی طالب علموں سے ملنے کا اتفاق ہوا تو معلوم ہوا کہ خالص ایرانی لہجہ اور طرز کلام تھا۔

یہ دو حادثات میں نے بالکل ضمناً بیان کئے ہیں جن سے آپ کو صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ لندن میں مشرقی زبانوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو مشرقی زبانوں سے کس قسم کا قلبی لگاؤ ہے اور ان زبانوں میں ان لوگوں نے کس قدر استعداد بہم پہنچائی ہے۔ اب کچھ معلومات آپ کے سامنے رکھوں گا۔ انگلستان کی تینوں بڑی یونیورسٹیوں یعنی لندن، کیمبرج، آکسفورڈ میں اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگریوں کے لئے مشرقی زبانوں کی تدریس اور امتحان کا انتظام ہے اور ان یونیورسٹیوں میں مختلف زبانوں کی تدریس کے لئے صرف یونیورسٹی کی ڈگریوں والے استاد مقرر نہیں ہیں بلکہ یہ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے اپنی عمر کا ایک کثیر حصہ اس ملک میں بسر کیا ہے جس ملک کی زبان وہ پڑھا رہے ہیں اور ان لوگوں کو زبان سے ایسی سرسری دلچسپی نہیں جیسی کہ ہمارے ملک کے بیشتر استادوں کو ہے۔ یعنی یہ لوگ صرف نصاب کو ختم کرنے کے لئے زبان سے دلچسپی نہیں لیتے بلکہ جس ملک کی زبان کی تدریس ان کے سپرد ہے وہ اس ملک سے اتنا

گہرا تعلق پیدا کرتے ہیں کہ اس ملک کے تازہ ترین سیاسی، سماجی اور مذہبی حالات سے باخبر رہتے ہیں۔ انگلستان میں مشرقی زبانوں کے استادوں میں آنجہانی سر ڈینین راس، پروفیسر براؤن پروفیسر نکلسن، ڈاکٹر بیلی، سر پرسی سائیکس، پروفیسر گب، ڈاکٹر ٹرنر اور گریرسن کا نام بڑی عزت سے لیا جاتا ہے۔ یہ لوگ عربی، فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے اور ہیں ان میں سے جن استادوں سے میں ملا ہوں ان سے دوران گفتگو میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ان لوگوں کو مشرقی زبانوں سے اس قدر انس ہے کہ یہ زبانیں ان کا اوڑھنا اور بچھونا بنی ہوئی ہیں اور زبان سے متعلق مسائل پر غور و فکر ان کی زندگی کا شعار ہو گیا ہے۔ آنجہانی پروفیسر براؤن کی لائبریری دیکھنے کا اتفاق ہوا تو دیکھا کہ انھوں نے عربی اور فارسی کی کتابیں جمع کرنے پر کثیر روپیہ صرف کیا تھا اور پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک تقطیع کی کتابوں کو اس یکسانیت اور اس خوبی سے جلد کرایا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ان کے ایک ہم عصر نے مجھ سے بیان کیا کہ وہ عام جلدوں پر جلد ساز کو پانچ پونڈ فی جلد کے حساب سے اجرت ادا کرتے تھے کیونکہ ایک تو انگلستان میں ہاتھ کی بنی ہوئی چمڑے کی جلد کی اجرت ہی بہت زیادہ ہے اور اس پر پروفیسر مرحوم کا تقاضا یہ ہوتا تھا کہ کتاب اپنی تقطیع کی دوسری کتابوں کی ہم شکل اور ہم رنگ ہو اور از حد مضبوط ہو۔ یہ صاحب بیان کر رہے تھے کہ اگر جلد یا جلد کی جزو بندی کی مضبوطی پر پروفیسر صاحب کو ذرا بھی شک گذرتا تو وہ جلد ساز کے سامنے جلد کے ایک گتے کو دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ کر زور سے جھٹکا دیتے اور اگر جلد یا جزو بندی کمزور ہوتی تو یہ گتا تو پروفیسر صاحب کے ہاتھوں میں رہ جاتا اور کتاب جلد سے الگ ہو کر دور جا گرتی اور جلد ساز کی ساری محنت پر پانی پھر جاتا۔ اس جنون سے چونکہ ان کا جلد ساز اچھی طرح واقف ہو چکا تھا اس لئے شاذ ہی ایسا موقع آتا کہ جلد کا اس طرح امتحان لیا جاتا۔

میں عرض کر رہا تھا کہ ان لوگوں کو زبان سے جنوں کی حد تک شغف ہے انہی

پروفیسر براؤن کے متعلق مشہور ہے کہ انگلستان میں جب اور جہاں کہیں کسی پڑھے لکھے ایرانی یا عربی نو وارد کی خبر سن پاتے تو اسے اپنے پاس ٹھیرانے کے لئے لے آتے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب پان اسلامزم کی مشہور تحریک کے علم بردار سید جمال الدین افغانی رح گھومتے گھومتے لندن پہنچے تو پروفیسر صاحب کو ان کے آنے کی اطلاع ملی۔ آپ سید صاحب کے پاس پہنچے اور اپنے پاس لے آئے پروفیسر براؤن عربی اور فارسی بے تکلف بولتے تھے عربی میں گفتگو ہورہی تھی پروفیسر صاحب نے سید صاحب کی تحریک کے متعلق شبہات کا اظہار کیا اور کہا کہ آپ اسلامی ممالک میں اسلام کے ابتدائی دور کی خلافت کا احیا چاہتے ہیں ہمارا خیال ہے کہ اسلامی ممالک میں ملوکیت کی جڑیں بہت مضبوط ہوگئی ہیں۔ کیا آپ بادشاہوں سے ملک لے سکیں گے اور ان کو تخت سے اتار سکیں گے۔ سید صاحب مرحوم نے جواب دیا "ھذا اسھل من خلع نعلین" (یہ تو جوتا اتارنے سے بھی آسان ہے) پروفیسر براؤن خاموش ہوگئے۔

مجھے اس واقعہ کی سیاسی نوعیت سے بحث نہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ انگلستان میں بیٹھے ہوئے عربی کے استاد پروفیسر براؤن اسلامی ممالک کی مکمل سیاست سے کس قدر آگاہی رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک ہمارے ہندی استادوں کی طرح فارسی کو سیکھنے کا مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ حافظ اور سعدی کے چند اشعار کو ازبر کرلیا جائے بلکہ وہ ان زبانوں سے متعلق ملکوں کی سیاسی، سماجی اور مذہبی کیفیت سے بھی ہر وقت آگاہ رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انگلستان کے سیاسی حلقوں میں ان استادوں کو بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے نہ جانے مملکت برطانیہ کا آئندہ کیا حشر ہو لیکن جس وقت میں نے انگلستان کو دیکھا ہے اس وقت سلطنت برطانیہ میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا اور مشرقی ممالک کے جملہ رموز مملکت سے نہ صرف مشرقی زبانوں کے انگریز استادوں کو باخبر رکھا جاتا تھا بلکہ ہر ایک مسئلہ میں ان سے رائے طلب کی جاتی تھی اور اکثر وبیشتر ان کے مشوروں پر

عمل کیا جاتا تھا مشرقی ممالک کے تمام انگریزی سفارت خانوں کے ملازموں کی بھرتی انہی کے مشورہ سے کی جاتی تھی۔ اور جب کسی ملک میں بہت بڑی سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی تھیں تو ان استادوں کو وہاں ملک معظم کا نمایندہ بنا کر بھیجا جاتا تھا۔ میرے استاد سر ڈینیسن راس ترکی میں سفیر بنا کر بھیجے گئے اور جنگ کے دوران میں وہیں فوت ہو کر استنبول میں دفن ہوئے۔

انگلستان کی دیگر یونیورسٹیوں کی بہ نسبت لندن یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کا چرچا زیادہ ہے۔ لندن میں ایک صاحب نے نجی طور پر بھی مشرقی زبانوں کی تدریس کے لئے ایک کالج کھول رکھا ہے۔ جہاں دس شلنگ فی لکچر کے حساب سے آپ کو زبان سکھائی جاتی ہے اس آدمی نے یہ انتظام کیا ہے کہ اس نے لندن کے مشہور اور پر رونق علاقہ بانڈ سٹریٹ میں ایک مکان کرایہ پر لے رکھا ہے جس میں چند چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں اس درسگاہ کا نام "سکول آف فارن لینگویجز" ہے۔ یہ آدمی اس درسگاہ کا باقاعدہ اور متواتر اشتہار دیتا رہتا ہے۔ اس نے ایک کلرک ملازم رکھا ہے جو انتظامی امور میں اس کی مدد کرتا ہے۔ یہ آدمی خود کوئی مشرقی یا غیر ملکی زبان نہیں جانتا لیکن اپنے آپ کو درسگاہ کا پرنسپل کہتا ہے اور جائز طور پر کیونکہ اس کا حسن انتظام اس خوبی کا ہے کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے ایک طرف تو یہ آدمی سکول کا اشتہار دیتا ہے اور دوسری طرف یہ اشتہار دیتا ہے کہ اسے غیر ملکی زبانیں پڑھانے کے لئے استاد درکار ہیں۔ کئی غیر ملکی آدمی اپنی آمدنی بڑھانے کے لئے اس اشتہار کے جواب میں اسے خط لکھ دیتے ہیں۔ یہ آدمی ان سے انٹرویو کر کے ان کا پتہ اور ٹیلیفون نمبر اپنے رجسٹر میں درج کر لیتا ہے۔ اور پانچ شلنگ فی سبق کے حساب سے اجرت طے کر لیتا ہے۔ جب کبھی کوئی خواہش مند طالب علم کوئی زبان سیکھنے کے لئے اس کالج میں جاتا ہے۔ تو پرنسپل اپنے چنے ہوئے آدمیوں میں سے کسی کو اطلاع دے دیتا ہے اور وقت مقرر کر کے طالب علم کو اطلاع دے دیتا ہے۔ طالب علم دس

شلنگ فی سبق کے حساب سے ادا کرتا ہے جس میں سے پانچ شلنگ استاد کو دے دیے جاتے ہیں اور پانچ شلنگ میں سے پرنسپل اشتہارات کا خرچ اور اپنا نفع نکالتا ہے۔ یہ تو ایک نجی درس گاہ کا ذکر تھا اس کے علاوہ لندن یونیورسٹی نے اپنی ایک بہت بڑی درس گاہ "سکول آف اورنٹیل اینڈ افریکن سٹڈیز" کے نام سے جاری کی ہے اس درسگاہ کا سرپرست بادشاہ ہے اور انتظام بڑے بڑے آدمیوں کے ہاتھ میں ہے اس درسگاہ میں میٹرک سے لے کر پی ایچ ڈی تک مشرقی زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ بی۔ اے تک فیس فی سبق کے حساب سے لی جاتی ہے لیکن ایم اے اور پی ایچ ڈی میں چونکہ سبق نہیں ہوتے اس لئے تمام مدت تعلیم یعنی دو سال کے لئے فیس یکمشت یا سال سال کے بعد لی جاتی ہے اس درسگاہ میں شام سے لے کر جاپان تک سب مشرقی زبانوں کی تدریس کا انتظام ہے اور اس درسگاہ کے طالبعلم بیشتر مشرقی ممالک سے آتے ہیں لیکن بہت سے انگریز لڑکے اور لڑکیاں بھی تعلیم پاتی ہیں۔

جیسے کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے انگلستان میں مشرقی زبانوں کی تعلیم و تدریس محض ایک دلچسپ مشغلے کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ان زبانوں کو سیکھنے کا ایک خاص مقصد ہے ہندوستانی طالب علموں سے قطع نظر باقی سب طالب علم کسی نہ کسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر اس سکول میں داخل ہوتے ہیں ہم میں سے بہت سے آدمی تو محض اس لئے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنے جاتے ہیں کہ ان ڈگریوں کے بل بوتے پر ہندوستان میں اچھی ملازمتیں مل جاتی ہیں لیکن انگریز اور دوسرے ملکوں کے طالب علم یہاں مختلف ارادوں سے آتے ہیں انگریز طالب علموں کے عمومی طور پر پانچ طبقے کئے جا سکتے ہیں پہلا طبقہ تو ان لوگوں کا ہے جو حکومت برطانیہ کے بدلیشی محکموں کے ملازم ہیں ان لوگوں کو دوسرے ملکوں میں بھیجنے سے پہلے زبان سیکھنے کے لئے محدود عرصہ کے لئے اس سکول میں بھیج دیا جاتا ہے دوسرا طبقہ ان تجارتی کارندوں کا ہے جو دوسرے ملکوں میں تجارت کی غرض سے جاتے ہیں یہ لوگ بھی غیر ملکی زبان سے شد بد پیدا کرنے کے لئے یہاں آتے ہیں۔ تیسرا طبقہ ان انگریزی اور ولندیزی پادریوں کا ہے

جو تبلیغ کے لئے لندن کے فارن مشنری کالج سے تعلیم پا کر دوسرے ملکوں کو جاتے ہیں چوتھا طبقہ ان انڈین سول سروس کے ملازموں کا ہے جن کی بھرتی اس جنگ سے پہلے لندن سے کی جاتی تھی ان لوگوں کو ہندی اور اردو سکھانے کے لئے اس سکول میں بھیجا جاتا ہے۔ پانچواں طبقہ ان امراء اور امرا کے لڑکوں اور لڑکیوں کا ہے جو محض لسانی ذوق کی تسکین کے لئے اس سکول میں داخل ہوتے ہیں۔ چونکہ ان کے پیش نظر بھی کوئی افادی مقصد نہیں ہوتا اس لئے یہ زبان کو محض زبان کی خاطر ہندوستانیوں کی طرح سیکھتے ہیں لیکن چونکہ ان کے وسائل عمدہ اور کثیر ہوتے ہیں اس لئے ان میں سے اکثر مشرقی زبانوں کے بہت بڑے عالم بن جاتے ہیں وسائل سے میری مراد مادی وسائل اور کتاب خانے ہیں اس وقت دنیا میں جہاں ہندی، فارسی، عربی اور اردو کے مخطوطات کا سب سے بڑا ذخیرہ جمع ہے وہ برٹش میوزیم کا کتاب خانہ ہے اور عربی اور فارسی اور دیگر مشرقی زبانوں کی مطبوعہ کتابیں سب سے زیادہ جہاں ایک جگہ پر مل سکتی ہیں وہ لندن کے مشرقی زبانوں کے کتاب فروشوں کی دکانیں ہیں آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ زبان کے جس طالب علم کو یہ وسائل مہیا ہوں وہ کتنا خوش قسمت ہے وسائل کا ذکر کرتے ہوئے ایک بات یاد آگئی ہندوستان کی تقریباً ساڑھے تین سو زبانوں اور بولیوں پر آج تک جو لاثانی و ضخیم تحقیقی کتاب لکھی گئی ہے وہ پروفیسر گریرسن کی ہے یہ درجن سے کچھ اوپر جلدوں میں کئی ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے لندن جانے سے پیشتر میرا یہ خیال تھا کہ پروفیسر گریرسن نے ہندوستان میں بیٹھ کر شاید بیس پچیس سال میں یہ کتاب مرتب کی ہو۔ ایک دن میرے آنجہانی استاد ڈاکٹر بلی سے کسی طرح پروفیسر گریرسن کا ذکر آگیا اور کسی نہ کسی طرح میں نے اپنے مفروضہ کا ذکر کر دیا۔ پروفیسر بلی کہنے لگے گریرسن تو کبھی ہندوستان نہیں گیا میں نے پوچھا تو یہ کتاب کیسے لکھی گئی کہنے لگے برطانوی حکومت کے ایما پر حکومت ہند نے متعدد منشی اور زباں داں ہندوستان میں پروفیسر گریرسن کے لئے ملازم رکھے تھے جو پروفیسر گریرسن کو

اس کتاب کا مسالہ بہم پہنچاتے رہے اور گریرسن لندن میں بیٹھ کر یہ کتاب مرتب کرتے رہے۔
آپ کے دل میں شاید یہ خیال آرہا ہوگا کہ آخر انگلستان والوں کو کیا پڑی ہے
کہ وہ اس قدر کثیر رقم مشرقی زبانوں کی تعلیم وتدریس پر خرچ کرتے ہیں اس کا جواب کسی حد
تک تو میں دے چکا ہوں انگلستان میں بیشتر کام افادی نقطۂ نظر سے کئے جاتے ہیں انگریز
کی ذہنی ساخت کا تارو پود مہذب دار بنیے سے ملتا جلتا ہے اور اسی لئے وہ ہر ایک کام
کے افادی پہلو کو ضرور پیش نظر رکھتا ہے اسی لئے مشرقی زبانوں کی درس گاہوں کو محض
تفریح و ادبی یا لسانی نقطۂ نظر سے لاکھوں روپے خرچ کرکے قائم نہیں رکھا جاتا۔ بلکہ
ان سے یہ کام لیا جارہا ہے کہ سلطنت برطانیہ مشرقی ممالک میں اپنے سیاسی اقتدار
کو قائم رکھنے ان کو ایک مفید وسیلے کے طور پر استعمال کررہی ہے ان درس گاہوں
کے بیشتر طالب علم مشرقی ممالک میں زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کرکے ہی ان درس گاہوں
میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں پھر یہ بھی ایک بات ہے کہ زندہ قومیں قوم کی
ہر لگ د پے کو زندہ رکھنے کی سعی میں مصروف رہتی ہیں اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا
ہے کہ مشرقی زبانیں دنیا کے ایک بہت بڑے حصے میں بولی و لکھی اور پڑھی جاتی ہیں
اور ہر وہ زندہ قوم جو اقوام مشرق سے کسی قسم کا ربط قائم رکھنا چاہتی ہے اس کے لئے
ضروری ہے کہ وہ ان قوموں کی زبانوں سے واقف ہو یورپ کی ہر ایک بولی اور زبان
بہت اہم لیکن ان کے حقیقی اثر کا دائرہ یورپ اور انگلستان تک ہے۔ مشرق کے
لوگ یورپ پسند ہونے کے باوجود ابھی تک اپنی زبانوں کے شائق ہیں اور چونکہ انگلستان
کو مشرقی ممالک سے گہرا تعلق ہے اور ایک زندہ قوم کی حیثیت سے انھیں یہ احساس بھی ہے
کہ اس تعلق کو خوبصورتی اور کامیابی سے نباہنا چاہیئے اس لئے انھوں نے مشرقی
زبانوں کی تعلیم وتدریس کو محدود دائرہ میں ایک مذہبی فریضہ کی اہمیت دیدی ہے۔
انگلستان میں مشرقی زبانوں کی تعلیم و تعلم کے سلسلے کو دیکھ کر اکثر مجھے یہ خیال

آیا کہ جب ہمیں ایک آزاد قوم اور ملک کی حیثیت سے مشرقی ممالک سے لین دین کرنے کا موقعہ ملا تو ہمارے لئے بھی یہ ضروری ہوگا کہ ہم انگلستان کی درس گاہوں کے نمونے کی درس گاہیں اپنے ہاں بھی جاری کریں۔ ورنہ اس کے بغیر دوسرے ملکوں سے سیاسی اور سماجی معاملات صحیح طور پر قائم نہیں ہو سکیں گے۔

محمد باقر

ادب اور مذہب

ٹی۔ اس۔ ایلیٹ کے نقطۂ نظر سے

اگر مذہب کے وسیع مفہوم کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ اس کا تعلق ادبیات سے گہرا ــــــ اور بہت گہرا ہے بغیر کسی اخلاقی نقطۂ نظر کے ادبی تنقید مکمل نہیں ہو سکتی جن ادوار میں اخلاقی اصول متنازعہ فیہ نہیں ہوں گے، اس دور کی تنقید بھی صحت بخش اور مفید ہو گی۔ اس زمانہ میں اس قسم کا اتفاق و اتحاد نہیں ہے۔ اسی لئے آج سب سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ ادب کو اخلاقی معیار پر پرکھا جائے۔ یہاں ادبی نقطۂ نگاہ کی تنقیص مقصود نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بغیر ادبی معیار کے ہم یہ معلوم ہی نہیں کر سکتے کہ اس چیز کا شمار ادب میں ہے یا ادب سے خارج ہے لیکن ادب کی عظمت کا صحیح اندازہ بغیر مذہبی اور اخلاقی معیار کے ممکن نہیں۔

یہاں اخلاقی معیار کے لفظ کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ ادب میں اخلاقی معیار عام طور پر ہر نسل اور ہر زمانہ کے مطابق ہوتا ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس نسل کے افراد اس کے مطابق زندگی بھی گزارتے ہوں۔ ایک زمانہ میں ایک چیز بری سمجھی جاتی ہے، دوسرے میں وہ اچھی ہو جاتی ہے۔ یہ تغیر پذیری، بعض لوگوں کی نظر میں بڑی مستحسن ہے لیکن اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اخلاق ریت کی دیوار سے زیادہ مضبوط نہیں ہیں۔ جتنا اخلاق مذہب سے دور ہوتا جاتا ہے اس کی یہ کمزوری اور ناپائیداری بڑھتی جاتی ہے۔

مذہب، اخلاق، معاملات اور معاشرت پر اثر انداز ہوتا ہے اس کا لازمی نتیجہ ایک

خاص قسم کی تنقید ہے ہمیں ادبی نقطۂ نگاہ کے ساتھ اس معیار کو بھی سامنے رکھنا چاہئیے۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ ہمیں ڈرامے کو ڈرامے کی نظر سے دیکھنا چاہئیے اور ناول کو ناول کی نظر سے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم کتابیں پڑھتے وقت، اپنے مذہبی اور اخلاقی خیالات کو ایک علیحدہ خانہ میں رکھ دیا کریں اور مطالعہ صرف لطف و انبساط یا جمالیاتی مسرت حاصل کرنے کے لئے کیا کریں۔ لیکن واضح رہے کہ مصنف عملی طور پر اس قسم کی تقسیم کو ملحوظ نہیں رکھتا۔ ایک تخیلی کارنامہ ہماری پوری انسانی شخصیت کو متاثر کرتا ہے ہم بھی اس سے شعوری یا غیر شعوری طور پر بہ حیثیت نوع انسان اثر پذیر ہوتے ہیں۔ اس کی مثال بالکل اس طرح ہے کہ ہم جو کھانا کھاتے ہیں وہ ہمارے ذائقہ کو متاثر کرتا ہے لیکن ہضم کرتے وقت اور جزو بدن ہوتے وقت بھی وہ کچھ اثرات مرتب کرتا ہے اور یہ کل اثر ہی اثر کہلانے کا مستحق ہے۔

ہم جو چیز پڑھتے ہیں وہ صرف ہمارے ادبی مذاق ہی کی تسکین نہیں کرتی بلکہ ہماری ... زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ حد یہ ہے کہ ہمارے خیالات اور عقائد کی صورت گری اسی کے بدولت ہوتی ہے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک نوجوان، ایک شاعر اور مصنف سے بے حد متاثر ہوتا ہے اور اسی رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ کبھی وہ ایک شاعر کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے کا اسی درجہ متاثر ہوتا ہے۔ اس والہانہ شیفتگی کا سبب صرف یہ نہیں ہے کہ نوجوانی میں ہمارے شاعرانہ احساسات پختہ عمری سے زیادہ تیز ہوتے ہیں۔ بلکہ نوجوان کی بے نشوونما اور نا ترقی یافتہ شخصیت، مصنف یا شاعر کی پختہ اور بالیدہ شخصیت کے آگے خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتی ہے یہی حال زیادہ عمر میں ان لوگوں کا ہوتا ہے، جن کا مطالعہ وسیع نہیں ہوتا۔ ایک شاعر یا ایک مصنف ان کے اوپر پورا قبضہ حاصل کر لیتا ہے اور وہ مغلوب و مرعوب ہو جاتے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے ہمارا مطالعہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ ہم ایک دوسرے میں فرق کرنے لگتے ہیں اور ہماری تنقیدی حس بیدار ہو جاتی ہے۔ یہ تنقیدی حصار ہمیں شاعر اور ادیب کے جابرانہ غلبہ اور تسلط سے محفوظ رکھتا ہے۔

وسیع مطالعہ کا فائدہ یہ نہیں ہے کہ ہمارے دماغ میں بہت سی باتیں جمع ہو جاتی ہیں اور وہ ہر
قسم کے علم کا گنجینہ بن جاتا ہے۔ بلکہ دراصل فائدہ یہ ہے کہ خود ہماری شخصیت، دوسری شخصیت
کی مضبوط گرفت سے بچ جاتی ہے۔ زندگی کے مختلف نظریے ہمارے ذہن میں ہم آغوش ہوتے
ہیں۔ اس وقت ہماری شخصیت ابھر کر ان کو پاکیزہ اور مناسب ترتیب دیدیتی ہے۔
یہ کہنا بھی غلط ہے کہ شعر و ادب براہ راست ہمارے زندگی کے علم میں اضافہ کرتے ہیں
اس کے ذریعہ جو علم حاصل ہوتا ہے وہ زندگی کا علم نہیں ہے۔ بلکہ وہ دراصل زندگی کے متعلق
دوسرے لوگوں کے خیالات کا مجموعہ ہے لیکن اگر ہم اپنے اور مصنفین کے خیالات میں خط امتیاز
کھینچ سکیں تو وہ البتہ مفید ہوگا —— یعنی ہم یہ کہہ سکیں کہ فلاں مصنف کا نظریۂ حیات یہ ہے،
وہ اپنے حدود میں اچھے مشاہدہ کا مالک تھا لیکن اس کا زاویۂ نظر مجھ سے مختلف تھا اس لئے
کہ وہ مجھ سے مختلف آدمی تھا اس نے جن چیزوں کو دیکھنے کے لئے انتخاب کیا ہے وہ بھی
اور ان کو جس اہمیت کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے وہ بھی اور ہیں۔ اسی لئے کہ وہ میرے
مقابلہ میں دوسری خصوصیات کا حامل تھا۔ اگر ہم اس قسم کا فرق اور امتیاز پیدا کر سکیں تو
وہ البتہ مفید ہوگا۔ اور ہم ان مصنفین سے زندگی کے متعلق کچھ سیکھ سکیں گے۔ شیکسپیئر، ڈانٹے
امرسن اور کارلائل کے پڑھنے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ حیات کے مختلف نظریے ہمارے
سامنے آجاتے ہیں لیکن دوسری چیزیں بھی جو ہم اپنے زعم میں صرف تفریح اور لطف کے
لئے پڑھتے ہیں، وہ ہمارے اوپر امرسن اور کارلائل سے زیادہ اثر ڈالتی ہیں۔ اسی لئے کہ
ایسے نشاط انگیز موقع پر ہماری انفعالیت بھی بڑھ جاتی ہے۔

ہم اوپر اس کا اشارہ کر چکے ہیں اور اب اس بحث و تمحیص کے بعد یہ بات اور واضح
ہو گئی ہو گی کہ ہمارا مطالعہ لطف اور تفریح کے لئے ہو یا جمالیاتی انبساط کے لئے وہ ہماری
مکمل انسانی حیثیت کو متاثر کرتا ہے یعنی ہمارے سارے اخلاقی اور مذہبی وجود پر اثر ڈالتا
ہے وہ صرف ایک جذبہ کو تسکین نہیں بخشتا۔ اسی لئے موجودہ ادبی سرمایہ کا احتساب ضرور

ہے تاکہ وہ برے اثرات پیدا نہ کر سکے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہر آدمی کو جو وہ سوچتا ہے، کہنا چاہیئے اور جو وہ پسند کرتا ہے، کرنا چاہیئے اس طرح اگر اظہار کے مواقع دئے جائیں تو غلط چیزیں خود بخود چھٹ جائیں گی اور ہم تجربہ سے بہت کچھ حاصل کر سکیں گے۔ ان آزاد خیال لوگوں کا خیال ہے کہ بے قید انفرادیت ہی کے ذریعہ حق کی نشان دہی ممکن ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ زندگی کے خیالات و نظریات انفرادی دماغوں سے پیدا ہوتے ہیں اور وہ نظریوں کے تصادم کے بعد ہی اصلح خیالات باقی رہ جاتے ہیں۔ جو لوگ اس کے خلاف سوچتے ہیں، وہ ان کے نزدیک قدامت پسند، عہد وسطیٰ کی ذہنیت رکھنے والے، اور فاشستی نظام کے مقلد ہیں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ نہ تمام مصنفین انفرادی حیثیت رکھتے ہیں اور نہ تمام پڑھنے والے۔ اتنی اور اس درجہ انفرادیت پسندی نہ کبھی ہوئی اور نہ ہو — موجودہ زمانہ میں تو جب کہ پریس کی ترقی کتابوں کی بہتات، اشتہاروں کی ارزانی، اور لکھنے والوں کی کثرت ہے، انفرادیت اور خودی پیدا کرنا یوں بھی آسان نہیں ہے۔

اگر ایسا ہو بھی کہ مصنف اور قاری دونوں کی انفرادیت مکمل ہو جائے تو بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ قاری صرف اسی چیز کو قبول کرے گا جس کو وہ پہلے سے قبول کرنے کے لئے تیار تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے سب سے سہل راستہ یہی ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس طرح اس کے اچھے آدمی بننے کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔

ادبی تنقید میں یہ دو سوال اہم ہیں: "ہم کیا پسند کرتے ہیں؟" اور "ہمیں کیا پسند کرنا چاہیئے؟" کم لوگ ہیں جو ان سوالوں کا جواب ایمان داری کے ساتھ دے سکتے ہیں۔ پہلے سوال کا مطلب یہ ہے کہ ہم یہ جانیں کہ ہم واقعی کیا احساسات رکھتے ہیں۔ دوسرے سوال کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو سمجھیں اس لئے کہ جو چیز ہمیں پسند کرنا چاہیئے اس کو ہم نہیں معلوم کر سکتے، جب تک کہ ہمیں یہ نہ معلوم ہو کہ ہمیں اسے کیوں پسند کرنا

چاہیے۔ اس سوال کا جواب کہ "ہم کیا ہوں"۔ اسی وقت معلوم ہوسکتا ہے جب کہ ہمیں اس سوال کا جواب معلوم ہو کہ "ہم کیا ہیں" ـــــ اور "ہم کیا ہیں" کا جواب اسی وقت معلوم ہوسکتا ہے جب یہ معلوم ہو کہ "ہمیں کیا ہونا چاہیے" ـــــ "ہم کیا ہیں" اور "ہمیں کیا ہونا چاہیے" یہ خود آگاہی کے دو پہلو ہیں۔ اور ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

ادیب کی حیثیت سے ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم کیا پسند کرتے ہیں۔ لیکن ایک ادبی اور مذہبی آدمی کی حیثیت سے ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ "ہمیں کیا پسند کرنا چاہیے"۔ اس لیے فرق ہے۔ یہ دور ہونا چاہیے۔ اسی طرح افسوس ہے کہ جو کچھ ہمیں پسند کرنا چاہیے اس کو بھی ہم پسند نہیں کرتے۔ ادب کو اگر اس قسم کے روحانی، یا مذہبی معیار سے جانچا جائے تو وہ بہت مفید ہوسکتا ہے۔

یہ عقیدہ بہت عام ہو گیا ہے کہ تعلیم، مذہب کے بجائے فطری اخلاقیات پر مبنی ہو۔ کچھ اسی قسم کا عقیدہ ادب میں بھی داخل ہو گیا ہے۔ اس کا اگر فائدہ ہے تو وہ صرف مادی اور ظاہری دنیا سے وابستہ ہے۔ اگر کوئی فعل، قوم، جماعت یا حکومت کے لئے نقصان دہ نہیں ہے تو وہ مستحسن سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی اخلاق کا ایک نظام ہے اور اپنے حدود میں مفید ہے لیکن ہمارا تصور اس سے بلند ہونا چاہیے جو نہ صرف اس دنیا کے لئے بلکہ آخرت کے لئے بھی مفید ہو۔

خواجہ احمد فاروقی

قطعات

آنے لگا آسماں کو چکر
ہٹنے لگا خود زمیں کا محور
رُکنے لگی سانس آندھیوں کی
ذروں نے بدل لئے جو تیور

اس طرح بدل رہی ہیں کروٹ
ہر موڑ پہ زندگی کی راہیں
جس طرح طلوع ہو رہی ہوں
آنکھوں میں نئی نئی نگاہیں۔

بیت جاتی ہیں ایک پل میں کبھی
زندگی کی ہزار ہا گھڑیاں
ایک لمحے کے انتظار میں بھی
صرف ہوتی ہیں سینکڑوں صدیاں

گردوں سے نظر ملا رہا ہے
خورشید یہ مسکرا رہا ہے
کس عزم کے ساتھ آج اختر
ہر ذرّہ قدم اٹھا رہا ہے

جاں نثار اختر

اقبال

اپنے خطوں کی روشنی میں

کسی بڑی شخصیت کے اہم عناصر کا سراغ لگانا یوں تو ویسے بھی مشکل ہے، پھر اقبال کو سمجھنا تو اس لئے اور بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی شخصیت پر خود بھی بہت سے پردے ڈال لیے تھے۔ اقبال کو لوگوں نے ان کے کلام کے آئینہ میں دیکھا اور اس آئینہ میں انھیں جو تصویر نظر آئی، وہ زیادہ تر ان کے اپنے حوصلے اور ذوق کا مظہر بن گئی۔ شاعر کا کلام اس کی شخصیت کا پرتو ضرور ہوتا ہے لیکن اس سے شخصیت کا خاکہ تیار کیا جائے تو بڑی حد تک اپنی تخئیل سے رنگ بھرنا پڑتا ہے۔ اقبال پر اب تک جتنے لوگوں نے لکھا ہے انھیں کلام، شخصیت اور ذہنی پس منظر کے درمیان ربط قائم کرنے میں زیادہ تر اپنی قابلیت اور ذہانت پر بھروسہ کرنا پڑا ہے۔ خطوط زندگی کا سچا آئینہ ہوتے ہیں۔ اقبال کو ان کے خطوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ خامی بڑی حد تک دور ہو سکتی ہے۔ کلام اقبال پر تنقیدی مضامین اور کتابوں کا سلسلہ خود اقبال کی اپنی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ ان میں سے جو کتاب یا مضمون ان کی نظر سے گزرا، اس میں انھیں اکثر یہی خامی نظر آئی۔ وہ اپنے دل و دماغ کی ایک مختصر سی سرگذشت لکھنا چاہتے تھے تاکہ اس کی روشنی میں لوگ انھیں اور ان کے کلام کو صحیح نظر سے دیکھ سکیں۔ سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں اپنی اس خواہش کا اس طرح اظہار کرتے ہیں۔

"میں اپنے دل و دماغ کی سرگزشت بھی مختصر طور پر لکھنا چاہتا ہوں اور یہ سرگذشت کلام پر روشنی ڈالنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو خیالات اس وقت

میرے کلام اور افکار کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ہیں' اس تحریر سے ان میں بہت
انقلاب پیدا ہو جائے گا۔"

اقبال کی یہ خواہش تو پوری نہ ہو سکی لیکن پھر بھی خطوں میں ان کے قلم سے وہ سب باتیں نکل گئیں جو شاید اس سرگذشت کی زینت بنتیں۔ ان سے اقبال کی وسیع معلومات۔ علمی تحقیق و جستجو کی لگن علم کی نہ بجھنے والی پیاس اور ان کی تنقیدی صلاحیت۔ فنی شعور اور وقت نظر کا حال معلوم ہوتا ہے ان خطوں میں اقبال کی ہمہ گیر شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے۔ شاد کے نام جو خط ہیں وہ اقبال کی مشرقیت' وضع داری' محبت' اہل اللہ سے عقیدت اور بزرگوں کے لئے ادب و احترام کے پرخلوص جذبات کا مرقع ہیں۔ مسٹر محمد علی جناح کو جو خط لکھے گئے تھے ان سے ہندوستان کی سیاست اور مسلمانوں کے سیاسی نصب العین کے بارے میں اقبال کے مخصوص زاویہ نگاہ پر روشنی پڑتی ہے۔ جو خط اقبال کی شخصیت اور ذہنی پس منظر کو سمجھنے میں زیادہ مدد دیتے ہیں' وہ ہیں جو انھوں نے اپنے معاصر علماء کو لکھے تھے۔ ان میں اقبال اپنے معاصروں کی عظمت کا اعتراف کرتے اور ان سے علمی مباحث پر گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔

"مکاتیب اقبال" کے بعض خطوں میں' سید سلیمان ندوی اور بعض دوسرے علماء سے عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے اسے بعض اقبال پرست اقبال کی شان کے منافی سمجھتے ہیں۔ آل احمد سرور نے اپنے ایک مضمون میں اس حیرت انگیز سازش کا اظہار کیا ہے جس کے ماتحت ان خطوں کی اشاعت روکنے کی کوشش کی گئی تھی' نادان عقیدت منداس طرح اقبال کو اپنی دانست میں "رسوا" ہونے سے بچانا چاہتے تھے۔ ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ دوسرے کی عظمت کا اعتراف کرنے سے انسان کی عظمت بڑھتی ہے گھٹتی نہیں۔ ان خطوں میں اقبال کی علمیت اور ہمہ گیر قابلیت کے ان مٹ نقوش ثبت ہیں۔ ان کا کھوج نہ ملتا تو اقبال کی شخصیت کے بعض اہم پہلو نظر سے اوجھل رہ جاتے۔

اقبال کی تنقیدی صلاحیت خطوں سے اقبال کی تنقیدی صلاحیت، بڑھتے ہوئے فنی شعور، وسعتِ نظر اور اسالیبِ بیان کی نزاکتوں سے واقفیت پر بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے۔ کسی آرٹسٹ کے لئے یہ کمال کی دلیل ہے کہ وہ اپنے تخلیقی نمونوں پر ناقدانہ نگاہ ڈال سکے اور دوسروں کی تنقیدیں سن کر فائدہ اٹھا سکے۔ اقبال میں یہ بات بدرجہ کمال موجود تھی۔ جس زمانہ میں اقبال نے شاعری شروع کی، ہمارے "مشاعرے" مختلف اسکول کے شعراء کے درمیان نبرد آزمائی کے اکھاڑے بنے ہوئے تھے۔ باہمی رقابتوں کی بنا پر کوئی شاعر اپنے کلام کے بارے میں دوسروں سے کوئی تنقید سننا برداشت نہ کرتا تھا۔ اس طرح مشاعروں کا رواج ذوقِ شاعری کو سنوارنے کے بجائے تنقیدی صلاحیتوں کو بری طرح مجروح کر رہا تھا۔ اقبال ان مشاعروں سے ہمیشہ بچتے رہے۔ اس لئے اُن کی تنقیدی صلاحیت زنگ آلود نہ ہونے پائی۔ وہ اپنے کو محض شاعر نہ سمجھتے تھے۔ شاعری سے ان کا ایک خاص مقصد تھا اس لئے ہمعصر شعراء میں اُن کا کوئی رقیب نہ تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فنِ شاعری سے مجھے دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کیا ہے۔"

اہلِ نظر کے ناقدانہ مشوروں کو وہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اپنے خطوں میں مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی اور سید سلیمان ندوی سے وہ اکثر اپنے کلام پر تنقید کے طالب رہتے ہیں اور اپنی لغزشوں کو ماننے میں کبھی پس و پیش نہیں کرتے۔ سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:-

"معارف میں ابھی آپ کا ریویو (مثنوی رموزِ بے خودی) نظر سے گزرا ہے جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ میرے لئے سرمایۂ افتخار ہے

اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

صحت الفاظ و محاورات کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے، ضرور صحیح ہوگا۔ لیکن اگر آپ ان لغزشوں کی طرف بھی توجہ فرماتے تو میرے لئے آپ کا ریویو زیادہ مفید ہوتا۔ اگر آپ نے غلط الفاظ و محاورات نوٹ کر رکھے ہیں تو مہربانی کر کے مجھے ان سے آگاہ کیجئے کہ دوسرے ایڈیشن میں اصلاح ہو جائے"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:-

"میری خامیوں سے مجھے ضرور آگاہ کیجئے۔ آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن مجھے فائدہ ہوگا"

سید صاحب کو اپنا وعدہ پورا کرنے میں دیر ہوئی تو انتظار کی تاب نہ لا کر لکھتے ہیں:-

"رموز بے خودی" کی لغزشوں سے آگاہ کرنے کا وعدہ آپ نے کیا تھا۔ اب تو ایک ماہ سے زیادہ عرصہ ہو گیا۔ امید کہ توجہ فرمائی جائے گی۔ تاکہ میں دوسرے ایڈیشن میں آپ کے ارشادات سے مستفید ہو سکوں"

سید سلیمان ندوی نے اپنے ناقدانہ شورے بھیجے تو اقبال نے کئی خطوں میں اپنے استعمال کئے ہوئے محاوروں کی سند میں بہت سے مستند شعراء کا کلام لکھ بھیجا اور اس مسئلہ پر برابر خط و کتابت کرتے رہے۔ سید صاحب کی جو بات سمجھ میں آ جاتی مان لیتے اور جس پر کچھ اعتراض ہوتا اس کے وجوہات لکھ دیتے۔ ان خطوں سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال کو قدیم شعراء کے کلام پر کتنا عبور حاصل تھا۔ مولوی حبیب الرحمان خاں شیروانی کے نام بھی اسی قسم کے کئی خط ملتے ہیں۔ ایک میں لکھتے ہیں:-

نظر ثانی کے وقت آپ کی تنقیدوں سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ اگر میری ہر نظم کے متعلق اس قسم کا خط لکھ دیا کریں تو میں آپ کا نہایت ممنون ہوں گا"

اپنے خطوں میں کئی جگہ اقبال نے اس بات پر زور دیا ہے کہ کسی نظم پر اہل ذوق کی طرف سے

داد مل جائے تو انھیں شاعروں یا مجموں میں مقبولیت حاصل ہونے سے کہیں زیادہ مسرت ہوتی ہے۔ شیروانی صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"آپ کا نوازش نامہ آج صبح ملا حقیقت یہ ہے کہ آج مجھے اپنے ٹوٹے پھوٹے اشعار کی داد مل گئی۔ بعض جگہ جو تنقید آپ نے فرمائی ہے بالکل درست ہے۔ لفظ "جیحہ" کے لئے خصوصیت سے آپ کا مشکور ہوں۔ کیونکہ یہ بات میرے خیال میں مطلق نہ تھی..... آپ نے جو ریمارک ان اشعار پر لکھے ہیں اُن کے لئے آپ کا تہ دل سے مشکور ہوں آپ لوگ نہ ہوں تو واللہ ہم شعر کہنا ہی ترک کردیں۔ اگرچہ جلسہ میں ہر طرف سے لوگ حسب معمول ان کی تعریف کرتے تھے مگر جو مزا آپ کی داد سے ملا ہے اسے میرا دل جانتا ہے۔"

غرض اہل نظر کی تنقید سے وہ اس طرح خوش ہوتے جیسے داد سے۔ مولانا اسلم جیراجپوری کو لکھتے ہیں:۔

"آپ کا تبصرہ "اسرار خودی" پر "الناظر" میں دیکھا جس کے لئے میں آپ کا نہایت شکرگزار ہوں۔

دیدست مردے دریں قحط الرجال

.... آپ کے تبصرہ سے مجھے بڑی تسکین ہوئی۔"

اقبال کے خطوں میں جگہ جگہ ادبی نکتے بکھرے ہوتے ہیں۔ بعض جگہ انھوں نے اپنے کلام کے اسالیب بیان کی نزاکتوں کی طرف بھی اشارے کئے ہیں۔ یہ اکثر ان تنقیدوں کے جواب میں ہیں جو وقتاً فوقتاً ان کے کلام پر کی جاتی تھیں۔ اور جن سے انھیں اتفاق نہ ہوتا تھا۔ خطوط کے یہ حصے جن میں اقبال نے اسالیب بیان کی نزاکتوں پر روشنی ڈالی ہے ان کی تنقیدی صلاحیت کا ثبوت ہیں۔ سید سلیمان ندوی نے اپنے کسی خط میں ان سے "مضطرب" میں جوش بیان کی کمی کی شکایت کی تھی جواب میں لکھتے ہیں:۔

"جوش بیان کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے صحیح ہے، مگر یہ نقص اس نظم کے لئے ضروری تھا (کم از کم میرے خیال میں) جناب خضر کی پختہ کاری ان کا تجربہ اور واقعات و حوادث عالم پر ان کی نظر، ان سب باتوں کے علاوہ ان کا انداز طبیعت جو سورۂ کہف سے معلوم ہوتا ہے اس بات کا مقتضی تھا کہ جوش اور تخیل کو اُن کے ارشادات میں کم دخل ہو۔ اس نظم کے بعض بند میں نے خود نکال دیئے اور محض اس وجہ سے کہ ان کا جوش بیان بہت بڑھا ہوا تھا اور جناب خضر کے انداز طبیعت سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ یہ بند اب کسی اور نظم کا حصہ بن جائیں گے۔"

ضرب کلیم کے بارے میں بھی اکثر لوگ جوش بیان اور شعریت کی کمی اور خشکی کی شکایت کرتے ہیں۔ اقبال اس سے بھی واقف تھے۔ لیکن انھوں نے "ضرب کلیم" میں یہ انداز جان کر اختیار کیا تھا راس مسعود کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"باقی رہی کتاب سو یہ ایک Topical چیز ہے۔ اس کا مقصود یہ ہے کہ بعض خاص خاص مضامین پر میں اپنے خیالات کا اظہار کروں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ ایک اعلان جنگ ہے۔ زمانۂ حاضر کے نام اور ناظرین سے میں نے خود کہا ہے کہ ع

میدان جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

نوائے چنگ یہاں موزوں نہیں۔ اس کتاب کا Realistic ہونا ضروری ہے اور نوائے چنگ کی تلافی Rigmatic Stuff سے کی گئی ہے۔"

منشی سراج الدین کو "پرندے کی فریاد" کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"مندرجہ بالا نظم کی بندش ملاحظہ فرمائیے۔ چونکہ بچوں کے لئے ہے۔ اس واسطے اضافات اور دقت مضمون سے خالی ہے۔ علاوہ بریں فریاد کرنے والا آخر پرندہ ہے۔"

اقبال لفظ پرستی کے بڑے دشمن ہیں۔ وہ الفاظ کو معانی کے اظہار کا ذریعہ سمجھتے ہیں انہیں وہی درجہ دینا چاہتے ہیں جو ایک ذریعہ کو ملنا چاہیئے۔ الفاظ کی خوبی اسی وقت قابل تعریف ہے جب

وہ مطالب کا اظہار خوش اسلوبی سے کریں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"زبان کو میں ایک بت نہیں سمجھتا جس کی پرستش کی جائے بلکہ اظہار مطالب کا ایک آسان ذریعہ سمجھتا ہوں۔ زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو وہ مردہ ہو جاتی ہے۔ ہاں ترکیب کے وضع کرنے میں مذاق سلیم کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیے"

اقبال کا ذہنی پس منظر

اقبال کے پیش نظر چند مقاصد تھے۔ شاعری کے ذریعہ وہ ان کی تبلیغ کرنا چاہتے تھے۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ دنیا والے ان کے پیغام کو اپنا لیں اور ایک نئی دنیا کی تعمیر میں مصروف ہو جائیں۔ ہر آنے والی صبح ان کے لئے نہ جانے کتنی آرزوؤں اور تمناؤں کا پیام لاتی۔ وہ انھیں اپنے دل میں جس کے اندر آفاق گم تھے محبت سے جگہ دیتے۔ یہاں وہ پلتیں اور بڑھتیں۔ لیکن دنیا والوں کی کم نگہی دیکھ کر خون ہو جاتیں۔ اقبال نے اپنے گلستانِ شاعری کی آبیاری اسی خونِ دل سے کی ہے۔ تعمیر نو کی یہ حسرت اقبال کے دل میں نہ ہوتی تو وہ اپنے اشعار میں الفاظ و معنی کا وہ بے نظیر امتزاج، جوش بیان اور فن کاری کا وہ خلوص پیدا نہ کر سکتے جو ان کی شاعری کی جان ہے۔ اس حسرتِ تعمیر کے ساتھ اقبال اس پر بھی یقین رکھتے تھے کہ آرزوؤں کی دنیا آج نہیں تو کل ضرور آباد ہو کر رہے گی۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی شاعری برسوں کی طاری شدہ یاس و قنوطیت کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ شاعری کی یہ خصوصیات اقبال کی شخصیت کا پرتو ہیں، جسے سمجھنے کے لئے ان کے ذہنی پس منظر کو سامنے رکھنا بڑا ضروری ہے۔

اقبال نے مغربی علوم کو بڑی محنت اور کاوش سے حاصل کیا تھا۔ وہ مغربی زندگی کے ہر اونچ نیچ سے واقف تھے۔ یورپ کی زندگی سے اس واقفیت اور وہاں کے علوم میں اس دسترس نے ان پر یہ حقیقت ظاہر کر دی کہ یورپ اپنی ترقی یافتہ تہذیب کے باوجود انسانیت کے مصائب دور کرنے سے قاصر ہے۔ زندگی کے تمام پیچیدہ مسائل اقبال کے سامنے تھے اور انھیں حل کرنے کے جتن یورپ والوں نے

کئے تھے، یا کر رہے تھے، ان سب کو انھوں نے ایک ایک کر کے پرکھا۔ مغرب سے مایوس ہوکر انھیں مشرق کی طرف رخ کرنا پڑا۔ اسلامی تعلیمات کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور مغربی فلسفہ کے نقطۂ نگاہ سے ان کا مطالعہ کرنے لگے۔ ان کے سامنے تحقیق وجستجو کے وہ میدان آتے جنھیں کوئی دوسرا مشکل سے طے کر پاتا۔ لیکن وہ اپنی محدودات پر اچھی نگاہ رکھتے تھے۔ مختلف لوگوں کی معاونت حاصل کرتے اور ان میدانوں کے سر کرنے میں کامیاب رہتے۔ اقبال کے اس ذہنی پس منظر کی جھلک ان کے خطوں میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"میری عمر زیادہ تر مغربی فلسفے کے مطالعہ میں گذری ہے اور یہ نقطۂ خیال ایک حد تک طبیعت ثانیہ بن گیا ہے۔ دانستہ یا نادانستہ میں اسی نقطۂ نگاہ سے حقائق اسلام کا مطالعہ کرتا ہوں۔"

اپنے زمانہ کے جید عالموں سے ان کے تعلقات تھے، وہ اقبال کے اس طریقہ پر اعتراض کرتے اور اسے بدعت کے زمرے میں شامل کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اس طریقۂ تحقیق سے اسلامی تعلیمات کی صورت مسخ ہوجائے گی۔ اقبال خود اس حقیقت سے ناواقف نہ تھے۔ وہ اپنے طریقۂ تحقیق کی نزاکت اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اسلامی تعلیمات کی تفسیر میں یورپ کے فلسفہ سے مدد تو لی جاسکتی ہے۔ لیکن بدلا ہرگز نہیں جاسکتا۔ مغربی عینک لگاکر اسلامی تعلیمات میں وہ سب دیکھنا جو اس میں نہیں ہے نہ صرف اسلام کے ساتھ ناانصافی ہے بلکہ علمی تحقیق کے ساتھ خود بڑا ظلم ہے۔ ایک دفعہ انھوں نے رویت باری جیسے نازک مسئلہ پر سید سلیمان ندوی کو چند سوالات لکھ کر بھیجے۔ سید صاحب کو کچھ غلط فہمی ہوگئی۔ جسے اقبال ایک خط میں اس طرح دور کرتے ہیں:۔

"رویت باری کے متعلق جو استفسار میں نے آپ سے کیا تھا اس کا مقصود فلسفیانہ تحقیقات نہ تھی، خیال تھا کہ شاید اس بحث میں کوئی بات ایسی نکل جائے جس سے آئن سٹائن کے انقلاب انگیز نظریۂ نور پر کچھ روشنی پڑے۔ اس خیال کو ابن رشد کے

ایک رسالے سے تقویت ہوئی جس میں انھوں نے ابوالمعالی کے رسالے سے ایک فقرہ اقتباس کیا ہے ابوالمعالی کا خیال آئن شائن سے بہت ملتا جلتا ہے۔ گو مقدم الذکر کے یہاں یہ بات محض ایک قیاس ہے اور موخرالذکر نے اسے علم ریاضی کی مدد سے ثابت کر دیا ہے۔ اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا ہے تاہم مسلک میرا وہی ہے جو قرآن کا ہے اور جس کو آپ نے آیت شریفہ کے حوالہ سے بیان فرمایا ہے"

وقت کے تقاضوں پر اقبال کی نظر

ملت کی نشاۃ ثانیہ کے لئے آج جن باتوں کی اشد ضرورت ہے وہ بیشتر اقبال کے پیش نظر تھیں۔ زمانہ کی سب سے بڑی ضرورت اسلامی تعلیمات کو زندگی کے نئے مسائل کی روشنی میں ترتیب دینے کا کام ہے۔ اپنے خطوں میں اقبال علماء کو اس ضرورت کی طرف متوجہ کرتے نظر آتے ہیں اسلامی تعلیمات کو جورس پروڈنس کی روشنی میں ترتیب دینے کی ضرورت سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں اس طرح واضح کی گئی ہے:۔

"میرا مقصود ہے کہ جورس پروڈنس کی روشنی میں اسلامی معاملات کا مطالعہ کیا جائے مگر غلامانہ انداز میں نہیں بلکہ ناقدانہ انداز میں۔ اس سے پہلے مسلمانوں نے عقائد کے متعلق ایسا ہی کیا ہے۔ یونان کا فلسفہ ایک زمانہ میں انسانی علوم کی انتہا تصور کیا گیا مگر جب مسلمانوں میں تنقید کا مادہ پیدا ہوا تو انھوں نے اسی فلسفہ کے ہتھیاروں سے اس کا مقابلہ کیا۔ اس عصر میں معاملات کے متعلق بھی ایسا کیا جا سکتا ہے"

سید سلیمان ندوی کو وقت کی ایک اور ضرورت کی طرف توجہ دلاتے ہیں:۔

"اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے۔ اس بحث پر مصر میں ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوئی تھی جو میری نظر سے گذری ہے۔ مگر افسوس ہے کہ بہت مختصر ہے اور جن مسائل پر بحث کی سخت ضرورت تھی مصنف نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو میں ان سے ایسی کتاب

لکھنے کی درخواست کرتا۔ موجودہ صورت میں سوائے آپ کے اس کام کو کون کر سکتا ہے۔"

اقبال اپنی محدودات ہر وقت نظر کے سامنے رکھتے تھے۔ اسلامی تعلیمات کو نئی روشنی میں تدوین کے لئے اسلامی علوم میں بڑے وسیع مطالعہ کی ضرورت تھی۔ کسی مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کرتے وقت معاصر علماء سے مدد لینے میں انھیں بالکل عار نہ تھا۔ "اجتہاد" اور "زمان" کی بحث سے اقبال کو بڑی دلچسپی تھی۔ اس سلسلہ میں وہ منکرین اسلام کے آراء کا مطالعہ کر رہے تھے اور اس سلسلہ میں جس تلاش اور جستجو سے کام لیتے۔ اس کا کسی قدر اندازہ خطوں سے ہوتا ہے۔ پہلے وہ خود کتابیں پڑھتے۔ مضمون سے متعلق مختلف علماء کی تحقیق معلوم کرتے، کتابوں کے حوالے دریافت کرتے اور اگر کسی کتاب میں کوئی حصہ ذرا پیچیدہ ہوتا تو کسی عالم سے اس کا خلاصہ کرا کر منگا لیتے اور اس کی روشنی میں کتاب کا دوبارہ مطالعہ کرتے۔ ہر مسئلہ کی تحقیق وہ اسی نہج پر کرتے اور پھر رائے قائم کرتے تھے۔

اقبال اور جدید معاشرتی نظام کی تلاش

دنیا کے پیچیدہ مسائل کا حل اقبال اسلامی تعلیمات میں تلاش کرتے تھے۔ وہ اپنے خطوں میں اکثر اس بات پر غور کرتے ہیں اور دوسروں کو دعوت فکر دیتے ہیں کہ زندگی کے نئے نظام میں مذہبیت کس حد تک باقی رہ سکتی ہے اور کس طرح۔ سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"دنیا اس وقت عجیب کشمکش میں ہے، جمہوریت فنا ہو رہی ہے۔ اور اس کی جگہ ڈکٹیٹر شپ قائم ہو رہی ہے۔ جرمنی میں مادی قوت کی پرستش کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ سرمایہ داری کے خلاف پھر ایک جہاد عظیم ہو رہا ہے۔ تہذیب و تمدن، بالخصوص یورپ میں بھی حالت نزع میں ہے۔ غرضکہ نظام عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے۔ ان حالات میں آپ کے خیال میں اسلام اس جدید تشکیل میں کہاں تک مدد ہو سکتا ہے؟"

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کو اس مسئلہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

"ایک مدت سے ہم سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادت انسانی کے لئے تمام عملی قواعد اس میں موجود ہیں"

اس تمام تحقیق اور جستجو کے لئے اقبال کو نئے معاشرتی نظام کی ضرورت مجبور کرتی ہے۔ وہ ڈاکٹر نکلسن کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں، بلکہ میری قوت طلب وجستجو تو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشرتی نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً یہ ناممکن ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشرتی نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصد وحید ذات پات، رتبہ ودرجہ رنگ ونسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے"

اقبال قوموں کی زندگی میں قدیم اور جدید دونوں عناصر کو یکساں اہمیت دیتے تھے۔ ان کا مسلک یہ تھا کہ جدید نظریات کی روشنی میں قدیم علمی ذخیرہ سمجھنے کی کوشش کی جائے اور قدیم علمی ذخیرہ کو خضر راہ بنا کر جدید نظریات پر نظر ثانی کی جائے۔ ان کے نزدیک صرف یہی ایک راستہ ہے جس پر دنیا اپنی منزل مقصود کی طرف سلامتی کے ساتھ سفر کر سکتی ہے۔ مندرجہ بالا بیان سے بہت سے وہ متنازعہ فیہ سوال بھی حل ہو جاتے جو اقبال کے مطالعہ کے سلسلہ میں لوگوں کے سامنے آئے ہیں۔ "خودی" کے بارے میں اقبال کے خیالات مغربی فلسفہ سے متاثر ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو کس حد تک۔ اس موضوع پر لوگوں نے بڑی زور آزمائی کی ہے۔ خود اپنے کہنے کے مطابق اقبال مسلمان مفکرین اور اسلامی تعلیمات کو مغربی فلسفہ کے نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن اپنی تحقیق کے نتائج میں اسلام کے اصول سے سرمو متجاوز ہونا برداشت نہیں کرتے۔ ڈاکٹر نکلسن کو لکھتے ہیں :۔

"میرا دعویٰ ہے کہ "اسرار" کا فلسفہ مسلمان صوفیا اور حکماء کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے اور تو اور وقت کے متعلق برگسان کا عقیدہ بھی ہمارے صوفیوں کے لئے نئی چیز نہیں۔ قرآن الٰہیات کی کتاب نہیں بلکہ اس میں انسان کی معاش ومعاد کے متعلق جو

کہا گیا ہے پوری قطعیت سے کہا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا تعلق الٰہیات کے مسائل سے ہے۔ عہد جدید کا ایک مسلمان اہل علم جب ان مسائل کو مذہبی تجربات اور افکار کی روشنی میں بیان کرتا ہے جن کا مبدأ اور سرچشمہ قرآن مجید ہے تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ جدید افکار کو قدیم لباس میں پیش کیا جا رہا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ پرانے حقائق کو جدید افکار کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔

اقبال کی وسیع القلبی

اقبال کی ایک خصوصیت جو انھیں دوسرے چوٹی کے ادیبوں اور بڑے آدمیوں سے ممتاز کرتی ہے، ان کی وسیع القلبی ہے۔ ان کے خطوں میں ہمعصر علماء اور ادیبوں سے چشمک زنی کا اشارہ تک نہیں ہے۔ وہ جب بھی اپنے کسی ہمعصر کا ذکر کرتے ہیں تو نہایت احترام کے ساتھ۔ اقبال کے خط سید سلیمان ندوی اور دوسرے علماء کی تعریفوں سے پر ہیں۔ سید صاحب کو وہ کہیں علوم اسلام کی جوئے شیر کے فرہاد کا لقب دیتے ہیں۔ اور کہیں ان کے علمی اور مذہبی کام کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہیں۔ موصوف کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"اگر میری نظر اس قدر وسیع ہوتی جس قدر آپ کی ہے تو مجھے یقین ہے کہ میں اسلام کی کچھ خدمت کرسکتا۔ فی الحال آپ کی مدد سے کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔"

اقبال نے ان لوگوں کے بارے میں صرف ایک دو جگہ کچھ لکھا ہے جو جا و بیجا ان پر یا ان کے کلام پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ لیکن یہاں بھی ان کا انداز بیان احتیاط کے دائرہ سے باہر نہیں ہوتا۔ وہ ایسے لوگوں پر غصہ نہیں ہوتے بلکہ اپنی ہمدردی کا مستحق سمجھتے ہیں۔ ایک دفعہ شملہ سے کسی نے ان کی ایک غزل پر اصلاح فرما کر ان کے پاس بھیجدی۔ اپنے آرٹ کی اس طرح توہین ہوتے دیکھنا اقبال کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ بابو عبدالمجید کو لکھتے ہیں:۔

"یہ کوئی صاحب چھوٹے شملہ سے میری غزل کی اصلاح کر کے ارسال کرتے ہیں۔ میری طرف سے ان کا شکریہ ادا کیجئے اور عرض کیجئے کہ بہتر ہو اگر آپ میر اور داغ کی

اصلاح کیا کریں۔ مجھ گمنام کی اصلاح کرنے سے آپ کی شہرت نہ ہوگی۔ میرے بیگناہ اشعار کو جو حضرت نے تیغ قلم سے مجروح کیا ہے اس کا صلہ انھیں خدا سے ملے۔ میں بھی دعا کرتا ہوں کہ خدا ان کو عقل و فہم عطا کرے۔ میں نے یہ دو حرف محض از راہ ہمدردی تحریر کئے ہیں۔ امید ہے وہ برا نہ سمجھیں گے۔ اکثر انسانوں کو کنج تنہائی میں بیٹھنے سے ہمہ دانی کا دھوکہ ہو جاتا ہے۔ ان کا قصور نہیں فطرت انسان ہی اس قسم کی ہے۔"

"تذکرہ" کے دیباچہ میں مولوی فضل الدین احمد کے بعض فقروں سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ اقبال میں اسلامی علوم کا ذوق الہلال کی تحریروں کی بدولت پیدا ہوا ہے۔ اس سے پہلے وہ اسلامی تعلیمات کے قدردان نہ تھے۔ یہ دیباچہ اقبال کی نظر سے گذرا تو انھوں نے سید سلیمان ندوی کو لکھا۔

"مولانا ابوالکلام کا تذکرہ آپ کی نظر سے گذرا ہوگا۔ بہت دلچسپ کتاب ہے۔ مگر دیباچہ میں مولوی فضل الدین احمد لکھتے ہیں کہ "اقبال کی مثنویاں تحریک الہلال کی بازگشت ہیں۔" شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کئے ہیں ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں۔ اس کے شواہد میری مطبوعہ تحریریں نظم و نثر اردو و انگریزی میں موجود ہیں۔ غالباً جو مولوی صاحب کے پیش نظر تھیں۔ بہرحال اس کا کچھ افسوس نہیں کہ انھوں نے ایسا لکھا۔ مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت ہے نہ نام آوری۔ البتہ اس سے مجھے رنج ہوا کہ ان کے خیال میں اقبال تحریک الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا۔ تحریک الہلال نے اسے مسلمان کیا۔ ان کی عبارت سے ایسا مترشح ہوتا ہے۔ ممکن ہے ان کا مقصود یہ نہ ہو۔ میرے دل میں مولانا ابوالکلام کی بڑی عزت ہے اور ان کی تحریک سے ہمدردی۔ مگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اوروں کی دل آزاری کی جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اقبال کے جو خیالات اس سے پہلے تھے بس آن میں اور مثنویوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔" معلوم نہیں انھوں نے

کیا سنا تھا۔ اور بھی سنائی بات پر اعتبار کر کے ایسا جو کسی صاحب کے کوئی معنی ہو سکتے ہیں کیا یہ
ان لوگوں کے شایان شان نہیں جو اصلاح کے علمبردار ہوں۔ مجھے معلوم نہیں مولوی فضل الدین
صاحب کہاں ہیں۔ ورنہ یہ مؤخر الذکر شکایت براہ راست ان سے کرتا۔ اگر آپ سے ان کی
ملاقات ہو تو میری شکایت ان تک پہنچا دیجئے۔"

اقبال کی شخصیت کے دوسرے پہلو

اقبال اپنے کلام میں امید کا پیام دیتے ہیں یہی رنگ ان کے خطوں کا ہے۔ علمی تحقیق کا کام کرنے والوں کو وہ کبھی مایوس اور افسردہ خاطر نہیں دیکھنا چاہتے۔ ان کے ملنے والوں میں سے کسی پر جب کبھی اس قسم کی حالت طاری ہوتی، وہ اپنے خطوں کے ذریعہ یہ کوشش کرتے کہ یاس و قنوطیت کی یہ حالت جلد دور ہو جائے۔ وہ ہمیشہ اپنے مکتوب الیہ کو امید کا چراغ روشن رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی پر کبھی کبھی اسلام کے مستقبل کے بارے میں مایوسی کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ ایک ایسے ہی موقعہ پر اقبال نے انھیں لکھا۔

"مختصر یہ ہے کہ یورپین افکار کی تاریخ کا اعادہ آج کل دنیائے اسلام میں ہو رہا ہے ان حالات میں جو اس وقت کیفیت آپ کے قلب کی ہے وہ ایک حد تک نیچرل ہے مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ جو کام کر رہے ہیں، وہ امت مسلمہ کے لئے از بس مفید ہے۔ دنیائے اسلام اس وقت ایک روحانی پیکار میں مصروف ہے۔ اس پیکار و انقلاب کا منع متعین کرنے والے قلوب و اذہان پر شک و نا امیدی کی حالت کبھی کبھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا قلب قوی ہے اور ذہن ہمہ گیر۔ آپ اس حالت سے جلد نکل جائیں گے یا صوفیہ کی اصطلاح میں یوں کہیئے کہ اس مقام کو جلد طے کر لیں گے۔ آپ قلندر ہیں مگر وہ قلندر جس کی نسبت اقبال نے یہ کہا ہے

"قلندراں کہ بتاہ تو سخت می کوشند ۔۔۔ زشاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند
بجلوت اند و کمند بمہر و مہ پیچند ۔۔۔ بخلوت اند و زمان و مکاں در آغوشند

آپ اس جماعت کے پیش خیمہ ہیں۔ اس جماعت کا دنیا میں عنقریب پیدا ہونا قطعی اور یقینی ہے۔"

اقبال اپنے خطوں میں علمی تحقیق کرنے والوں کی ڈھارس بندھاتے ہیں۔ ان کے کاموں کو سراہتے ہیں اور ان کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ انھوں نے اکثر انہی لوگوں کو خط لکھے ہیں جو علمی کام کرتے ہیں۔ اقبال انھیں اپنے خطوں میں کام جاری رکھنے اور اسے بہتر بنانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ مثلاً ایک خط میں ظہور الدین مہجور کو کشمیر میں فارسی شعر کی تاریخ لکھنے پر ابھارتے ہیں تو دوسرے میں سید نصیر الدین ہاشمی کو "یورپ میں دکھنی مخطوطات" اور "دکن میں اردو" جیسی کتابیں مرتب کرنے پر داد دیتے ہیں۔ اقبال کو علمی تحقیق کا کام کرنے والوں سے بڑا انس تھا۔ وہ ان کے کام کو اپنا ہی کام سمجھتے تھے۔ جب کبھی ایسی بات نظر پڑتی جو ان میں سے کسی کے کام آسکتی تو وہ اسے فوراً مطلع کر دیتے تھے۔ علی گڑھ کے ایک ریسرچ اسکالر نے اقبال کو امام غزالی کے فلسفۂ اخلاق پر اپنا ایک مقالہ بھیجا تو انھوں نے اس کی بہت تعریف کی، اور مزید تحقیق و تفتیش جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ تقریباً ایک ماہ بعد انھیں اس مضمون پر انگریزی میں ایک کتاب مل گئی جو فاضل مقالہ نگار کے کام آسکتی تھی۔ اقبال کی طبیعت کیسے مانتی کہ اس کتاب کی موصوف کو اطلاع نہ ہو۔ پتہ یاد نہ تھا اس لئے ڈاکٹر ظفر الحسن کو لکھ بھیجا:۔

"آپ کے شاگرد رشید محمد عمر الدین صاحب نے کچھ عرصہ گذرا مجھے الغزالی پر ایک چھوٹی سی کتاب ارسال فرمائی تھی، ان سے کہیئے کہ مارگریٹ اسمتھ کی کتاب An Early Mystic of Baghdad حارث ابن اسد المحاسبی کا جو چند ماہ قبل شائع ہوئی ہے مطالعہ کریں۔ انھیں چاہیئے کہ اس کتاب کا ایک ایک لفظ نہایت غور سے پڑھیں۔ اس کتاب سے انھیں نہ صرف غزالی کی تعلیمات سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی، بلکہ غزالی کی مدد سے مشرق و مغرب کے یہودی اور عیسائی تصوف پر محاسبی کے اثرات کا بھی معقول اندازہ ہو سکے گا۔"

اقبال کی فقر پسندی

اقبال فطرتاً درویش صفت اور قناعت پسند تھے۔ وہ زندگی بھر معاشی دشواریوں کا مقابلہ کرتے رہے لیکن [illegible] ان کا ذکر تک [illegible] ان کا

ہی جھلک نظر آتی ہے۔ حیدرآباد اور بھوپال کے فرمانروا بہت سے اہلِ علم کی سرپرستی کر رہے تھے اقبال چاہتے تو ان سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی طرف سے کبھی اس قسم کی تحریک نہ کی۔ آخری عمر میں انھیں ریاست بھوپال سے جو پنشن ملنے لگی تھی، وہ راس مسعود کی تحریک کا نتیجہ تھی۔ اور اقبال نے اسے محض اس لئے قبول کر لیا تھا کہ وہ قرآن کریم سے متعلق اپنے افکار قلمبند کرنے کے لئے بے چین تھے اور اس کام کے لئے معاشی فکر سے فراغت کی ضرورت تھی۔ آغا خاں بھی اقبال کے لئے ایک ماہوار رقم مقرر کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ اسے قبول کرنے سے انکار کرتے رہے۔ راس مسعود مصر تھے کہ یہ پیشکش بھی قبول کر لی جائے۔ اقبال نے تنگ آکر انھیں لکھ بھیجا "میں آپ کو اپنا دوسرا سیلف (Self) خیال کرتا ہوں۔ اس واسطے جو کچھ آپ لکھتے ہیں اس پر عمل کرتا ہوں۔" لیکن قناعت پسند طبیعت اس فیصلہ سے مطمئن نہ تھی۔ اس لئے ایک دوسرے خط میں لکھا۔

"اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لئے مقرر فرمائی ہے وہ میرے لئے کافی ہے اور اگر کافی نہ بھی ہو تو میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا روپیہ کا لالچ ہے۔ جو کسی طرح بھی کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ آپ کو میرے اس خط سے یقیناً کوئی تعجب نہ ہوگا۔ کیونکہ جن بزرگوں کی آپ اولاد ہیں اور جو ہم سب کے لئے زندگی کا نمونہ ہیں ان کا شیوہ ہمیشہ سادگی اور قناعت رہا ہے۔ ان حالات پر نظر کرتے ہوئے مجھے اس رقم کو قبول کرتے حجاب آتا ہے۔"

راس مسعود کے اصرار کا خیال کرکے لکھتے ہیں۔

"اگر آپ کو اس سے اتفاق نہیں ہے اور اب اس تجویز کا واپس کرنا قرین مصلحت نہیں ہے تو پھر میں ایک اور تجویز پیش کرتا ہوں اور وہ یہ کہ ہز ہائینس آغا خاں یہ پنشن جاوید کو عطا کر دیں۔ اس وقت تک کہ اس کی تعلیم کا زمانہ ختم ہو جائے یا اس وقت تک کہ ہز ہائینس مناسب تصور کریں۔"

جن وجوہ سے بعض نادان دوست مکاتیب اقبال کی اشاعت روکنا چاہتے تھے ان میں سے اقبال کے اس خط کو بھی بتایا جاتا ہے۔ اس میں جاوید کے لئے پنشن کی تجویز ہے جو اقبال پر تصور کے اقبال کی شان استغنا کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ تجویز اقبال نے راس مسعود کے اصرار پر بوجہ مجبوری پیش کی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا اس سے اقبال کی قناعت پسندی پر کیا آنچ آتی ہے

اقبال دنیاوی اعزاز سے بالکل بے نیاز تھے۔ جب انھیں سر کا خطاب ملا اور غلام بھیک نیرنگ نے انھیں مبارکباد دی تو اقبال نے انھیں لکھ بھیجا۔

"میں آپ کو اس اعزاز کی خود اطلاع دیتا۔ مگر جس دنیا کے میں اور آپ رہنے والے ہیں، اُس دنیا میں اس قسم کے واقعات احساس سے فروتر ہیں۔ سیکڑوں خطوط اور تار آئے اور آرہے ہیں اور مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ لوگ ان چیزوں کو کیوں گراں قدر جانتے ہیں۔ باقی رہا وہ خطرہ جس کا آپ کے قلب کو احساس ہوا ہے سو قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضہ میں میری جان اور آبرو ہے اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی جس کی وجہ سے مجھے خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں، دنیا کی کوئی قوت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ انشاء اللہ اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں لیکن اس کا دل مومن ہے"

آل احمد سرور کے الفاظ میں "ان خطوں کی خالص انشا، یا اسلوب کے لحاظ سے بڑی اہمیت نہیں ہے، اس لحاظ سے یہ غالب کے خطوط کے برابر نہیں ہیں مگر ان سے غالب کے خطوں سے کم معلومات شاعر کے متعلق نہیں ملتیں اور یہ ان کے صاف، واضح اور آئینہ کی طرح روشن ذہن کی اچھی تصویریں ہیں"

شمس الرحمٰن

آسٹریلیا میں ابتدائی تعلیم

تمام آسٹریلیا میں چھ سال سے چودہ سال تک کے بچوں کے لئے جبریہ اور مفت تعلیم کا انتظام ہے۔ البتہ تسمانیہ میں سات سال کی عمر سے جبری تعلیم شروع ہوتی ہے۔ اور نیو ساؤتھ ویلز میں پندرہ سال کی عمر تک لازمی ہے۔

ابتدائی مدارس جن مقاصد کو پیش نظر رکھ کر طلباء کی نشوونما میں مدد کرتے ہیں وہ یہ ہیں:-

جسمانی، ذہنی اور اجتماعی

مگر اب تک زیادہ توجہ ذہنی تربیت پر تھی۔ لیکن دوسری چیزوں کی طرف سے بھی غفلت نہیں برتی گئی۔ چھ چھوٹی ریاستیں اپنے اپنے نظام تعلیم کا خود انتظام کرتی ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر سب یکساں ہیں چند سالوں سے تعلیمی مسائل میں وفاقی حکومت کی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے اور اس نے اس امداد میں جو ریاستوں کی طرف سے دی جاتی ہے۔ ایک گرانقدر امداد سے اضافہ کر دیا ہے مثلاً ۴۶-۱۹۴۵ء کے بجٹ میں وفاقی حکومت نے تعلیم کے لئے پچاس لاکھ پونڈ کی رقم مخصوص کر دی تھی جو اس امداد کے علاوہ تھی جو ریاستوں کے مشترکہ بجٹ میں ایک کروڑ چالیس لاکھ پونڈ کی تھی۔

چھ سالہ نصاب

ابتدائی مدارس کا مکمل نصاب پورے چھ سال کا ہے۔ نصاب بہت [illegible] سمجھ کر آج کل کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے تیار کیا گیا ہے جن مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے وہ یہ ہیں:-

پڑھنا، لکھنا، صرف و نحو اور انگریزی میں اپنے خیالات کو آسانی سے بیان کرنا

(زبانی اور تحریری) جیومیٹری کا عملی کام۔ سادہ الجبرا۔ اخلاقی اور شہری تعلیم۔ تاریخ۔ جغرافیہ، مطالعہ قدرت اور ابتدائی سائنس۔ مصوری آسان حرفوں میں جسمانی ریاضت۔ موسیقی۔ لڑکیوں کے لئے سینا پرونا۔ لڑکوں کے لئے فوجی ورزش اور لڑکے لڑکیوں کے لئے عام جسمانی ورزش۔

ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد اس قسم کا ایک تصدیق نامہ مل جاتا ہے کہ اگر طالب علم چاہے تو وہ اپنی تعلیم ثانوی مدرسہ میں جاری رکھ سکے۔

ابتدائی مدارس کے نصاب میں کھیلوں کی ایک خاص اہمیت ہے۔ کھیلوں میں کرکٹ۔ فٹ بال (رگبی آسٹریلین طرز پر) سوفٹ بال   ہاکی۔ ٹینس۔ کشتی کھینا اور تیراکی وغیرہ شامل ہیں۔ مدرسے کھیلوں میں برابر ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے ہیں۔ اور اس معاملہ میں ایک دوسرے سے خوب مقابلہ ہوتا ہے۔ عام طور پر ہفتہ میں دو دن خاص طور پر اس مقصد کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔

اسکولوں کی تعداد

دولت مشترکہ میں (   ) آٹھ ہزار سے زیادہ مدرسے حکومت کی طرف سے قائم ہیں جن میں نو لاکھ سے زیادہ بچے حکومت کی طرف سے بالکل مفت تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دو لاکھ پچیس ہزار بچے ایسے غیر سرکاری مدرسوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں جو سرکار سے منظور شدہ ہیں۔ اور ان طلباء کی تعداد الگ ہے جو صرف گھر پر ہی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ایسے طلبہ تینتیس ہزار سے زیادہ ہیں۔ ان طلباء میں زیادہ تر ایسے ہیں جو سرکاری خط و کتابت کے اسکولوں (   ) کے ذریعہ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

بہت کم غیر آباد علاقوں میں بھی اسکولوں کی کمی نہیں ہے۔ نیو ساؤتھ ویلز کی ریاست میں چھ اور پندرہ سال کی عمر کے دس یا دس سے زیادہ بچوں کے لئے ایک مدرسہ قائم کر دیا جاتا ہے۔ دوسری ریاستوں میں اس سے بھی کم تعداد کے لئے مدرسہ قائم کر دیا جاتا ہے۔ جو طلباء مدرسے سے کچھ فاصلہ پر رہتے ہیں ان کو لانے کے لئے بسوں کا انتظام ہے۔ بعض [illegible] کو ریل یا بس سے مفت سفر

کرنے کے لئے پاس بالکل مفت دئے جاتے ہیں۔ باکرایہ میں خاص رعایت کی جاتی ہے۔

طبی امداد کا بھی بہت معقول انتظام ہے اور سال میں ایک دفعہ خاص طور پر طبی معائنہ ہوتا ہے جس میں پوری توجہ سے ہر ایک چیز کا معائنہ کیا جاتا ہے۔ خیال ہے عنقریب ہی اس سلسلہ میں کوئی اور قدم اٹھایا جائے گا۔

تعلیم کے جدید وسائل

مدرسوں میں نئے وسائل سے بھی تعلیم میں خاص طور پر مدد لی جاتی ہے۔ چنانچہ ریڈیو اور فلم کا باقاعدہ استعمال کیا جاتا ہے اور جیسے ہی یہ چیزیں آسانی سے ملنے لگیں گی ان کا استعمال تمام مدرسوں میں ہونے لگے گا۔

حکومت کے مدارس کے علاوہ غیر سرکاری مدارس کا بھی جو عام طور پر کلیسا یا کسی مذہبی جماعت کے قائم کردہ ہیں تعلیمی نظام میں خاص دخل ہے غیر سرکاری مدارس میں جو بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں ان میں سے ستتر فیصدی (۷۷٪) رومن کیتھولک مدرسوں میں پڑھتے ہیں لیکن بعض دوسری مذہبی جماعتوں کے مدرسے بھی ملک کے بہترین مدرسے شمار کئے جاتے ہیں۔ ان تمام اسکولوں کے نصاب بھی حکومت کے شعبہ تعلیم کے منظور شدہ ہوتے ہیں۔ شعبہ تعلیم برابر اس بات پر نظر رکھتا ہے کہ کسی چیز کو غیر اہم سمجھ کر اس سے غفلت نہ برتی جائے۔

نبی احمد

تبصرے

پسپائی: مقبول احمد صاحب سیوہاروی، اس سے پہلے سیرتِ پاک اور سیرِ صحابہ پر بچوں کے لئے بعض بڑی مفید کتابیں لکھ چکے ہیں۔ "پسپائی" میں انہوں نے ترقی پسند ادب پر تنقید فرمائی ہے زیرِ نظر کتاب کے خلاصۂ مطلب کو موصوف نے شروع ہی میں "دو لفظ" میں پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں

"یہ مضمون جسے آپ ابھی پڑھیں گے، ایک گھٹی ہوئی آہ اور دبی ہوئی چیخ ہے، جو عریاں اور گندے لٹریچر کو دیکھ کر بے اختیار نکل گئی ہے۔ نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا ہو جانے والے ضدیوں نے مقابلے میں تو اس کا نقش بھی نہیں کھینچا جا سکتا کہ اسے پڑھ کر اصلاح پر مائل ہوں گے۔ تاہم فرض نتیجہ سے بے پرواہ ہوتا ہے"۔

یہ مضمون ۱۳۹ صفحے پر مشتمل ہے، کتابت و طباعت اس زمانے کے اعتبار سے بہت اچھی ہے۔ مصنف نے خود ہی اسے طبع فرمایا ہے ۔ قیمت کتاب پر درج نہیں

ترقی پسند ادب پر اس مضمون میں جو کچھ لکھا ہے وہ خالص اخلاقی نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے اور ظاہر ہے صاحبِ مضمون کا جو اخلاقی تصور ہے، ضروری نہیں کہ وہ اوروں کا بھی ہو، دراصل یہ ادبی اور اجتماعی موضوع ہے، اس تنقید میں خاص طور پر اس کو ملحوظ رکھتے تو بہتر تھا۔

نشری تقاریر: مولوی عبدالرحمٰن صاحب سابق پرنسپل جامعہ عثمانیہ نے تقریباً حیدرآباد سے سائنس کے مختلف موضوعات پر پندرہ تقریریں نشر کی تھیں۔ زیرِ نظر کتاب میں ان تقاریر کو جمع کر دیا گیا ہے، اردو زبان میں سائنس کی عام معلومات کے متعلق بہت کم کتابیں ملتی ہیں

ان نشری تقاریر میں اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے ستاروں پر زندگی کے امکانات، زمین کا کرہ ہوائی، دُم دار ستارے، اور تاروں کی بستی وغیرہ بہت مفید تقریریں ہیں، لیکن ان کی زبان جتنی آسان ہونی چاہئے، ویسی نہیں ہے۔ بہرحال ان مسائل کو سمجھنے کے لئے یہ کتاب بہت حد تک مفید ثابت ہوگی۔

ناشر ادارۂ نشریات اردو۔ ضخامت ۱۴۸ قیمت ایک روپیہ چودہ آنے۔ (م۔ س)

تاریخ نامہ ہرات (فارسی): از سیف بن محمد بن یعقوب الہروی

یہ کتاب آٹھویں صدی ہجری یا چودھویں صدی کے شروع میں تالیف ہوئی تھی۔ جب عالم اسلام میں تاریخ نگاری کا فن عروج کو پہنچ چکا تھا۔ تھوڑے ہی دن پہلے ابن خلدون کی مشہور تاریخ اور مشہور تر مقدمہ جس نے علمی دنیا کو فلسفۂ تاریخ کے تصور سے روشناس کیا لکھا جا چکا تھا۔ ہرات اس زمانے میں ایک خوش سواد، خوشنما آباد اور دولت مند شہر تھا اور کرت خاندان کی چھوٹی سی ریاست کا دارالسلطنت تھا جو دوسری اسلامی ریاستوں کی طرح علم و ادب کی بڑی قدردان تھی، اسی وجہ سے شہر ہرات ایک اہم علمی مرکز اور باکمال علماء اور شعرا کا مرکز بن گیا۔ اس سے پہلے ہرات کی کئی تاریخیں لکھی جا چکی تھیں مگر وہ معدوم ہو چکی ہیں، اس لئے زیر نظر کتاب ہرات کی سب سے قدیم تاریخ ہے جو دستیاب ہوئی ہے۔ اس میں چنگیز خاں کے حملے سے لے کر ملک غیاث الدین کرت کے زمانۂ حکومت تک سو سال کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ بعد کے مورخوں نے اسے نہایت قابلِ وثوق اور مستند قرار دیا ہے اور عہد تیموری کے جید مورخ اور جغرافیہ داں حافظ عبداللہ آبرو نے اپنی کل تصانیف خصوصاً ذیل جامع التواریخ میں اس سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔

اس کتاب کا صرف ایک ہی معتبر نسخہ موجود ہے۔ شاہجہاں کے مہتمم کتب خانہ عنایت خاں کا باپ ظفر خاں صوبہ دار کابل و کشمیر اپنے ساتھ لایا تھا۔ اب یہ نسخہ امپیریل لائبریری کلکتہ میں موجود ہے۔ سب سے پہلے اس کی تصحیح و طباعت کا خیال خان بہادر مولوی عبدالمقتدر صاحب کو آیا اور انہوں نے ۱۹۱۳ء میں بڑے اہتمام سے اس کے ۱۲۰ صفحے چھپوا کر شایع کئے مگر ان کی علالت

کی وجہ سے سلسلہ رک گیا۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں جناب ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صاحب پروفیسر کلکتہ نے اپنے ہاتھ میں لیا اور سنہ ۱۹۳۵ء سے بقیہ ۶۶۶ صفحے کی تہذیب کا کام شروع ہو کر کتاب کی طباعت ہوئی۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۹۴۲ء میں پوری کتاب مکمل ہو کر شایع ہوگئی۔

کتاب صوری اور معنوی حیثیت سے اسی شان کی ہے جیسا کہ امپیریل لائبریری کی مطبوعات کو ہونا چاہئے۔ نہایت نفیس کاغذ پر خوشنما ٹائپ میں چھپی ہے۔ اس کے ساتھ مرتب کا فاضلانہ مقدمہ انگریزی میں اور اس کا ترجمہ فارسی میں ہے۔ آخر میں ایک انڈکس اشخاص کے ناموں اور ایک مقامات اور قبائل کے ناموں کا ہے۔ افسوس ہے کہ کتاب میں طباعت کی غلطیاں بہت رہ گئیں جس کی وجہ سے ایک طویل غلط نامے کا اضافہ کرنا پڑا۔ قیمت درج نہیں ہے۔

شیطان: خلیل جبران کے ۱۰ ادبی مضامین اور افسانوں کا مجموعہ۔ مترجمہ حکیم حبیب اشعر صاحب دہلوی۔ ناشر رائل بک ڈپو دہلی $\frac{20\times30}{16}$ تقطیع کے ۱۴۴ صفحے۔ قیمت عمر

خلیل جبران اُن انشا پردازوں میں سے ہے جن کی تحریریں دقتِ فکر اور ندرتِ خیال، شدتِ احساس اور زورِ بیان کے ساتھ مل کر کچھ عجیب لطف اور اثر پیدا کر دیتی ہے۔ اس مجموعے میں افسانے کم ہیں اور جو ہیں بھی ان میں قصہ برائے نام ہے۔ اصل مقصد گہرے رومانی مذہبی اور اخلاقی جذبات کا اظہار ہے جس میں مصنف کے کمالِ انشا پردازی نے خشکی اور گرانی کے بجائے لطافت اور دل آویزی پیدا کر دی ہے۔ حبیب اشعر صاحب کا ترجمہ بھی تصنیف کے شایانِ شان ہے۔ ترجمے کا سب سے مشکل پہلو یہ ہے کہ ایک طرف غیر زبان کے جملوں کی ساخت اور الفاظ کی ترتیب کو قایم رکھنے کی کوشش کرنی پڑتی ہے تاکہ اصل کا لطف قایم رہے، اور دوسری طرف عبارت کو اپنی زبان کے روزمرہ کے سانچے میں ڈھالنا پڑتا ہے۔ حبیب اشعر صاحب نے اس مشکل کو بہت کچھ حل کر لیا ہے۔ (ع۔ح)

سیاسی دنیا

ہنگری

روس کی خارجی سیاست کے مقاصد میں سب سے اہم منصوبہ یہ ہے کہ وسطی اور جنوب مشرقی یورپ کا کوئی ملک ایسا رویہ اختیار نہ کر سکے جس سے روس کو کسی طرح کا نقصان پہنچے یا اس کے لئے کوئی خطرہ پیدا ہو۔ اس منصوبے میں کامیابی کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ان ملکوں میں کمیونسٹ حکومتیں ہوں اور ان کی خارجی سیاست کے تمام مسائل ماسکو میں طے ہوں۔ لیکن کمیونسٹ حکومت قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان ملکوں میں کمیونسٹ پارٹیاں ہوں جن کے اراکین کی تعداد اتنی ہو کہ وہ جمہوری اصول کے مطابق حکومت کی حقدار مانی جا سکیں۔ وسطی اور جنوب مشرقی یورپ کے ہر ملک میں ایک کمیونسٹ پارٹی ہے جس کا مرکز ماسکو میں ہے، اور اگرچہ بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک کا مرکز، "کومنترن" ۱۹۴۳ء میں توڑ دیا گیا اور اس طرح روسی حکومت نے اعلان کر دیا کہ اب وہ کمیونسٹ تحریک کو دوسرے ملکوں میں پھیلانا نہیں چاہتی، پولینڈ ہنگری، آسٹریا وغیرہ کی کمیونسٹ پارٹیوں کا روسی حکومت سے باضابطہ نہیں تو بے ضابطہ تعلق ضرور ہے۔ لیکن کسی ملک میں کمیونزم کے ماننے والوں کی تعداد اتنی نہیں ہے کہ وہ اپنے بل بوتے پر حکومت کر سکیں۔ اس لئے انہیں تقویت پہنچانے کی دوسری تدبیریں کی گئی ہیں اور اب بھی کی جا رہی ہیں۔ روسیوں نے اس کا بہت اہتمام کیا ہے کہ جن ملکوں اور علاقوں میں ان کی فوجی حکومت ہے ان کے حالات کا باہر کے لوگوں کو علم نہ ہو سکے، لیکن بہت سی باتیں چھپائی نہیں جا سکی ہیں۔ روسیوں نے کہیں بھی کمیونسٹ پارٹی

کی حکومت زبردستی قائم نہیں کی ہے مگر ہر ملک میں وہ آہستہ آہستہ معاشی نظم میں ایسی تبدیلیاں
کر رہے ہیں جن کی بدولت خیال ہے کہ ابھی نہیں تو چند سال بعد ایسے طبقے پیدا ہو جائیں گے
جن کی اغراض "انقلاب" سے وابستہ ہوں گی۔

مگر اب تک کہیں بھی اس کے آثار نہیں نظر آتے ہیں کہ معاشی تبدیلیوں کا نتیجہ کومیونسٹ
پارٹی کی حکومت ہوگی۔ روسی جب دیکھتے ہیں کہ کومیونسٹوں کی تعداد اور قوت کسی طرح نہیں
بڑھتی تو وہ کوشش کرتے ہیں کہ جو پارٹی بڑی اور حکومت پر حاوی یا بہت بااثر ہو اس کی
قوت گھٹ جائے۔ دو برس ہوئے بلغاریہ میں یہ تدبیر اختیار کی گئی تھی اور حال ہی میں خبر آئی
ہے کہ بلغاریہ، رومانیہ اور یوگوسلاویہ میں ممتاز لیڈر جو حکومت سے اختلاف کرتے تھے گرفتار
کر لئے گئے ہیں ہنگری میں فروری سے "تھوڑی پونجی والوں" کی پارٹی کے خلاف کارروائیاں کی
جا رہی ہیں اور اب اس معاملہ کو ایک اہم بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

یہ پارٹی پچھلے انتخابات میں کامیاب ہوئی تھی اور اسی کو وزارت بنانے کا اختیار ملا
کومیونسٹوں نے انتخابات میں شکست کھانے کے بعد اس پارٹی کی ہر ممکن طریقے سے مخالفت
شروع کی، مگر چونکہ ملک میں ان کا اثر بہت کم ہے، اس مخالفت سے "تھوڑی پونجی والوں"
کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جا سکا جب اس کا یقین ہو گیا کہ دستوری حدود کے اندر مخالفت
کرنے سے حکومت کو کمزور نہیں کیا جا سکتا تو دوسرے طریقے اختیار کئے گئے۔ فروری میں روس
کی فوجی حکومت نے "تھوڑی پونجی والوں" کی پارٹی کے جنرل سکریٹری بیلا کوواکس کو گرفتار کر لیا
اور اس کا سبب یہ بتایا کہ حکومت کے خلاف ایک بڑے پیمانے کی سازش کا سراغ لگایا گیا
ہے۔ یہ بات ذرا مشکل سے یقین کی جا سکتی ہے کہ جس پارٹی کی حکومت ہو اسی کا جنرل سکریٹری
اس کے خلاف سازش کرے، اور جب برطانیہ اور متحدہ ریاستوں نے اعتراض کیا کہ بیلا کوواکس
کی گرفتاری ایک سیاسی کارروائی ہے اور یالٹا کے معاہدے کی رو سے یہ کارروائی ان کے
مشورے سے ہونا چاہئے تھی تو انہیں جواب دیا گیا کہ سازش کی وجہ سے روسی فوج کے

سے خطرہ پیدا ہوگیا تھا اور روس کی فوجی حکومت کو حق ہے کہ وہ اپنی حفاظت کی تدبیریں اختیار کرے۔ کوواکس کے گرفتار ہوتے ہی کومیونسٹوں نے شور مچایا کہ پارٹی کے اور لوگ بھی ہیں جنھیں قید کر دینا چاہیے اور ایک ایک دو دو کر کے پارلیمنٹ کے اور ارکین غائب ہونے لگے۔ "تھوڑی پونجی والوں" کی وزارت جانتی تھی کہ اس کے اقتدار کی حقیقت کیا ہے اس نے ان گرفتاریوں کو گوارا کیا اور اپنا کام کرتی رہی۔ کومیونسٹوں نے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ ان گرفتاریوں کا مقصد یہ ہے کہ پارلیمنٹ میں ان کے مخالفوں کی تعداد کم ہو جائے یہاں تک کہ کومیونسٹ پارٹی کو وزارت بنانے کا موقع مل جائے پانچ مہینے تک گرفتاریاں کرنے کے باوجود اب تک حکومت "تھوڑی پونجی والوں" ہی کے ہاتھ میں ہے مگر اب ایک طرف اس پارٹی کی قوت برداشت جواب دے رہی ہے اور دوسری طرف روسی چاہتے ہیں کہ اتحادیوں کے جنوب مشرقی یورپ کے معاملات پر گفتگو کرنے اور یہاں کے ملکوں کے معاہدے کرنے سے پہلے ہنگری میں کومیونسٹ پارٹی کے اقتدار کو مستحکم کر دیا جائے۔ روسی اپنے ارادوں کو چھپانا ضروری نہیں سمجھتے اور غالباً اس وجہ سے کہ انھیں معلوم ہوگیا تھا کہ اب بڑی تعداد میں گرفتاریاں ہونے والی ہیں۔ ہنگری کے وزیر اعظم موسیوناگی صحت کی خاطر سوئٹزرلینڈ چلے گئے ایک دو وزیر اور پارلیمنٹ کے چند ممتاز رکن مئی کے آخر میں روپوش ہو گئے۔ اب موسیوناگی نے استعفیٰ دے دیا ہے ہنگری کے بعض سفیروں کو واپس بلایا گیا تو انھوں نے اور سفارت کے اور متعلقین نے بھی استعفے دیدیئے اور وطن واپس جانے سے انکار کر دیا۔ متحدہ ریاستوں نے ہنگری کو جو قرض دینے کا وعدہ کیا تھا اس پر عمل درآمد کرنے کی ممانعت کر دی ہے پریزیڈنٹ ٹرومین نے بیان دیا ہے کہ موسیوناگی کو اس طرح برطرف کرنا بڑی زیادتی ہے اور متحدہ ریاستوں اور برطانیہ عظمیٰ کی وزارت خارجہ نے مطالبہ کیا ہے کہ ہنگری کو سازش کے سلسلے میں جو کچھ دریافت کیا گیا ہے اس کے متعلق صحیح اطلاعات اور کاغذات نہیں محفوظ کرنے کے لیے دیے جائیں یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ ہنگری کا معاملہ متحدہ اقوام کے

سامنے پیش کیا جائے گا۔ لطف یہ ہے کہ اس ہنگامے کے باوجود اب بھی ہنگری کی پارلیمنٹ میں "تھوڑی پونجی والوں" کی اکثریت ہے اور موسیوناگی کے استعفے کے بعد جو وزارت بنی ہے اس میں بھی کومیونسٹ پارٹی کی بس نمایندگی ہے۔

انڈونیشیا

۲۵ مارچ کو ہولینڈ اور انڈونیشیا کی جمہوری حکومت کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا جس میں یہ بنیادی بات طے ہوگئی تھی کہ انڈونیشیا آزاد اور خود مختار ہے اور ہالینڈ اور اس کی سابق نوآبادیوں کے لئے ایک وفاقی دستور مرتب کیا جائے گا جس میں انڈونیشیا ایک خود مختار رکن کی حیثیت سے شریک ہوگا۔ معاہدہ ہو جانے کے بعد ہالینڈ کی حکومت نے ان بندرگاہوں اور شہروں کے گرد جہاں اس کا قبضہ ہے فوجی کارروائیاں جاری رکھیں، اور ان کا کچھ نتیجہ نکلتا تو غالباً ۲۵ مارچ کا معاہدہ منسوخ کر دیا جاتا۔ لیکن انڈونیشیا کی قومی حکومت ہر محاذ پر جنگ کے لئے تیار تھی اور لڑائی کرنے سے ہالینڈ کی حکومت قوت کا توازن بدل نہ سکی۔ فوجی کارروائیوں کے ساتھ ساتھ اس کی بھی کوشش کی گئی کہ انڈونیشیا میں مقامی آزادی کی تحریکوں کو ابھارا جائے بلکہ مقامی خود مختاری کی وبا پھیلائی جائے۔ اس سلسلے میں سُندا علاقے کی آبادی کے بعض عناصر کو خود مختاری کا مطالبہ کرنے پر آمادہ کیا گیا، مگر انڈونیشیا کے قوم پرستوں میں دوست اور دشمن اور دشمن کے دوست میں تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے اور اگرچہ سُندا میں کئی مظاہرے کئے گئے، خود مختاری کی تحریک بہت کمزور اور بے بنیاد رہی۔ ہالینڈ کے چاروں طرف سمندر پر قبضہ ہے اور اگرچہ اس وقت ہالینڈ کو آسٹریلیا یا یورپ اور امریکہ سے کوئی مدد نہیں پہنچ رہی ہے، وہ انڈونیشیا کا بلوکیڈ کئے ہوئے ہے۔ انڈونیشیا کی قومی حکومت کا ملک پر اور وہاں تیل اور معدنیات کے ذخیروں پر قبضہ ہے اور امریکہ اور یورپ کے کارخانوں کو ان ذخیروں کی بہت ضرورت ہے۔ قومی حکومت چاہتی ہے کہ معاملہ براہ راست ان سے کیا جائے اور ہالینڈ کے سرمایہ

چاہتے ہیں کہ وہ حسب سابق انڈونیشیا کے مال اور مالیات پر حاوی رہیں ۲۹ مئی کو ہالینڈ کی طرف سے لڑائی کو بند اور سیاسی اور معاشی مسائل کو حل کرنے اور عارضی سیاسی انتظامات اور تقسیم کار کو ایک قانونی شکل دینے کے متعلق ایک تجویز پیش کی گئی جسے انڈونیشیا کی قومی حکومت نے منظور کر لیا ہے اب بھی اس کا یقین نہیں ہے کہ ہالینڈ کی طرف سے بدمعاملگی نہ ہوگی مگر کشمکش کا ایک دور بظاہر ختم ہوگیا ہے۔

مارگیٹ میں لیبر پارٹی کی سالانہ کانفرنس

برطانیہ کی لیبر پارٹی کی ایک سالانہ کانفرنس ہوتی ہے جس میں پارٹی کے عہدہ داروں کے کام کا جائزہ لیا جاتا ہے اور پارٹی کے طریق کار پر بحث ہوتی ہے اس سال کانفرنس کے سامنے مسٹر بیون کو برطانیہ کی خارجی پالیسی کے متعلق بیان دینا تھا اور پوری وزارت کو سمجھانا تھا کہ داخلی معاملات میں جو طرز عمل اختیار کیا گیا ہے وہ صحیح ہے۔ برطانیہ کے کمیونسٹ لیبر پارٹی میں شامل نہیں ہو سکتے ہیں اور برطانیہ کی خارجی سیاست پر انہیں جو اعتراض ہیں ان کے جواب دینے کی ذمہ داری مسٹر بیون پر نہیں تھی لیکن بہت سے لوگ اس بات پر پریشان ہیں کہ برطانیہ اور روس کے درمیان مخالفت بڑھتی جا رہی ہے اور ان لوگوں کو مطمئن کرنا ضروری تھا۔ مسٹر بیون پارٹی کے لوگوں کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہوئے اور بہت بڑی اکثریت نے ان کی تائید کی، مگر روسی اس پر اور خفا ہو گئے۔ روسی اخباروں نے مسٹر بیون کو جس طرح برا بھلا کہا وہ انگریزوں کو پسند نہیں آسکتا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مسٹر بیون نے روسیوں کی ذہنیت اور طرز عمل کی جو شکایتیں کی تھیں ان کی تصدیق ہو گئی۔ نومبر میں خارجی وزیروں کی جو کانفرنس ہونے والی ہے اس میں مسٹر بیون روسی مطالبوں کو مان نہ سکے، اور برطانیہ اور متحدہ ریاستوں نے طے کیا کہ وہ جرمنی کے معاملے میں روسیوں سے اتحاد عمل نہیں کر سکتے تو مسٹر بیون کو یقین ہوگا کہ ان کی قوم ان کے ساتھ ہے اور کانفرنس میں وہ بہت کشادہ دلی اور اطمینان سے گفتگو کریں گے۔

لیبر پارٹی نے پارلیمنٹ میں جبری بھرتی کو جاری رکھنے کے متعلق ایک قانون منظور کرا لیا ہے
انگریز جنگ کے زمانے میں ہر ضروری قاعدے پر عمل کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ امن کے دور میں شہریوں
کو فوجی تربیت حاصل کرنے پر مجبور کرنا ان کی طبیعت اور روایات کے خلاف ہے کیونکہ اس قاعدے سے
جنگ جوئی کے جذبے کی پرورش ہوتی ہے لیکن مارگیٹ میں وزارت نے ثابت کر دیا کہ جنگ کے لئے
تھوڑی سی تیاری کر لینے میں اتنا نقصان نہیں جتنا کہ تیار نہ ہونے میں ہے، اور اپنے دعوے کے ثبوت
میں انھوں نے پچھلی جنگ کے تجربوں کو پیش کیا۔ ان کی دلیلیں ایسی تھیں کہ کانفرنس نے مجبور ہو کر ایک
بہت ہی انقلابی کارروائی کو منظور کر لیا۔

کانفرنس کی بحثوں نے برطانیہ کے سوشلسٹوں اور سرمایہ داروں کی ذہنیت پر بھی روشنی
ڈالی مسٹر موریسن نے ان سرمایہ داروں اور کارخانوں کے منتظموں کی تعریف کی جو حکومت کے
بنائے ہوئے قاعدوں پر دیانت داری سے عمل کرتے ہیں اگرچہ انھیں حکومت کی پالیسی سے اصولی
اختلاف ہے اور وہ قاعدوں کو اپنے حق میں مفید نہیں سمجھتے۔ مسٹر موریسن نے مزدوروں کو متوسط طبقے
کے لوگوں کا لحاظ کرنے اور ان کے حالات پر ہمدردی کے ساتھ غور کرنے کی تاکید کی اور اس حقیقت
کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کی کہ سوشلزم عام اور مفید مقاصد کے لئے تمام طبقوں کے اتحاد
عمل کا نام ہے

محمد مجیب

[illegible] کا ترجمہ

[illegible] کا ترجمہ

[illegible] بہترین نظموں کا مجموعہ

[illegible]

گئودان

[illegible]

مکتبہ جامعہ دہلی

ایک اطلاع

مکتبہ جامعہ کے سرپرستوں اور ہمدردوں کو یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ سنگم پبلشرز لاہور کی ساری
مطبوعات مکتبہ جامعہ دہلی، لکھنؤ اور بمبئی میں ہر وقت مل سکتی ہیں سردست یہ کتابیں موجود ہیں۔

بہتا دریا۔ شالاخوف کی معرکۃ الآرا تصنیف And quiet flows the Don
کا اردو ترجمہ شالاخوف کی اس کتاب میں انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے زمانے کے روس کی ایک
جیتی جاگتی تصویر ہے قیمت مکمل دو جلدیں لعہ

آپ بیتی۔ چیخوف کی افسانہ نگاری پر ایک مستند کتاب — قیمت عہ

سات کھیل۔ مشہور انشاپرداز راجندر سنگھ کے سات ڈراموں کا مجموعہ — " للعہ

گائے جا ہندوستان۔ دیوندر ستیارتھی کے ان غیر فانی لوک گیتوں کا مجموعہ جو انھوں نے ہندوستان
گردی کے بعد جمع کی ہیں۔ کتاب میں متعدد تصویریں بھی ہیں۔ — قیمت للعہ

پل پر۔ ولڈر کے نفسیاتی ناول کا ترجمہ — " عہ

سحر ہونے تک۔ چرخوف کے ایک مشہور ناول کا ترجمہ — " عہ

۱۹۴۵ء کی بہترین نظمیں۔ جدید شعرا کی بہترین نظموں کا انتخاب — " عہ

ہیا ہیا۔ سید مطلبی فرید آبادی کی نظموں کا مجموعہ — " عہ

سماج کا ارتقا۔ از کلیم اللہ — " للعہ

شعلۂ طور

حضرت جگر مرادآبادی کا وہ دیوان
جس کے شائقین مدت سے منتظر تھے۔ خوبصورت
پنج رنگا سنہرا دیدہ زیب ڈسٹ کور قیمت صہ

گئودان

منشی پریم چند کا شاہکار ناول اس غیر فانی
تصنیف میں ہندوستان کے کسانوں کی سماجی
کی ذہنیت اور مشکلات کی عکاسی ہے۔ قیمت لے

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ لکھنؤ۔ بمبئی

جامعہ

زیر ادارت :- ڈاکٹر سید عابد حسین ایم - اے ، پی ایچ - ڈی

جلد ۴، نمبر ۷	بابت ماہ جولائی ۴۷ء	چندہ سالانہ ۵ روپے فی پرچہ ۸ آنے

فہرست مضامین

(طابع و ناشر پروفیسر محمد مجیب بی - آر آکسن - دیال پریس دہلی)

کتاب خانہ رامپور

کتاب خانۂ رامپور، مدرسۂ عالیہ کی طرح، نواب سیّد فیض اللہ خاں بہادر متوفی ۱۲۰۸ھ / ۱۷۹۳ء کا قایم کیا ہوا ادارہ ہے۔ لیکن اس کی باقاعدہ ترقی کا دور نواب سیّد محمد سعید خاں بہادر جنت آرامگاہ کی ۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۰ء میں مسند نشینی سے شروع ہوتا ہے۔ جنت آرامگاہ نے ریاست کے دوسرے محکموں کی اصلاح کے ساتھ کتاب خانہ کو بھی توجہ کا شرف بخشا۔ توشہ خانہ میں کتابوں کے لئے جداگانہ کمرہ معین ہوا، اور لکڑی کی الماریوں میں کتابیں قرینے سے رکھی گئیں۔

جنت آرامگاہ کے کتاب خانہ میں کیسی کیسی نادر کتابیں تھیں، اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہ تذکرہ کافی ہے کہ حکومتِ ہند کو بعض تاریخی نسخے درکار تھے۔ نواب صاحب کو لکھا گیا، تو اُنھوں نے ہمایوں نامہ، اکبر نامہ، جہانگیر نامہ، تاریخ نادری، خلاصۃ التواریخ، تاریخ خانِ جہانی اور مجمع محفل کے نہایت عمدہ مخطوطے اگست ۱۸۴۸ء میں مسٹر ریلے سن، صدر بورڈ آگرہ کے توسط سے تحفے میں بھیج دیئے۔ ان میں سے ہمایوں نامہ اور مجمع محفل اب تک نایاب ہیں[1]۔

جنت آرامگاہ نے پرانی قلمی کتابوں کی فراہمی کے ساتھ نایاب کتابوں کی نقلیں بھی کرائیں، اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے کشمیر سے میرزا غلام رسول، اور میرزا محمد حسن دو بھائی طلب کئے گئے۔ یہ دونوں خطِ نسخ کے ماہر تھے، اور نقاشی و گل کاری میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ خطِ نستعلیق کے لئے میر عوض علی ملیح آبادی لکھنؤ سے بلائے گئے، ان ماہروں کے رامپور آنے سے شہر میں بھی گھر گھر خطاطی کا شوق پیدا ہوگیا اور رفتہ رفتہ سیکڑوں خوشنویس مصروفِ کار نظر آنے لگے۔

۱۸۵۵ء میں نواب سیّد محمد یوسف علی خاں بہادر فردوس مکاں تخت نشین ہوئے۔ تو کتاب خانے میں مزید ترقی ہوئی۔ یہ مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی صدر الدین خاں بہادر آزردہ، اور میرزا اسد اللہ

---

[1] دیباچہ فہرست عربی: ۲،

خاں بہادر غالبؔ کے شاگرد اور مشرقی علوم و صنائع کے بڑے قدردان تھے۔

۱۸۵۷ء میں ہندوستانی زندگی میں ہمہ گیر ابتری پھیلی، تو علم و فن کی سرپرست سرکاریں اور صنعت و حرفت کی قدردان محفلیں اُجڑ گئیں۔ فردوس مکان نے ملک کے باکمالوں کو اپنے دامنِ پرورش میں جگہ دی۔ ان باکمالوں کے ورود سے رامپور میں مزید علمی سرگرمی پیدا ہوگئی۔ فلک کے ستائے ہوئے آرام سے بیٹھے، تو ان کے توسط سے بزرگوں کے جگر پارے، یعنی نادر نادر کتابیں بھی تحفہ کے ذریعے آنا شروع ہوگئیں فردوس مکاں نے بڑے بڑے انعام دے کر انھیں لیا اور سر آنکھوں پر رکھا۔

رام پور کے خوشنویسوں، نقاشوں اور مصوروں نے بھی قدردانی کے بل بوتے پر اپنا کمال دکھایا اور ایسی ایسی بیش بہا کتابیں تیار کیں کہ باید و شاید۔

۱۸۶۵ء میں نواب سید کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں نے مسند ریاست پر قدم رکھا، تو چند سال کے اندر رامپور بغداد و قرطبہ کا ہم پلہ بن گیا۔ خلد آشیاں اپنے خاندان میں سرپرستی علوم و آداب کے لحاظ سے یکتا تھے: بچپن سے کتابیں جمع کرنے کا شوق رکھتے تھے اور جب کبھی کوئی اچھا نسخہ ہاتھ آجاتا تھا تو اس پر بقید تاریخ لکھا کرتے تھے کہ آج مجھے ایسی خوشی میسر آئی کہ اس سے پہلے کبھی ایسی نصیب نہ ہوئی تھی ان کے عہدِ حکومت میں کتاب خانہ اپنی ترقی کے اہم زینے پر پہنچ گیا۔

خلد آشیاں کی قدردانی دیکھ کر ہندوستان کے گوشے گوشے سے کتابیں آنا شروع ہوگئیں، اور چند سال کے اندر اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا کہ سرکار کو اس کے لئے نئی عمارت تعمیر کرانا پڑی۔ منشی امیر احمد مینائی مرحوم ترتیب فہرست کے نگراں مقرر ہوئے، نواب صاحب نے فہرست کا نمونہ خود پسند فرمایا تو اس کے مطابق مولوی مہدی علی خاں تحویلدار کتاب خانہ نے فہرست کی تکمیل کی۔

خلد آشیاں کے عہد میں ہندوستانی مطبع کافی ترقی پا چکا تھا۔ جو کتاب کسی مطبع میں چھپتی انعام کی اُمید پر مالک مطبع دو تین نسخے ان کے حضور میں ضرور نذر گذرانتا۔ اُن میں سے دو مطبع خلد آشیاں کے بڑے منظورِ نظر تھے، کانپور کا مطبع نظامی اور لکھنؤ کا مطبع نولکشور۔ چنانچہ دونوں نے رامپور کے خزانے سے بڑی بڑی رقمیں حاصل کی ہیں۔

رعایا ہمیشہ راعی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتی ہے۔ خلد آشیاں کی ریس میں خود شہر کے رئیسوں اور عالموں نے بھی حسب استطاعت قلمی کتابیں جمع کی تھیں۔ خلد آشیاں نے ان حضرات سے بھی بہت سے نوادرات حاصل کئے۔ رام پور کے علماء میں سب سے اچھا کتاب خانہ مفتی سعد اللہ صاحب کا تھا۔ اُن کے کتاب خانے کی جو کتابیں سرکاری ذخیرے میں داخل ہوئیں، اُن میں شرح کافیہ رضی الدین نیشاپوری کا نسخہ بیحد قیمتی ہے۔ اس کے سرورق پر شاہجہاں کی تحریر ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے بیشتر حاشیے علامہ سعد اللہ خاں وزیر اعظم کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔ خود سعد اللہ خاں کی مہر بھی ایک گوشے میں موجود ہے۔ عالمگیر نے بھی اپنی مہر ثبت کی ہے۔

دہلی کی تباہی کے بعد یہ کتاب شاہی کتاب خانے سے جُدا ہوئی، تو میر غلام علی آزاد بلگرامی اس کے مالک بنے، ان کی تحریر اور مہر بھی سرورق پر موجود ہے۔

خلد آشیاں نے میرٹھ کے حکیم غلام محی الدین طبیب دہلی، مفتی صدر الدین خاں بہادر آزردہ اور احسن اللہ خاں بہادر اور لکھنؤ کے مسیح الدولہ حکیم علی حسن خاں بہادر کے ذخیروں کی بھی معتدبہ کتابیں ان کے اخلاف سے خرید فرمائی تھیں۔ عربی کتابوں کے بہت سے نادر نسخے سفر بیت اللہ کے موقع پر بھی جمع کیے گئے۔

خلد آشیاں نے بقدر ضرورت انگریزی بھی پڑھی تھی چنانچہ اُن کی بچپن کی پڑھی ہوئی دو تین گرامر اور ریڈریں اب تک کتاب خانے میں محفوظ ہیں۔ اسی کا اثر تھا کہ کتاب خانے میں انگریزی کتابیں انھیں کے عہد سے خریدی جانے لگی تھیں۔

۱۸۸۷ء میں نواب سید مشتاق علی خاں بہادر عرش آشیان نے تاج ریاست سر پر رکھا۔ آشیاں کے عہد کی عمارت کو کتاب خانے کی عظمت و شان کے مناسب نہ پاکر دوسری شاندار عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا۔ کتاب خانے کا بجٹ اب تک جُدا نہ تھا۔ تمام عملہ دوسرے صیغوں سے تنخواہ پاتا تھا۔ عرش آشیاں نے جنرل اعظم الدین خاں بہادر مدار المہام ریاست کے مشورے سے کتاب خانے کو مستقل محکمے کی حیثیت عطا فرما کر جداگانہ بجٹ مقرر کیا۔ اس عملے میں ایک مہتمم، ایک سر رشتہ دار، نو خوشنویس نستعلیق، دو خوشنویس نسخ، چار جلد ساز اور چار مددگار جلد ساز رکھے گئے۔

[illegible]ء میں نواب سید حامد علی خاں بہادر جنت مکان تخت نشین ہوئے۔ عرش آشیاں نے جس عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا تھا، نواب جنت مکاں نے ۳۱ مارچ ۱۹۰۲ء کو اس کا بڑی دھوم سے افتتاح فرمایا اور یہ حکم دیا کہ آئندہ اس سے ہر خاص و عام فائدہ اُٹھا سکے گا۔

نواب جنت مکاں کے عہد میں فن وار فہرستوں کی از سر نو ترتیب شروع کی گئی اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کتاب خانے کے افسر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ موصوف بہت بڑے فاضل اور دہلی کے مشہور علمی خاندان کے فرد ہونے کے باعث کتابوں کے بڑے شوقین تھے آپ نے خاص طور پر شعبۂ طب کے لئے نادر و نادر کتابیں مہیا کیں اور یورپ، ایران، عراق وغیرہ سے تازہ مطبوعات فراہم کئے۔ حکیم صاحب ہی کی نگرانی میں شعبۂ عربی کی فہرست کا ایک حصہ مکمل ہو کر ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا۔ حکیم واصل خاں کے انتقال کے بعد مسیح الملک دہلی تشریف لے گئے تو حافظ احمد علی خاں شوق ناظم کتاب خانہ مقرر ہوئے ان کی ہدایت کے مطابق حکیم محمد نبی صاحب رجسٹرار شعبۂ عربی نے عربی فہرست کی دوسری جلد مرتب کی جو ۱۹۲۸ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔ یہ فہرست مفصل تھی اور اُردو زبان میں مرتب کی گئی تھی۔

عہدِ جدید ۱۹۳۰ء میں فرماں روائے حال دام اقبالہم و ملکہم نے زمام حکومت ہاتھ میں لے کر اپنے اسلاف کرام سے بھی زیادہ کتاب خانے کی طرف توجہ فرمائی۔ مسٹر جے، اے چیپ مین صاحب، سابق لائبریرین امپیریل لائبریری کلکتہ، جو ۱۵، ۲۰ سال سے خدا بخش خاں لائبریری پٹنہ کی فہرست کے نگراں تھے طلب کئے گئے اور حقیر عرشی کو ناظم کتاب خانہ کے عہدے پر مشرف فرمایا گیا۔

تہذیب و ترتیب کتاب خانے میں عملہ اور موجودات دونوں میں تہذیب و ترتیب کی ضرورت تھی کئی غیر ضروری اسامیاں تخفیف کر کے کارآمد عہدے قائم کئے گئے۔ مطبوعات میں بہت سی کتابوں کے نسخے تھے اُن میں ایسے بھی تھے جو ایک ہی مطبع کے چھپے ہوئے تھے، یا سابق کی سراسر نقل تھے انگریزی میں بڑی تعداد ایسی کتابوں کی تھی جو کتاب خانۂ رامپور جیسے بلند رتبہ کتاب خانے کے لائق نہ تھیں حضرت نے پبلک لائبریری رامپور، رضا انٹر کالج۔ رضا اکاڈمی وغیرہ عام اداروں کو یہ سب غیر مطلوبہ کتابیں عطا فرما دیں۔ انگریزی کتابوں کا ایک حصہ خاص باغ پیلس لائبریری میں منتقل کر دیا گیا

جلد سازی | کتاب خانے میں مطبوعات اور مخطوطات ایک ساتھ رکھے جاتے تھے، اور ایک ہی فہرست میں ان کا اندراج ہوتا تھا ناقص و کامل کی اس یکجائی سے کامل یعنی قلمی کتابوں پر کیڑوں کا اثر بہت زیادہ اور خطرناک حد تک پڑ رہا تھا۔ اس مصیبت کو دور کرنے کے لئے کتاب خانے کے تمام ذخیرے کو دو شعبوں، مخطوطات و مطبوعات، میں تقسیم کیا گیا، اور نہایت عمدہ سامان فراہم کرکے پہلے قلمی کتابوں کی از سر نو جلدیں تیار کی گئیں۔ موسم کے اثرات، نیز دیمک وغیرہ سے بچانے کے لئے مخطوطات کے واسطے گودرز کمپنی بمبئی سے لوہے کی نہایت مضبوط اور خوشنما الماریاں منگائی گئیں۔ ازراہِ احتیاط مطبوعہ کتابوں اور سادہ مخطوطوں کو دھوپ دینے اور الماریوں کے اندر اور جلدوں کے اوپر فلٹ چھڑکنے کا انتظام کیا گیا چنانچہ اب تمام نئی مجلد کتابیں ان کتاب خوروں سے پاک و صاف ہو چکی ہیں۔

ترتیب فہرست | اب تک جو فہرستیں تیار ہوئی یا چھپ چکی تھیں۔ ان میں ہر مطبوعہ اور قلمی نسخے کی تفصیلی کیفیت اُردو زبان میں لکھی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ مطبوعہ کی فہرست دیکھنے والوں کو زیادہ تفصیل درکار نہیں ہوتی۔ اس طرح روپیہ، وقت، محنت، یہ سب چیزیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ نیز جو مخطوطات کی فہرست کے طلب گار ہیں اُردو داں بہت کم ہوتے ہیں۔ فہرست کے فائدے کو زیادہ کرنے کے خیال سے یہ تجویز ہوا کہ مطبوعات کی صرف مختصر فہرستیں تیار کر لی جائیں قلمی کتابوں کو بلحاظ فن اور ہر فن کی کتابوں کو باعتبار تاریخِ تصنیف یا تاریخِ وفاتِ مصنف مرتب کرکے اُن کی مفصل فہرست انگریزی میں تیار کی جائے۔ ابھی انگریزی فہرست کا کام تھوڑا سا ہونے پایا تھا کہ حقیر عرشی کی درخواست پر ملک کے دس بارہ چیدہ اہلِ علم سے، جن میں قدیم و جدید دونوں قسم کے اصحاب شامل تھے، فہرست کی زبان کے بارہ میں مشورہ کیا گیا۔ اور بہت بڑی کثرت رائے سے یہ طے پایا کہ ہر زبان کی کتابوں کی فہرست اُسی زبان میں مرتب کی جائے تاکہ اُس زبان کا عالم دنیا کے کسی حصے کا باشندہ کیوں نہ ہو، فہرست سے بآسانی فائدہ اُٹھا سکے۔ اس اصول کے تحت عربی کی فہرست مکمل ہو چکی ہے، اور عنقریب چھپ کر شائع ہو جائے گی۔ فارسی اور اُردو کا بڑا حصہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ عربی کی طباعت کے ختم تک مطبع کو بھیجا جا سکے گا۔

شعبۂ اشاعت اعلیٰ حضرت کے حسب ایما، کتب خانے میں ایک شعبۂ اشاعت بھی قائم کیا گیا ہے۔ اس کی طرف سے اب تک ۸ کتابیں شائع ہو کر ملک سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں نویں کتاب انشاء اللہ خاں کی سلکِ گوہر زیرِ طبع ہے۔ آج کل امام نعمان ثوری کی تفسیر القرآن پر کام ہو رہا ہے، جس کا ایک نادر ترین نسخہ کتاب خانہ میں موجود ہے ان کتابوں کی اشاعت سے ملک میں طباعت اور ترتیب و تصحیح دونوں کا معیار بہت بلند ہو گیا ہے اور علمی حلقوں میں مطبوعات کتاب خانہ رامپور جیسی مرتب شدہ کتابوں کا انتظار اور تقاضا ہونے لگا ہے

مصارف اعلیٰ حضرت کے دورِ سعید میں کتاب خانے کی طرف توجہ اور اُس کی غیر معمولی رفتارِ ترقی کا اندازہ کرنے کے لئے یہ کافی ہوگا کہ ۱۸۶۰ء سے ۱۹۳۰ء تک ۷۰ برس کے طویل عرصے میں ۵۴۲ر۵۰۳ را روپے صرف کئے گئے تھے۔ اور ۱۹۳۰ء سے دسمبر ۱۹۴۶ء تک ۴۸۵۱۴۴ر۲ روپے خرچ کئے جا چکے ہیں۔ مئی ۱۹۳۰ء تک قلمی کتابوں کی تعداد ۹۰۵۱ تھی، اب ۱۰۶۱۹ ہے، ان میں سے ۱۵۶۸ ۱۹۴۶ء کی خرید ہیں۔ بظاہر ۱۵۶۸ کی تعداد کم نظر آتی ہے، لیکن اگر ذہن میں یہ خیال موجود ہو، کہ اس عرصے میں قلمی کتابوں کی مانگ کتنی بڑھ چکی ہے اور ہندوستان سے قلمی کتابوں کا کتنا بڑا ذخیرہ یورپ و امریکہ پہنچ چکا ہے نیز ہندوستان میں کتنے ایسے ریاستی اور دیگر کتب خانے قائم ہو چکے ہیں، جو قلمی کتابوں کو جمع کر رہے ہیں، تو اس تعداد کی حقیقی قدر و قیمت زیادہ نمایاں ہو سکے گی۔

موجوداتِ کتاب خانہ کتاب خانۂ رامپور کے مخطوطات میں، عربی، فارسی، اردو کے علاوہ سنسکرت، ہندی، ترکی، پشتو، گجراتی اور تامل و تلگو کے نسخے بھی شامل ہیں۔ کتابوں کے سوا خطِ ثلث، نسخ، نستعلیق، شفیعہ اور شکست کے نہایت نادر کتبے، منگولین، پرشین، انڈین مغل، اور راجپوت اسکولوں کی بیش قیمت تصویریں، اور علمِ ہیئت سے متعلق بعض قدیم آلات بھی محفوظ ہیں ایک بیاض ہاتھی دانت کے ورقوں کی ہے، جس کے کاغذ کی دبازت عام ہونے کا غذ سے کسی طرح زیادہ نظر نہیں آتی۔

مہمانانِ کتاب خانہ کتاب خانے کے اس ذخیرے سے فائدہ اٹھانے کی عام اجازت ۲۲ ستمبر ۱۹۳۶ء کو

یہ مطالعہ کرنے والے کی نہایت نازیبا اور غیر عالمانہ حرکت کی وجہ سے منسوخ ہو چکی ہے لیکن علما اور تحقیقی کام کرنے والے طلبا کے لئے اس کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے ہیں اور ہر سال اوسطاً دس بارہ ریسرچ کرنے والے یہاں آکر کام کر جاتے ہیں، اُن میں سے اکثر کو ریاستِ عالیہ کا مہمان بھی رکھا جاتا ہے، جہاں تک دستاویزی شہادت کا تعلق ہے، سب سے پہلے عالم جو یہاں مطالعہ کرنے کے لئے تشریف لائے، وہ شیخ محمود بن شیخ محمد نصیر الدین جیلانی تھے - یہ غالباً عراق کے کوئی فاضل تھے اور ۱۲ رشوال ۱۳۰۳ھ مطابق ۲۳ رجون ۱۸۸۶ء کو نواب خلد آشیاں کے انتقال کے سال بھر بعد اِن کا ورود ہوا تھا۔

ان کے بعد ہندوستان اور بیرونِ ہند کے سیکڑوں اصحابِ ذوق یہاں آتے رہے۔ ان میں سے ممتاز نام یہ ہیں:۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا ذکا ءاللہ دہلوی مولف تاریخ ہندوستان، خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی، مولانا سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی، نواب محسن الملک، نواب عماد الملک بلگرامی، ڈاکٹر سید علی بلگرامی مؤلف تمدن ہند، نواب صدر یار جنگ بہادر، مولانا عبدالماجد دریاآبادی، مسٹر بیورج، مسٹر اسٹیپل ٹن، سابق ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن بنگال، سر ڈینی سن راس، ڈائرکٹر اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز لندن لارڈ کرزن، لارڈ کچنر، لارڈ منٹو، لارڈ ریڈنگ، لارڈ ارون، لارڈ ولنگڈن، لارڈ لنلتھگو،

یورپی مہمانوں میں سب سے پہلے صاحب جن کے ورود کی دستاویزی شہادت موجود ہے سپے کاتون ہیں - یہ ۲۷ رمئی ۱۸۹۰ء کو کتاب خانے کے معاینے کے لئے آئے تھے۔

مہمانوں کی رائیں یوں تو سیکڑوں دیسی اور پردیسی مہمانوں نے کتاب المعاینہ میں اپنی اپنی رائیں درج کی ہیں، لیکن یہاں چند بہت مشہور اہل الرائے اصحاب کی تحریریں قارئین کی دلچسپی کے لئے نقل کی جاتی ہیں:۔

۱ - ۱۵ رشعبان ۱۳۲۸ھ کو دارالعلوم دیوبند کا ایک وفد رام پور آیا تھا۔ یہ وفد ابوالخیرات سے ملنے

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندی، مولانا محمد منفعت علی دیو بندی، مولانا عبد العلی، مولانا احمد حسن مولانا محمد اکبر اور مولانا محمد ابراہیم سنبھلی پر مشتمل تھا۔ مولانا مفتی لطف اللہ رامپوری ان حضرات کے ہمراہ تھے۔

اس وفد نے اپنی حسب ذیل رائے تحریر کی ہے۔

"آج ہم لوگوں نے بوساطت مولوی مفتی محمد لطف اللہ صاحب کتب متعلقہ یہاں آکر مطالعہ کیں واقعی کتب مفیدہ عجیبہ جملہ فنون کی جس قدر اور جیسی عمدہ یہاں نظر سے گذریں کبھی اتفاق نہ ہوا تھا اور جملہ کتب بہت صاف اور مجلد بہت احتیاط کے ساتھ اپنے اپنے موقع پر موجود ہیں۔ واقعی یہ کتب خانہ لائق دید ہے۔ جیسی اُس کی تعریفیں سُنی تھیں اُس سے بڑھ کر پایا۔ اہل علم کے لئے اس سے زیادہ عجیب و مفید چیز اور معلوم نہیں ہوتی۔ خداوند کریم اُس کو ترقی اور بقاء عطا فرماوے، آمین۔ اور جو کتاب طلب کی گئی وہ فوراً دستیاب ہوئی۔ واقعی یہ امر شاہد قوی ہے کہ اس کے منتظم بڑے لایق و ہوشیار ہیں اور جملہ کتب کی پوری طرح پر خبر رکھتے ہیں۔ جو کتاب مطلوب ہو اُس کا نام بتلا دینا کافی ہے، نمبر یا علم وغیرہ کا بتلانا ضرور نہیں فقط ۵ ارشعبان ۱۳۰۷ھ"

العبد ابو الخیرات سید احمد عفی عنہ	العبد محمود عفی عنہ دیو بندی	العبد محمد منفعت علی عفی عنہ دیو بندی
العبد عبد العلی	العبد بندہ احمد عفی عنہ دیو بندی	العبد احمد حسن دیو بندی عفی عنہ
العبد محمد اکبر عفی عنہ	العبد محمد ابراہیم عفی عنہ سنبھلی	

۲۔ مولانا لطف اللہ صاحب نے اس تحریر کے نیچے خود یہ لکھا۔

"راقم بھی ان علمائے نامدار اتقیائے روزگار کے ہمراہ تھا محمد مہدی علی خاں صاحب خوشنویس متعینہ کتب خانہ کے حسن سعی کی وجہ سے نہایت عمدہ طور سے سب کتب کی میسر ہوئی کتب بہت جلد برآمد ہوئیں اُن کی نظر ایسے عظیم الشان کتب خانہ کی جزئیات اور کلیات کو تمام تر حاوی ہے، ہر ہر کتاب کی تصویر اُن کے پیش نظر ہے کتاب کے نام لینے کی دیر ہے یا دست درازی کی، فکر اور تلاش کی ضرورت نہیں۔ ایسا واقف

شخص کتب خانہ میں لائق قدر ہے۔ نمیقہ العبد المذنب الاواہ محمد لطف اللہ عفی عنہ"

۳۔ اس دفعہ کے بعد استاذ الاساتذہ مولانا محمد لطف اللہ صاحب علیگڈھ میں تشریف فرما ہوئے

تھے۔ انھوں نے اپنے قلم سے یہ تحریر فرمایا ہے:-

"آج ۲۲ رشعبان ۱۳۱۷ھ کو ہم لوگ اس کتاب خانہ ریاست میں حاضر ہوئے۔ محافظانِ

کتب نے عجیب عجیب کتابیں دکھائیں۔ جو جلد بندی وغیرہ سے بھی خوب آراستہ ہیں، اور بعض

کتب نہایت مطلا اور خوش خط ہیں۔ ایک جلد قرآنِ مجید کی تو ایسی دیکھی کہ شاید اُس کا مثل نہ ہو۔

پھر الماریوں کو جا بجا دیکھا، تو معلوم ہوا کہ اس کتب خانہ میں ہر علم کی کتابیں اس کثرت سے ہیں

کہ غالباً کسی اور کتب خانہ میں اس قدر نہ ہوں گی۔ محافظانِ کتب کا انتظام نہایت قابلِ توصیف ہے

کہ باوجود اس کثرتِ کتب کے جو کتاب اُن سے طلب کی گئی، فوراً کتب خانہ سے نکال کر پیش کی۔ اللہ

تعالیٰ اس کتب خانہ کو کہ عجائبات روزگار سے ہے، قائم و محفوظ رکھے، اور زیادہ تر اس میں ترقی بخشے!

آمین، ثم آمین! محمد لطف اللہ، ساکن علی گڈھ۔

العبد محمد عنایت اللہ ساکن علی گڈھ

العبد محمد عبد الجمیل پشاوری قصبہ طور وحال ساکن علی گڈھ

۴۔ مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے اپنے پہلے معائنہ واقع ۷ ستمبر ۱۹۰۸ء میں حسب ذیل نوٹ تحریر

کیا ہے:-

"میں نے کتب خانہ کو کسی قدر تفصیل سے دیکھا۔ چونکہ میں کتب خانہ کی ایک مفصل رپورٹ

لکھنا چاہتا ہوں اس لئے اس موقع پر اسی قدر لکھنا کافی ہوگا کہ یہ ایک بے مثل کتب خانہ ہے۔ منتظمانِ

کتب خانہ مستعد اور کارگزار ہیں۔ خصوصاً مہدی علی خاں صاحب کو اس قدر واقفیت اور تجربہ ہے

کہ ایسے عظیم الشان دار الکتب کی ایک ایک کتاب کا نمبر و نشان اور اُس کی حالت گویا اُن کی

آنکھوں کے سامنے ہے۔ فہرست کی اگر معقول ترتیب ہو جائے، تو نہایت آسانی ہو۔ مولوی عبید اللہ

صاحب نے بہت کچھ کام کیا ہے جو قابلِ مدح ہے لیکن ابھی بہت کچھ کرنا ہے"

محمد شبلی۔ پروفیسر مدرسۃ العلوم علی گڈھ۔

۵- ۲۲ راکتوبر ۱۹۲۸ء کو مولانا ذکا ء اللہ دہلوی، ہندوستان کے مشہور مورخ تشریف لائے تھے اُن کے تاثرات حسب ذیل ہیں:-

" میں نے کتب خانہ کو دیکھا۔ ایسا کتب خانہ کتب مشرقیہ کا ہندوستان میں نہیں ہے میں نے دہلی میں بھی کبھی ایسا کتب خانہ نہیں دیکھا۔ مہتمم کتب خانہ منشی مہدی علی خاں صاحب ایسے عظیم الشان کتب خانہ کے لئے نہایت لائق ہیں۔ کوئی کتاب اُن سے منگائی جائے وہ فوراً لا دیتے ہیں۔ گویا وہ کتاب اُن کے پاس ہی رکھی تھی۔ مولوی عبید اللہ صاحب بھی بہت لائق ہیں۔ وہ اپنے کام سے بہت واقف ہیں فقط ذکا ء اللہ"

۶- امیر مینائی مرحوم رامپور کی اُن ہستیوں میں سے تھے، جنہوں نے دربار خلد آشیاں کے درجہ بدرجہ علی عروج کا پورا مشاہدہ کیا تھا خلد آشیاں نے ترتیب کتاب خانہ کا کام سپرد کیا تو اُنھوں نے اس کی پچھلی تاریخ کے متعلق بھی مفید اور ضروری معلومات مہیا کیں اور اُن سب کا خلاصہ اپنی ۲۲ ردسمبر ۱۸۹۲ء کی حسب ذیل یادداشت میں کتاب معائنہ کے اندر درج کر دیا۔ فرمایا ہے:-

اس کتاب خانے کی بنا نواب محمد فیض اللہ خاں بہادر عرش منزل کے عہد سے پڑی، مگر عہد نواب غلام محمد خاں بہادر خلد مکاں اور عہد نواب احمد علی خاں بہادر میں کتب خانے کو کوئی ترقی نہ نہیں ہوئی۔ عہد نواب محمد سعید خاں بہادر جنت آرام گاہ اور عہد نواب یوسف علی خاں بہادر فردوس مکاں میں کچھ کچھ ترقی ہونے لگی اور عہد نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں میں ترقیات نمایاں ہوئیں اور اسی عہد کے آخر میں جناب نواب ممدوح کو اس کی تہذیب و ترتیب کی طرف توجہ ہوئی اور اس ترقی خواہ دولت سے ترتیب فہرست کے واسطے ارشاد ہوا اُس وقت تک کتابوں کے صرف نام متفرق اوراق پر بلا ترتیب لکھے ہوئے تھے اور کچھ کتابوں کی فہرست بہ ترتیب حروف تہجی مولوی محمد ریاض الدین مرحوم اور بعض اور علمائے ملازم ریاست کی بنائی ہوئی تھی۔ مترجم نے حسب منشائے عالیہ، نواب خلد آشیاں طاب ثراہ چند اصول قائم کرکے تکمیل فہرست کا ارادہ کیا اور محمد مہدی علی خاں نے جواب تحویلدار کتب خانہ ہیں اُنھیں اصول کے موافق ترتیب فہرست

شروع کی اُسی زمانے میں میرا جانا دکن کی طرف ہوا مہدی علی خاں نے کہ مرد جفاکش اور ذہین ہیں میری غیبت میں نہایت عرق ریزی سے فہرست کا ایک خاکہ تیار کر کے جناب نواب خلد آشیاں بہادر کے حضور میں پیش کیا، جس کو جناب نواب ممدوح نے پسند فرما کر مزید تکمیل اور خانہ پُری نقشۂ فہرست کا حکم دیا اور مہدی علی خاں کی پرورش اور عزت افزائی فرمانے کا ہنگامِ تکمیلِ فہرست اظہار فرمایا اُس عہدِ دولت مہد میں کما حقہ تکمیل نہ ہونے پائی تھی کہ عہدِ نواب محمد مشتاق علی خاں بہادر عرش آشیاں آیا اور جنرل محمد اعظم الدین خاں بہادر اُس عہد سے تا زمانِ حیات بہت ہی متوجہ تہذیب و ترتیب رہے۔ کمیٹیاں قائم کی گئیں، فن وار ترتیب کے اُصول قائم کئے گئے، علما سے مدد لی گئی۔ مولوی محمد عبید اللہ صاحب کہ ایک مردِ کامل اور جوہرِ قابل ہیں ملازم ہو کر خاص اسی کارِ تہذیب و ترتیب پر مامور ہوئے اور اُنھوں نے ایک مدت تک ایسی محنت اور جانفشانی کی کہ وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اُن کی جانفشانی اور مہدی علی خاں کی کاردانی سے فن وار فہرست گویا حدِ تکمیل کو پہنچی۔ جنرل صاحب مرحوم کی شہادت کے بعد میجر ایچ اے ونسنٹ صاحب بہادر ریسیڈنٹ نے منشی بانکے بہاری لال صاحب بانک کو منصرمِ کتب خانہ فرما کر کتب زبانِ عربی و فارسی و انگریزی وغیرہ مختلف زبانوں کو جدا جدا درجات میں چنوا کر اور زینت بڑھائی۔ اب یہ کتب خانہ درحقیقت ایک آئینہ خانہ ہے جس میں چار طرف شاہدِ جمالِ صوری و معنوی جلوہ گر ہے۔ کتابوں کی جانچ اور پڑتال اور تہذیب و ترتیب و تکمیلِ فہرست اب تک چلی جاتی ہے اور اُمید ہے کہ رفتہ رفتہ فن وار فہرست تکمیل پا کر ایک ضخیم فہرست حروفِ تہجی کی ترتیب سے بھی مرتب ہوگی جو ہر کتاب کے جلد نکلنے میں بغیر اس بات کے کہ نکالنے والے کو اُس کتاب کا فن معلوم ہو کافی مدد دے گی مختصر یہ کہ جو صورت کتب خانے کی اب ہے ایسی اس سے پیشتر کبھی نہ تھی اور منتظمان کتب خانہ میں اولاً محمد مہدی علی خاں کی تجربہ کاری و ہوشیاری اور جفاکشی و عرق ریزی اور ثانیاً مولوی محمد عبید اللہ صاحب کی جانفشانی و مستعدی اور صلاحیت و قابلیت قابلِ قدر ہے۔"

امیر احمد علی عنہ

۷۔ حکیم اجمل خاں مرحوم کا خاندان دہلی کے علمی خاندانوں میں امتیاز کا مالک رہا ہے۔ ان کے برادرِ بزرگ حکیم عبدالمجید خاں مرحوم بڑے فاضل طبیب تھے۔ ۸ رجون ۱۸۹۲ء کو انھوں نے کتاب خانہ دیکھ کر لکھا ہے:۔

"میں نے کتاب خانہ دیکھا۔ رام پور کی ریاست کو جہاں اور چیزوں پر فخر ہے، وہاں کتب خانہ پر بھی وہ جس قدر فخر کرے تھوڑا ہے۔ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں یہ کتب خانہ مجموعی حیثیت سے بے نظیر ہے۔ اِس وقت بارہ ہزار سے زیادہ چھوٹی بڑی کتابیں اس میں موجود ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ علم طب کا ذخیرہ غیر کافی اور ناکمل ہے۔ غالباً حضور پرنور دام اقبالہم و ملکہم کی توجہ سے وہ بھی مکمل ہو جائے گا۔

مہدی علی خاں اس کتب خانہ کے منتظم اور دیرینہ ملازم ہیں ان کی واقفیت سے کتب خانہ کے دیکھنے والوں کو بہت کچھ سہولت اور آسانی ہوتی ہے۔ اکثر کتابوں کے نام اور نمبر انھیں یاد ہیں امید ہے کہ جس درستی کی اس میں ضرورت ہے، وہ بھی آہستہ آہستہ اس میں ہوتی جائے گی"

حکیم عبدالمجید عفی عنہ

۸۔ ۲۵ر دسمبر ۱۸۹۶ء کو خواجہ حالی مرحوم رامپور کے کتاب خانہ میں تشریف فرما ہوئے تھے انھوں نے اپنی رائے زیادہ مفصل پیش کی ہے اس میں بعض مشورے ایسے بھی نظر آتے ہیں جن میں آج کل کے بعض ناتجربہ کار پسند نہیں کر سکتے۔ لیکن قلمی کتابوں کی حقیقی قدر کرنے والے خواجہ حالی کے ہمنوا رہے ہیں اور رہیں گے۔ فرماتے ہیں:۔

"میں نے آج اس کتب خانہ کو دیکھا۔ اگرچہ بسبب علالت کے جس قدر جی چاہتا تھا اس قدر میں کتب خانہ میں نہیں ٹھیر سکا، مگر مولوی مہدی علی خاں صاحب جو منصرم کتب خانہ ہیں ان کی رہبری سے تھوڑی سی دیر میں مجھ کو کتب خانہ کی ترتیب و تقسیم و انتظام اور ہر قسم کی کتابوں کی تعداد اور دیگر ضروری مراتب سے کسی قدر واقفیت حاصل ہو گئی۔ اس زمانہ میں کہ مسلمانوں کی علمی ادبی کتابوں کے ذخیرے خاص کر ہندوستان میں گردشِ روزگار سے برباد ہو گئے ہیں، یہ کتب خانہ (ما شاء اللہ

عن جمیع الاوقات) فی الواقع ایک غنیمت کبریٰ اور مسلمانوں کے لئے باعث افتخار ہے۔ نہایت افسوس ہے کہ پچھلے دنوں میں یہاں سے چند نفیس اور قیمتی کتابیں چوری گئیں جن میں سے صرف تین کتابیں دستیاب ہوئیں اور باقی کتابوں کا اب تک کچھ پتہ نہیں ملا۔ جو قواعد کتب خانہ کی حفاظت اور نگرانی کے لئے مقرر کئے گئے ہیں وہ بہت عمدہ ہیں، مگر میرے نزدیک اُن میں یہ قاعدہ اور اضافہ ہونا چاہیے کہ کسی متنفس کو کتب خانہ سے باہر کتاب کے لے جانے کی اجازت نہ دی جائے جہاں تک مجھ کو معلوم ہے حضرت خلد آشیاں کے عہد میں، جن کے حسن توجہ سے یہ بے بہا دولت کا خزانہ جمع ہوا ہے، یہی قاعدہ تھا کہ کوئی کتاب لائبریری سے باہر نہیں جانے پاتی تھی اور سُنا گیا ہے کہ کتب خانہ برٹش میوزیم اور یورپ کے تمام کتب خانوں میں بھی یہی قاعدہ جاری ہے کہ کوئی شخص کتاب کے باہر لے جانے کا مجاز نہیں۔ اس کے سوا یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لائبریری میں الماریوں کے سوا۔ جتنی آئینوں دار جوڑیاں چڑھی ہیں وہاں ایک ایک اور جوڑی بغیر آئینوں کی چڑھوا دی جائے تاکہ جیسا ناگوار واقعہ پچھلے دنوں میں گذرا ہے ویسا پھر ظہور میں نہ آئے۔ میں کتب خانہ کے حق میں اس کو ایک بڑی فالِ نیک سمجھتا ہوں کہ اُس کا انتظام اور اُس کی نگرانی جناب حکیم محمد اجمل خاں صاحب دہلوی سے متعلق کی گئی ہے، جو باوجود علم و فضل کے نہایت علم دوست اور کتاب کے قدر شناس اور صاحبِ عقل سلیم ہیں۔ اُمید ہے کہ اُن کے حسن توجہ سے کتب خانہ کی حالت روز بروز ترقی کرے گی اور مولوی مہدی علی خاں صاحب جو تمام لائبریری کی ناظم مہتمم ہیں اور جن کی کارگذاری کے سب لوگ مدّاح و ثنا خواں ہیں سرکار دولت مدار سے اُن کی زیادہ قدر افزائی فرمائی جائے گی۔"

الطاف حسین حالی عفی عنہ

۹۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دیوبندی کی ذات گرامی سے ہندوستان کے اکثر حضرات شرف تعارف رکھتے ہیں۔ مرحوم دیوبند کے مدرسۃ العلوم کی روح رواں تھے۔ اُن کے نحیف جثے کو دیکھ کر بمشکل یقین آتا تھا کہ اتنے بڑے مدرسے کے انتظامی امور کو تن تنہا یہ ہڈیوں کا ڈھیر ڈھانچہ

برداشت کرسکتا ہے۔ موصوف نے کتاب خانے تشریف لاکر حسب ذیل اظہار خیال کیا ہے

"میں ہمیشہ سے کتب خانۂ ریاستِ عالیہ کی عظمت اور کتب نایاب کے موجود ہونے کا حال سنا کرتا تھا، جس کی وجہ سے میرا شوق بڑھتا تھا کہ اس کام کے واسطے مستقل سفر کرکے ان علمائے قدیم اہلِ اسلام کی یادگار کے ذخیرے کے دیکھنے سے برکت حاصل کروں۔ الحمدللہ کہ آج بتاریخ ۲۹ر جنوری ۱۹۰۵ء میری یہ تمنا پوری ہوئی کہ میں اسی قصد سے رامپور میں آیا اور بتوجہ جناب حکیم محمد امین خاں صاحب خوب طور سے کتب خانہ کی سیر کی۔ اگرچہ ایسے عظیم الشان کتب خانہ کے دیکھنے کے واسطے نہ صرف ایک دو یوم یا ہفتہ دو ہفتہ کافی ہیں، بلکہ کم از کم ماہ دو ماہ کا قیام ضرور ہے، مگر نہایت افسوس کرتا ہوں کہ مجھ کو اس وقت بالکل فرصت قیام کی نہیں۔ کتب خانہ کی ترتیب اور صفائی کی تعریف کرنا فضول ہے، کیونکہ وہ خود اپنی تعریف کر رہا ہے۔ البتہ اتنا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مولوی مہدی علی خاں صاحب جو اس کے تحویلدار ہیں بڑے لائق شخص ہیں اور واقعی ایسے بڑے کتب خانہ میں ایسے ہی شخص کو ہونا چاہیے تھا۔ ان کو ہر کتاب کا موقع اور علم ایسا معلوم ہے کہ شائق نے نام لیا اور مولوی صاحب نے فوراً لاکر رکھ دیا۔ بیشک وہ اپنی ذاتی لیاقت اور حسنِ انتظام سے اس کے مستحق ہیں کہ ان کی طرف سرکارِ عالی کی خاص توجہ مبذول ہو اور انشاءاللہ ہوگی۔ یہ کتب خانہ ابھی تک پورے کمال کو نہیں پہنچا اور باوجود کثرت نایاب اور عجیب کتب کے زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ بتوجہ سرکارِ عالی اور جناب حکیم صاحب میں بہت ترقی کرسکتا ہوں۔ امید ہے کہ اس کی طرف التفات کیا جاوے جس کے بعد یہ کتب خانہ بے نظیر ہو جاوے۔ میں جس قدر شوق اس کے دیکھنے کا اپنے ساتھ لایا تھا اس سے زیادہ اپنے ساتھ لئے جاتا ہوں اور یقین کرتا ہوں کہ یہ قلبی اشتیاق پھر ضرور کھینچ کر مجھ کو لاوے گا اور بہ عنایت مولوی مہدی علی خاں صاحب پھر اس کی سیر سے محظوظ ہوں گا۔ فقط

حبیب الرحمٰن عفی عنہ الدیوبندی

۱۰- اکبر الہ آبادی مرحوم بھی ۱۷ر اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کتب خانے میں تشریف لائے تھے موصوف

نے حسب ذیل مشورے دے ہیں :-

"میں آج اس کتب خانے کو دیکھ کر بے انتہا محظوظ ہوا۔ رامپور میں میرا ورود اتفاقی تھا۔ جناب محمد اسحٰق خاں صاحب مدار المہام ریاست کا میں نہایت ممنون ہوں کہ اُنھوں نے مجھ کو مطلع فرمایا اور تشویق کی۔ مولوی مہدی علی خاں صاحب مہتمم کتب خانہ کی نیک دلی اور وسیع واقفیت نے مجھ کو تعجب میں ڈالا۔ اُنہوں نے تکلیف گوارا فرما کر مجھ کو نہایت نادر اور بے مثل چیزیں دکھائیں مثلاً بابر بادشاہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی رباعیاں اور اسی طرح کی اور چیزیں۔ ایسے ایسے نفیس لکھے ہوئے قرآن مجید نظر سے گذرے کہ اس سے پہلے میں نے کبھی نہ دیکھے تھے خدا اس ریاست کو ترقی دے اور اور رئیسانِ ریاست کے مدارج کو بلندی اور مذاق کو علو عطا فرمادے کہ جن کی توجہ اور قدر شناسی علم سے یہ کتب خانہ قائم ہے ہر قسم کی کتابیں بہت کثرت سے موجود ہیں۔ نو تصنیف انگریزی کتابوں کا اضافہ بلاشبہ توجہ کے لائق ہے۔ لیکن ایسے لوگوں کے پیدا کرنے کی طرف زیادہ ضرورت ہے جو ان کتابوں سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ایسی جماعت کو موجود کرے ورنہ نورِ آفتاب سے کیا فائدہ اُٹھا سکتا ہے افسوس کے ساتھ یہ بات دریافت ہوئی کہ پبلک کو عام اجازت یہاں آنے اور کتابوں کے دیکھنے کی نہیں ہے یہ بھی افسوس ہے کہ اس کتب خانے کی وسعت اور عظمت اور اُس کے نادرات کا حال پبلک پر مشتہر نہیں کیا جاتا۔ اس کام میں تھوڑا سا صرف تو ضرور ہوگا لیکن میں اُمید کرتا ہوں کہ اکثر علم دوست اور شائقین صرف اسی کتب خانے کی سیر کو رامپور آنے پر مائل ہوں گے اور اُن کے ورود سے اہلِ شہر کو فائدہ پہنچے گا۔ میں دعا کرتا ہوں کہ میری یہ تحریر با اختیار جماعت کی نظر سے گذرے اور یہ کتاب ان چند سطروں کا مدفن نہ بن جائے! میں نے صرف ایک نوجوان عالم نجم الغنی کو دیکھا کہ وہ نہایت مصروفیت سے کسی تاریخی واقعہ کی تحقیق کے لئے کتابوں کا ملاحظہ فرما رہے تھے۔ وہ کسی تصنیف میں مشغول ہیں۔ خدا اُن کو جزائے خیر دے۔

حضور پُر نور نواب صاحب والی ریاست کی ترقی اقبال کی دعا پر ختم کرتا ہوں"

سید اکبر حسین جج عدالت خفیفہ الہ آباد

۱۱- ۲۶ دسمبر ۱۹۱۰ء میں شہر رامپور میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تھا اس میں شرکت کے لئے دیگر مسلم زعماء کے علاوہ نواب عماد الملک بلگرامی بھی تشریف لائے تھے موصوف مشرقی اور مغربی دونوں طرح کے علوم کے بہت بڑے فاضل اور کتابوں کے زبردست شیدائی تھے انھوں نے ۱۲ جنوری ۱۹۱۱ء کو کتاب خانے تشریف لاکر کتاب معائنہ میں تحریر فرمایا ہے:-

"آج ہم کو اس کتب خانہ کے معاینہ کا شرف حاصل ہوا فی الواقع اس وقت ایسا مجموعہ ہماری دولتِ علمی کا کہیں کم ہے بعض نوادر تو بے نظیر ہیں جن کے دیکھنے سے آنکھیں روشن ہوتی ہیں اور اُن پر صاحب بصیرت کی نظر لگتی ہے۔ مہتمم صاحب کتاب خانہ مولوی احمد علی خاں صاحب شوق فہرست بنا رہے ہیں۔ عمدہ اسلوب پر مرتب کی ہے، جس سے بہت آسانی سے کل کتابوں کا پتہ نہایت سُرعت کے ساتھ مل جاتا ہے مولوی صاحب موصوف خود صاحبِ ذوقِ سلیم اور شائق مطالعہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب خانہ ایسی عمدہ حالت میں ہے۔ خداوندِ عالم اس کتب خانہ کو آفاتِ زمانہ سے محفوظ رکھے فقط"

عماد الملک سید حسین بلگرامی

۱۲- مولانا شبلی دوسری بار ۱۶ اپریل ۱۹۱۳ء کو کتاب خانے تشریف لائے تھے اس عرصے میں موصوف نے روم و مصر کا سفر کر لیا تھا اور اس لئے کتاب خانہ رام پور کی قدر و قیمت کے پہلے سے زیادہ مداح بن چکے تھے چنانچہ اس موقع پر آپ نے یہ کلمات لکھے ہیں:-

"میں اس کتب خانہ سے بار بار متمتع ہوا ہوں۔ ہندوستان کے کتب خانوں میں اس سے بہتر کیا اس کے برابر بھی کوئی کتب خانہ نہیں۔ میں نے روم و مصر کے کتب خانے بھی دیکھے ہیں لیکن کسی کتب خانہ کو مجموعی حیثیت سے میں نے اس سے افضل تر نہیں دیکھا۔ اہل کارانِ کتب خانہ کی محنت اور وسعت اطلاع کی داد دینی چاہئے خصوصاً مہدی علی خاں صاحب تو خود ایک زندہ کتب خانہ ہیں"

شبلی نعمانی

۱۴۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی (نواب صدر یار جنگ بہادر) کی ذات گرامی محتاج تعارف نہیں دولت کے جسم میں علم کی روح اور امارت کے ایوان میں فقر کی شمع کے مشاہدے کا شوق ہو، تو علی گڈھ کے اس بزرگ اور فاضل پٹھان کو دیکھ لینا کافی ہے موصوف نے خود ایک کتاب خانہ جمع کیا ہے اور اپنے معروف اوقات کے باوجود ایک ایک کتاب کو پڑھا اور اس کی فہرست تیار کی ہے۔ آپ کا غالباً پہلا سفر رامپور جنوری ۱۹۱۴ء میں پیش آیا تھا چنانچہ آپ نے ۲۶ ماہ مذکور کو کتاب خانے کا معاینہ فرما کر لکھا۔

"حافظ احمد علی خاں صاحب شوق کی مہربانی سے میں نے یہ نادر کتاب خانہ (جس کے دیکھنے کا میں عرصہ سے مشتاق تھا) دیکھا فرصت قلیل۔ ذخیرہ نایاب وکثیر۔ کچھ نہ دیکھ سکا۔

دامانِ نگہ تنگ وگلِ حسن تو بسیار
گلچینِ جمالِ تو ز داماں گلہ دارد

تاہم جو کچھ دیکھا اس کے ذوق سے روح وجد نشاط میں ہے۔ میں بھی تقریباً ۲۰ برس سے کتابوں کے جمع کرنے میں مصروف ہوں اس لئے اُس درد سے واقف ہوں جو کتابوں کی ترتیب ونگہداشت سے تعلق رکھتا ہے۔ اُس تجربہ کے رو سے کہہ سکتا ہوں کہ حافظ صاحب ممدوح بڑی توجہ ومحنت سے اور شوق دلی سے خدمتِ کتاب خانہ فرما رہے ہیں اگر میں سرکارِ عالی حضور والی ریاست رامپور کا سپاس ادا نہ کروں تو موجب ناسپاسی ہوگا، اس لئے کہ حضورِ ممدوح کے مراحم خسروانہ سے اس بے نظیر خزینۃ الکتب کے دیکھنے کا موقع ملا"

محمد حبیب الرحمٰن خاں شیروانی

۱۵۔ جناب خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی مشہور نظامی خانوادۂ علم وفضل اور سلوک وفقر سے علاقہ رکھتے ہیں۔ ان کے بزرگ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے سب سے پہلے ہندوستان میں پبلک لائبریری قایم فرمائی تھی آپ نے جن خوبصورت الفاظ اور جملوں میں اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا ہے اُس پر وجد آتا ہے:۔

"آج ۲۹ رجولائی ۱۹۳۱ء دوپہر کے وقت کتب خانۂ ریاست رامپور کو سالہا سال کے اشتیاق کے بعد دیکھا۔ جس طرح برقِ فلک کو دیکھ کر رہ جاتے ہیں اسی طرح تھوڑی فرصت میں مجھے اس تجلی خانۂ علوم کو دیکھنے کا موقع ملا کہ ہر چیز کو سرسری نظر سے دیکھ سکا۔

شجاعت علی خاں صاحب نائب مہتمم کتب خانہ بہت خلیق اور اپنے خاندان کے لحاظ سے ایک مجسم اور بولتی ہوئی کتاب ہیں، انھوں نے کتابوں کے دکھانے میں پوری مسافر نوازی ظاہر کی۔

میرا خیال ہے کہ یہ کتاب خانہ ہندوستان میں نہیں بلکہ موجودہ ایشیا میں ایک نایاب اور بے مثل کتب خانہ ہے۔ اور یقین ہے کہ موجودہ فرمانروائے رام پور ہز ہائینس نواب رضا علی خاں بہادر اپنی علم دوستی سے اس کو یورپ کے نادر کتب خانوں کے مقابلہ کا بنا دیں گے۔"

حسن نظامی دہلوی

۱۵۔ آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علیا حضرت ہز ہائنس وام اقبالہا کے اُن گرامی بہا کلمات پر اس باب کو ختم کیا جائے، جو ۲۸ مئی ۱۹۳۱ء کو کتاب خانے میں تشریف لاکر کتاب معائنہ میں اپنے مبارک قلم سے تحریر فرمائے ہیں۔ یہ گوہر بار ارشادات "قدر گوہر شہ بداند" کی بولتی تصویر ہیں ارشاد ہوتا ہے:۔

"آج حضور پُر نور فرماں روائے رام پور کی ہمراہی میں میں نے پھر اُن موتیوں کی چمک دیکھی جن کی ضیاباری سے دُنیا روشن ہے یہ موتی پہلے درِ منشور تھے اور خدا جانے کہاں سے کہاں تک بکھرے ہوئے تھے جن کو سلیقہ شعار علمائے کتب خانہ نے چُن چُن کر اور پہلو بہ پہلو جگہ دے کر نایاب سلکِ گوہر تیار کی ہے، ایشیائی علوم پر وری تاریخی حیثیت رکھتی ہے بغداد و مصر و اندلس و ایران کے کتب خانے کافی شہرت رکھتے تھے، اگرچہ اب اُن میں سے کچھ بھی باقی نہیں، سچ ہے۔

"رہے نام اللہ کا"

سلاطینِ ہندوستان نے بھی اپنے ذوقِ سلیم کا اظہار کیا ہے اور بیجاپور و حیدرآباد و لکھنؤ و دہلی کے شاہی کتب خانے آپ اپنی نظیر تھے، لیکن ہمارے رام پور نے بھی اپنے ذوقِ علمی کا کچھ

نمونہ پیش کیا ہے وہ یقیناً اس اسلامی حکومت کے شایانِ شان ہے، کتب خانہ کا سنگ بنیاد ریاست کی تعمیر کے ساتھ ساتھ رکھا گیا اور یہ دونوں ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے۔ الحمدللہ آج ان دونوں کی جوانی ہے اور پر بہار جوانی۔ معائنہ بک پر اکثر اہلِ بصیرت نے یہ فقرہ لکھا ہے کہ اس کتب خانہ کا مثل ہندوستان بھر میں نہیں ہے بلکہ جناب شبلی صاحب نے تو صاف صاف کہا ہے "میں نے روم و مصر کے کتب خانے بھی دیکھے مگر بحالتِ مجموعی رام پور کے کتب خانے سے کوئی افضل نہیں ہے۔ ریاست ان لفظوں پر جس قدر فخر کرے وہ بجا ہے۔ اس کے بعد مجھے بھی یہ کہنے کا حق ہے:-

للہ الحمد ٹھکانے لگی محنت میری

"علاوہ کتاب خانہ کا حسنِ انتظام خصوصاً کاوش و جستجو قابلِ امتنان و اطمینان ہے"

حررہٗ عسکری بیگم الملقب بہ رفعت زمانی بیگم۔

یونسکو اور ہندوستان

یونسکو کا بیج اصل میں ۱۹۴۲ء میں لندن میں بویا گیا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اس وقت تک جنگ کے مختلف مورچوں پر نازیوں کا پلّہ بھاری تھا اور یورپ کے بہت سے ملکوں کی حکومتیں اپنے اپنے علاقے سے بھاگ کر پناہ لینے لندن آگئی تھیں۔ تمام یورپ پر ہٹلر کے لشکروں کا قبضہ تھا اور ساری دنیا دھڑکتے ہوئے دل سے اس ہولناک جنگ کے انجام کی منتظر تھی۔

آپ کو شاید یہ بھی یاد ہوگا کہ جن حکومتوں نے ہٹلر کے خوف سے انگلستان میں پناہ لی تھی ان کے وزیر اور اربابِ حکومت لندن میں قلعہ بند بیٹھے تھے۔ بعد میں انھی حکومتوں نے اتحادی قوموں کی شکل اختیار کر لی اور موجودہ اتحادی قوموں کا زبردست ادارہ U. N. O. اُسی محصور لندن کی اتحادی قوموں کی ایک بہتر شکل ہے۔ ۱۹۴۲ء میں برطانیہ کے وزیرِ تعلیم مسٹر آر۔ اے۔ بٹلر نے اتحادی قوموں کے تعلیمی مشیروں اور وزیروں کو لندن میں جمع کیا اور ان کے سامنے لڑائی کے بعد ایک ایسا ادارہ بنانے کی تجویز رکھی جو تمام دنیا کے تعلیمی مسئلوں کا حل سوچ سکے۔ جون ۱۹۴۵ء میں سان فرانسسکو کانفرنس نے اس تجویز پر صاد کیا اور اکتوبر ۱۹۴۵ء میں لندن میں اتحادی قوموں کا ایک جلسہ طلب کیا گیا جس کے سامنے وہی ۱۹۴۲ء والی تجویز رکھی گئی۔ برطانیہ کے وزیرِ اعظم مسٹر اٹیلی نے اس جلسے کا افتتاح کیا اور سب نے مسٹر اٹیلی کے اس اعلان کی تائید کی کہ چونکہ لڑائی کا خیال سب سے پہلے انسان کے دماغ میں پیدا ہوتا ہے اس لئے امن کی قلعہ بندیاں بھی سب سے پہلے انسان کے دماغ ہی میں قائم ہونی چاہئیں۔ چنانچہ لندن کے اس جلسے میں ۴۴ اتحادی قوموں کے نمائندوں نے مل کر ایک ابتدائی کمیشن بنایا جس کے ممبروں کی تعداد ۱۵

تھی۔ لندن ہی میں اس ادارے کا نام یونسکو یعنی یونائیٹڈ نیشنز ایجوکیشنل سائنٹفک اینڈ کلچرل آرگنائزیشن تجویز ہوا اور یونسکو کے دستور پر غور و خوض شروع ہوا۔

ابتدائی کمیشن نے اپنا کام لندن کی ایک مختصر سی عمارت میں شروع کیا تھا اور اس میں کام کرنے والوں کی تعداد مشکل سے چند درجن تھی۔ بعد میں یونسکو کا ہیڈ کوارٹر پیرس میں بنانے کی تجویز منظور ہوئی اور ستمبر ۱۹۴۶ء میں لندن کا یہ مختصر دفتر پیرس کے ایک ہوٹل میں اٹھ آیا۔ مگر اب اس دفتر نے پاؤں پھیلانے شروع کئے اور چند مہینے کے اندر اس کے کارکنوں کی تعداد ۶۰۰ تک جا پہنچی جو ۲۸ مختلف قوموں سے لئے گئے تھے۔

اس وقت عارضی طور پر ڈاکٹر جولین ہکسلے یونسکو کے ڈائرکٹر جنرل تھے اور ان کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ نومبر ۱۹۴۶ء میں یونسکو کی پہلی کانفرنس سے پہلے پہلے اس کا سارا پروگرام اور لائحہ عمل تیار کردیں۔

یونسکو کے پروگرام پر بحث کرنے سے پہلے ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ ایک بین الاقوامی ادارہ ہے اور اس کا تعلق تعلیم، سائنس، کلچر اور پروپگنڈے سے ہے۔ یونسکو کے پروگرام میں تعلیم کا مقصد صرف پرائمری اسکولوں یا ثانوی مدرسوں سے نہیں ہے اور نہ اس کا دائرۂ عمل یونیورسٹی کی تعلیم تک محدود ہے بلکہ یونسکو کے نزدیک تعلیم سے مراد ایسی تعلیم ہے جو اسکول جانے سے پہلے بچہ شروع کردیتا ہے اور اس کا دوسرا سرا کالج سے نکل کر بالغوں کی تعلیم سے جا ملتا ہے۔ اس میں ایسے گروپ اور ایسی مجلسیں بھی شامل ہیں کہ جہاں بالغ پڑھے لکھے مل کر تعلیمی مسائل پر گفتگو کرتے ہیں، جہاں ادبی مباحثے ہوتے ہیں، جسمانی صحت کے بارے میں غور کیا جاتا ہے، زراعت اور کھیتی باڑی کے متعلق مشورے دئے جاتے ہیں، شہریت کے اصول سمجھائے جاتے ہیں اور بین الاقوامی تعلقات کی وضاحت کی جاتی ہے۔

اسی طرح سائنس کی تعریف میں صرف وہ سائنس شامل نہیں ہے جو ہم اسکولوں اور

کالجوں میں نصاب کے طور پر پڑھتے ہیں بلکہ سائنس کے ذیل میں یونسکو نے آرکیالوجی، معاشیات اور سیاسیات تک کو شامل کر لیا ہے۔ چنانچہ کلچر کی تعریف میں موسیقی، نقاشی، تواریخ انسانیات، تھیٹر، کتب خانے اور فلسفے کی اکثر شاخیں شامل ہیں۔

یونسکو نے اپنے پروگرام میں Mass Media یعنی پراپگنڈے کو بھی شامل کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یونسکو اپنے پروگرام کو اخبارات، فلم اور ریڈیو کے ذریعے عوام تک پہنچانا چاہتی ہے۔

یونسکو کے دستور میں لکھا ہے کہ اس کے مقاصد دو طرح کے ہیں، ایک تو دنیا میں امن چین قائم کرنا اور دوسرے انسان کی بھلائی اور بہتری کی راہیں بتانا۔ یہ دونوں مقصد تعلیم، سائنس اور کلچر کے ذریعے ہی سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ یونسکو کے دستور میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان مقاصد کو حاصل کرتے وقت یونسکو والے نسل اور رنگ اور قومیت کی دیواروں کو اپنے راستے میں حائل ہونے نہیں دیں گے، نہ اس کے سامنے مذہب اور زبان کی قید ہوگی، بلکہ یونسکو کی گنگا سے امیر اور غریب، عالم اور جاہل، پڑھے لکھے اور اَن پڑھ سب ہی سیراب ہو سکیں گے۔

یونسکو کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر جولین ہکسلے نے اپنی رپورٹ میں ایک بات بہت پتے کی کہی تھی :-

"اس وقت دنیا کے بسنے والوں میں آدھے سے زیادہ انسان لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔ ایسی صورت میں یونسکو کا کام تسلی بخش طریقے سے کیسے چل سکتا ہے۔ یہ لوگ ان خیالات سے عاری ہیں جن پر خوشگوار زندگی، لہلہاتے کھیتوں اور سائنس کی بنیادیں قائم ہیں۔ اس وقت دنیا کے بڑے بڑے سائنس داں تمام دنیا کی قوموں کے صرف ایک چوتھائی حصے میں بیٹھے ہیں، پھر ہم سائنس سے تمام دنیا کو فائدہ کیسے پہنچا سکتے ہیں۔ اگر دنیا میں بسنے والوں کے لئے ہم پیٹ بھر کھانا اور ان کی صحت کے لئے موزوں اور مناسب حالات پیدا نہیں کر سکتے تو پھر ہم یہ اُمید

کیسے کر سکتے ہیں کہ یہ بھوکے اور کمزور انسان تعلیم سے بھی فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں گے۔"

ڈاکٹر کمیلے نے آخر میں یہ بھی کہا کہ "جب تک انسان سائنس اور زیادہ سمجھ بوجھ سے کام نہیں لیتا اس وقت تک یہ بیماریوں اور بھوک کا شکار رہتا رہے گا۔"

اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ یونسکو کے کارکنوں کو اپنی مشکلات کا پورا پورا احساس ہے اور یہ لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ تعلیم، کلچر اور سائنس کا تعلق انسان کی بھوک اور بیماری سے ہے۔ جب تک انسان کو پیٹ بھر روٹی نہیں ملتی اس وقت تک تعلیم، کلچر اور سائنس اس کے لئے محض ایک خواب ہیں۔ چنانچہ یونسکو کے پروگرام میں ان قوموں اور ملکوں کی امداد بھی شامل کی گئی ہے جو جنگ کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے تباہ و برباد ہو گئے۔ ان ملکوں میں نئے سرے سے زراعت اور کھیتی باڑی کرنے کے لئے یونسکو کی طرف سے مدد ملے گی۔ جن ملکوں میں جنگ کی وجہ سے مدرسوں اور اسکولوں اور تعلیمی اداروں پر تباہی آئی ہے وہاں یونسکو تعلیمی اداروں کو پھر سے قائم کرنے میں ہاتھ بٹائے گی۔ جن ملکوں میں سائنس کے تجربوں کا سامان جنگ کی نذر ہو گیا ہے وہاں یہ سامان یونسکو کی طرف سے فراہم کیا جائے گا۔ اور جہاں جہاں جنگ کی وجہ سے بچوں کے پڑھنے کی کتابیں ضائع ہو گئی ہیں وہاں یہ کتابیں یونسکو کی معرفت بھیجی جائیں گی۔

اس وقت مشرق اور مغرب دونوں جگہ جنگ کی ہولناک تباہ کاریوں کا اثر خاص طور سے تعلیمی اداروں پر محسوس کیا جا رہا ہے اور یونسکو نے اس کام کے لئے دس کروڑ ڈالر کی ایک اسکیم منظور کی ہے۔ یہ رقم ان ملکوں سے چندے کے طور پر لی جائے گی جو ستم رسیدہ ممالک کی مدد کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات دلچسپی سے سنی جائے گی کہ ایسے ستم رسیدہ ملکوں کی فہرست میں چین کا نمبر کافی اونچا ہے۔ چین کے علاوہ مدد پانے والے ملکوں میں چیکوسلاواکیہ، البجیم، یونان، ہالینڈ، ایران، فرانس، لکسم برگ، جزائر فلپائن، اور پولینڈ کے نام بھی شامل ہیں۔ یونسکو کے کارکنوں نے پہلے ہر ایک ملک کی ضروریات کا اندازہ لگایا ہے اور اس طرح جائزہ لینے

کے بعد اس نقصان کی ایک مکمل فہرست بنائی ہے جو اس ملک نے جنگ کی وجہ سے اٹھایا ہے۔ مثلاً اندازہ لگایا گیا ہے کہ چین کے تعلیمی اداروں کے صرف مکانات کو ۴۰ کروڑ ڈالر کا نقصان پہنچا ہے۔ اس کے علاوہ کتابوں، اخبارات، سائنس کے آلات اور مخطوطات کے نقصان کا شمار ۲۰ کروڑ ڈالر کے لگ بھگ ہے۔ اس نقصان میں ابھی فنون لطیفہ کے ان بیش بہا ذخیروں کو شامل نہیں کیا گیا ہے جو جاپانیوں کے ہاتھ سے چین میں برباد ہو گئے۔

یونسکو نے دنیا کے جن ملکوں سے چندے کی اپیل کی ہے۔ ان میں نمایاں طور پر ریاستہائے متحدہ امریکہ، برطانیہ، کینیڈا، نیوزی لینڈ، برازیل اور ہندوستان کے نام نظر آتے ہیں۔

اس سلسلے میں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ جب یونسکو کی جنرل کانفرنس میں اس امداد پر بحث ہوئی اور ایسے ملکوں کی فہرست گنوائی گئی جنھیں جنگ کی وجہ سے نقصان پہنچا ہے تو اس موقع پر ہندوستانی ڈیلیگیشن کے لیڈر سر رادھا کرشنن نے کھلے اجلاس میں کہا تھا۔

"ابھی یونسکو کے سکریٹری نے ان بدقسمت ملکوں کا ذکر کیا تھا جو کسی تاریخی حادثے کی وجہ سے ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے۔ ہمارا ملک ہندوستان بھی ان بدقسمت ملکوں میں شامل ہے۔ ہندوستان کے مرد صرف ۱۶ فی صدی اور عورتیں صرف ۴ فی صدی پڑھی لکھی ملیں گی۔ ہندوستان میں یہ عام بات ہے کہ لاکھوں ہمارے بھائی آدھا پیٹ کھانا کھاتے ہیں۔ شاید بہت سے ہندوستانیوں کو پیٹ بھر کر کھانا تو مل جاتا ہے مگر یہ خوراک ایسی ادنیٰ ہوتی ہے کہ بیماریوں سے یہ مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہم یہ چاہتے ہیں کہ یونسکو جب غذا کی چھان بین کرنے کا کوئی ادارہ قائم کرے تو ہندوستان میں بھی اس کا مرکز بنایا جائے۔"

یہ میں نے مثال کے طور پر یونسکو کے پروگرام کی صرف ایک مد آپ کو سنائی ہے ورنہ یونسکو کے سامنے اتنا بڑا پروگرام ہے کہ اسے پورا کرنے کے لئے تقریباً ۲ ملین ڈالر کی رقم کوئی زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ یونسکو کے کام کی نوعیت کو سوچتے وقت ہمیں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ اب دنیا سکڑ کر چھوٹی سی جگہ بن گئی ہے۔ اور تاریخ میں پہلا موقع ہے کہ ہم اکثر

باتوں کے متعلق اس لحاظ سے غور کرسکتے ہیں کہ ان کا اثر تمام دنیا پر کیا پڑے گا اور اسی وجہ سے اب یہ بھی ممکن ہوگیا ہے کہ ہم عالمگیر بین الاقوامی ادارے بھی قائم کرسکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس وقت قومیت کا سوال تمام دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ قومی جذبے کا احساس شاید اس سے پہلے اتنی شدت سے کبھی نہیں ہوا تھا اور یہ احساس بین الاقوامی اداروں کے راستے میں بار بار حائل ہورہا ہے۔ چنانچہ یونسکو کو بھی انہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

میرے خیال میں اگر میں آپ کے سامنے یونسکو کانفرنس کی مختصر روئداد پیش کردوں تو شاید آپ کو اس کا پروگرام سمجھنے میں آسانی ہوگی اور اس کے ساتھ ساتھ ہندوستانی ڈیلیگیشن کے نقطۂ نظر کا اندازہ بھی ہوجائے گا۔

یونسکو کانفرنس ۱۹ نومبر ۱۹۴۶ء کو پیرس میں منعقد ہوئی۔ اگرچہ دنیا بھر کے مختلف ملکوں سے ڈیلیگیٹ کئی دن پہلے سے پیرس پہنچنے شروع ہوگئے تھے، فرانسیسی گورنمنٹ نے یونسکو کے دفتر کے لئے ایک بہت بڑا ہوٹل تجویز کیا تھا اور ستمبر کے مہینے میں یونسکو کا مختصر سا دفتر لندن سے آکر اسی ہوٹل میں جم گیا تھا۔ کسی زمانے میں ہوٹل میجسٹک کے نام سے یہ عمارت پیرس میں بہت مشہور تھی۔ بعد میں جب جرمنوں کا پیرس پر قبضہ ہوا تو اس میں جرمن گسٹاپو نے اپنا مرکز قائم کرلیا اور اب یہی عمارت یونسکو ہاؤس کہلاتی ہے جسے دنیا کی ۴۰ سے زیادہ قوموں نے اپنے تعلیمی اور کلچرل ہیڈکوارٹر کے طور پر چنا ہے۔ یونسکو ہاؤس ۵ منزل کی ایک عظیم الشان عمارت ہے۔ جس کی چار بالائی منزلوں پر یونسکو کے مختلف دفاتر اور دنیا بھر کے ڈیلیگیشنوں کے بیٹھنے کے کمرے ہیں اور گراؤنڈ فلور پر جلسوں اور مشوروں کے لئے بڑے بڑے ہال کمرے۔ عمارت میں داخل ہوتے ہی دفتر اطلاعات ہے جہاں دنیا کی بہت سی زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ اور اس دفتر سے مندوبین کو ہر قسم کی معلومات مل سکتی ہیں۔ اسی کے برابر بنک، ڈاک خانہ، فوٹوگرافر کی دکان، سینما اور تھیٹر کے ٹکٹ بیچنے کی کھڑکی، راشن کا دفتر اور اخباروں کی دکان

ہے۔ غرض یونسکو ہاؤس ایک چھوٹی سی دنیا ہے جہاں ہر ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔ اس عمارت کے لاؤنج میں ہر وقت دنیا بھر کے بسنے والے میٹھے باتیں کرتے رہتے ہیں اور بعض دفعہ جب کہ ہر وقت کی خشک کارروائی سے دل گھبرا جاتا ہے تو ڈیلی گیٹ لاؤنج میں آکر جی بہلا لیتے ہیں۔

پیرس میں کھانے پینے کی چیزوں کی بہت کمی ہے اور بلیک مارکٹ کا اتنا زور ہے کہ ہندوستان کی بلیک مارکٹ اس کے مقابلے میں بہت کھری معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے یونسکو کے کارکنوں نے ڈیلی گیٹوں کے کھانے کا انتظام بھی یونسکو ہاؤس میں ہی کیا تھا جہاں مقابلۃً کھانا سستے داموں پر مل سکتا تھا۔ اسی عمارت میں تقریریں ریکارڈ کرنے کا بھی بندوبست کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ بی۔ بی۔ سی لندن سے براہ راست ٹیلیفون پر مقررہ اوقات میں بات چیت ہو سکتی تھی اور مائکروفون کے ذریعے پیرس سے تقریریں لندن میں ریکارڈ کر لی جاتی تھیں۔ چنانچہ اکثر ہندوستانی ڈیلی گیٹوں کی بہت سی تقریریں آپ نے بھی ریڈیو پر سنی ہوں گی۔

فرانسیسی گورنمنٹ نے مندوبین کی سہولت کے لیے بہت سی موٹریں یونسکو کے حوالے کردی تھیں اور خوش اخلاق فرانسیسی ڈرائیوروں کی مدد سے ہم پیرس کی اس طرح خوب سیر کر سکتے تھے۔

مندوبین کے ٹھہرنے کے لئے پیرس کے ہوٹلوں میں کمرے مخصوص کرائے گئے تھے اور کوشش یہ کی گئی تھی کہ جہاں تک ہو سکے ڈیلی گیٹ یونسکو ہاؤس سے زیادہ دور نہ ٹھہریں تاکہ آنے جانے میں آسانی رہے۔ چنانچہ ہندوستانی ڈیلی گیشن جس ہوٹل میں مقیم تھا یہ جگہ یونسکو ہاؤس سے مشکل سے ۱/۲ فرلانگ پر ہوگی۔

۱۹ نومبر تک ان تمام اتحادی قوموں کے نمائندے جو یونسکو کی بھی ممبر ہیں پیرس پہنچ گئے۔ یونسکو کانفرنس کا پہلا اجلاس پیرس کی قدیم سوربون یونیورسٹی میں ہونے والا تھا جس کی روایات انگلستان کی آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ دوسرے سوربون یونیورسٹی پیرس شہر کے اُس حصے میں واقع ہے جسے عرف عام میں لاطینی کوارٹر کہتے ہیں۔ لاطینی کوارٹر کی فضا میں فنون لطیفہ اور علم و ادب صدیوں سے ایسے رچ گئے ہیں کہ اس علاقے کے ریستوران اور

تہہ خانے بھی یونیورسٹی کی علمی زندگی کا جز معلوم ہوتے ہیں۔

سوربورن یونیورسٹی کے عظیم الشان ہال میں آج تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ چبوترے پر پیرس کے بڑے بڑے علمار اور فضلار بیٹھے تھے۔ ان کے برابر سیاست دانوں اور غیر ملکی سفیروں کو جگہ دی گئی تھی اور نیچے ہال کمرے میں اتحادی قوموں کے نمائندے جمع تھے۔ ان میں سے اکثر نمائندے آج اپنا اپنا قومی لباس پہن کر آئے تھے چنانچہ تماشائیوں کی نظریں کبھی سعودی عرب کے شیوخ کی سیاہ عباؤں پر پڑتی تھی کبھی لوگ ہندوستانی ڈیلیگیشن کے لیڈر سر رادھا کرشنن کی سیاہ شیروانی کو دیکھتے تھے اور کبھی پیرس والوں کی نظریں راجکماری امرت کور کی بنارسی ساڑی کا نہایت ادب سے جائزہ لیتی ہوئی فلی پائن کے نمائندے پر جا پڑتی تھیں۔

اس اجلاس میں پیرس یونیورسٹی کے ریکٹر، فرانس کے وزیر تعلیم، برطانی ڈیلیگیشن کے لیڈر اور فرانس کے وزیر اعظم نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور شام کے ۵ بجے یہ جلسہ ختم ہوا۔

دوسرے روز یونسکو ہاؤس میں یونسکو کے باقاعدہ اجلاس شروع ہوئے۔ سب سے پہلے سب مندوبین نے مل کر فرانس کے مشہور سیاسی رہنما موسیو بلوم کو یونسکو کا صدر چنا اور اس کے بعد یونسکو کے ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر جولین کھسلے نے اپنی رپورٹ پڑھی جس کا حوالہ میں اس مضمون کے شروع میں دے چکا ہوں۔ ڈاکٹر کھسلے کی رپورٹ کے بعد اس پر عام بحث شروع ہوئی اور سب سے پہلے سر رادھا کرشنن نے ہندوستان کی طرف سے رپورٹ پر بحث کا آغاز کیا۔

سر رادھا کرشنن کی تقریر ہندوستان کے اخباروں میں آچکی ہے اور آپ میں سے بہت سے حضرات نے اسے ریڈیو پر بھی سن لیا ہوگا۔ اس تقریر کا سب سے ضروری پہلو یہ تھا کہ سر رادھا کرشنن نے اتحادی قوموں کو ان وعدوں کی یاد دلائی جو جنگ کے دوران میں انھوں نے عوام سے کئے تھے اور کہا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد ہماری سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ عوام کے لئے ترقی اور تعلیم کے موقعے فراہم کریں۔ یونسکو اس وقت تک بے کار ہے جب تک کہ یہ زندگی کا ایک نیا فلسفہ پیش نہ کرے اور یونسکو کا پروگرام اس وقت تک کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک

کہ ہم اس کے ذریعے زندگی کی قدریں نہ بدل دیں۔

سر رادھا کرشنن نے مغربی ملکوں کے ذہن نشین یہ بات بھی کرائی کہ یونسکو کے کام کرنے والوں میں صرف مغربی یورپ اور امریکہ والوں کا ہی حصہ نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اس قسم کا کام کرنے کی صلاحیت ہندوستان اور چین کے باشندوں میں بھی موجود ہے اور یونسکو کے پروگرام میں مشرقی ملکوں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ سر رادھا کرشنن کا یہ اعلان صرف ہندوستان کی طرف سے نہیں تھا بلکہ تمام مشرقی ممالک کی حمایت میں انھوں نے یہ آواز بلند کی تھی۔ چنانچہ عراق، مصر، ایران، فلپین اور شام کے نمائندوں نے فرداً فرداً ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس کے بعد ہمیں اب کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہی۔

ڈاکٹر ہکسلے کی رپورٹ پر اور نمائندوں نے بھی بحث کی اور یہ بحث تین دن تک ہوتی رہی۔ اس کے بعد راجکماری امرت کور نے جرمنی، اٹلی اور جاپان کے ہارے ہوئے ملکوں کو بھی یونسکو میں شریک کرنے کی تجویز پیش کی کیونکہ کلچر اور تعلیم میں فاتح اور مفتوح میں کوئی تمیز نہیں کی جاسکتی۔ پروفیسر سیدین نے اپنی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ اس وقت دنیا میں بسنے والے رسدگاہیں بنانے سے زیادہ ضروری بات یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے بچوں کو جنگ کی ہولناک تباہ کاریوں سے بچایا جائے۔ چنانچہ یونسکو کے پروگرام میں بھی تعلیم سے زیادہ زور امن وامان کے قیام پر دینا چاہئے۔

اسی دوران میں یونسکو کی مجلس انتظامیہ کے لئے ۱۸ ممبر چنے گئے اور ان ممبروں میں سر رادھا کرشنن بھی شامل تھے۔ اس کے بعد جنرل کانفرنس مختلف کمیٹیوں میں بٹ گئی جن کی تفصیل یہ ہے۔ اس تفصیل کے ساتھ میں یہ بھی عرض کروں گا کہ ان کمیٹیوں پر کون کون ہندوستانی نمائندے کام کررہے تھے۔

۱۔ تعلیمی کمیٹی: راجکماری امرت کور، پروفیسر سیدین۔

۲۔ ریلیف کمیٹی: پروفیسر سیدین۔

۳۔ سائنس کمیٹی: پروفیسر بھابھا۔

۴۔ پروپیگنڈا کمیٹی: پروفیسر سیدین اور اشرف۔

۵۔ لائبریری کمیٹی: سر جان سارجنٹ، مسٹر کرپال۔

۶۔ فلسفہ کمیٹی: سر رادھا کرشنن۔

۷۔ فنونِ لطیفہ: پروفیسر ہما بھا، مس۔ بوس۔

۸۔ مالیات اور نظم ونسق کی کمیٹی: سر جان سارجنٹ۔

تعلیمی کمیٹی میں پروفیسر سیدین نے اس تجویز کی تائید کی کہ سب اتحادی ملکوں کو اپنی اپنی نصاب کی کتابوں کی نظرثانی کرنی چاہیے کیونکہ بہت سی درسی کتابوں میں بعض ایسے واقعات موجود ہیں کہ جن کا تعلق تاریخ سے نہیں بلکہ قومی تعصب سے ہوتا ہے اور ایسی درسی کتابوں کے پڑھنے سے طالب علموں کے دل و دماغ میں دوسری قوموں کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

اس پر جنوبی افریقہ کے نمائندے نے اعتراض کیا کہ کسی دوسرے ملک کو کسی ملک کی اندرونی تعلیمی پالیسی پر نکتہ چینی کا حق حاصل نہیں ہو سکتا۔ سیدین صاحب نے فی البدیہہ جواب دیا کہ اگر ہر ایک قوم کا دل صاف ہے تو اس بارے میں اسے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس تجویز کو یونسکو نے بالآخر منظور کر لیا۔

ہندوستانی نمائندوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ بین الاقوامی تعلقات بہتر بنانے کے لیے تمام قومیں اپنے اپنے اسکولوں اور کالجوں میں بین الاقوامی کلب کھولیں کہ جہاں طالب علم دوسرے ملکوں کے متعلق معلومات حاصل کر سکیں۔ اس قسم کی تحریکوں سے طالب علم قومیت کی زنجیروں میں ہی جکڑے نہیں رہیں گے بلکہ انٹرنیشنل حالات سے بھی واقف ہو جائیں گے۔ یہ تجویز بھی منظور ہو گئی۔

پروپیگنڈا کمیٹی کے سامنے اخبارات، فلموں اور ریڈیو کا سوال تھا۔ پروفیسر سیدین نے فلموں کی پالیسی پر بہت عمدہ نکتہ چینی کی اور کہا کہ اب تک ہم امریکی زندگی کا نقشہ ہالی وڈ کے بنائے

ہوئے فلموں کے ذریعے سے دیکھتے ہیں جو امریکی زندگی کے بارے میں غلط خیالات ہمارے ذہن میں قائم کرتے ہیں۔ اسی طرح امریکی فلم ہمیشہ ہندوستان کو یا تو بے حد متمول ملک دکھاتے ہیں یا ان فلموں کے ذریعے یہ دکھایا جاتا ہے کہ عام طور سے ہندوستانی توہم پرست ہیں، ان میں تعلیم اور تہذیب کی کمی ہے اور یہ اب بھی تاریخ کے اس دور سے گزر رہے ہیں کہ جسے ہم قرونِ وسطیٰ کہتے ہیں۔ اس کے جواب میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ پبلک کا مذاق تیسرے درجے کے فلموں کو پسند کرتا ہے اس لئے عام طور سے فلم بھی اسی قسم کے بنائے جاتے ہیں۔ پروفیسر سیدین نے کہا اگر یہ صحیح ہے تو اس کی ذمہ داری ایک بہت بڑی حد تک ہمارے تعلیمی نظام پر پڑتی ہے کہ تعلیم نے اس قسم کے سستے معیار کو اب تک کیسے برداشت کیا۔ فنونِ لطیفہ کے میدان میں معیار کا اونچا رہنا کوئی بُری بات نہیں ہے۔ لیکن تجارت کی قربان گاہ پر بلند معیار کو گرانا ایک ایسا گناہ ہے کہ جسے کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔

اسی کمیٹی کے سامنے یہ بھی تجویز پیش کی گئی تھی کہ یونسکو کا پروگرام تمام دنیا تک پہنچانے کے لئے ایک بہت بڑا ریڈیو اسٹیشن قائم کیا جائے۔ ہندوستان کی طرف سے میں نے اس تجویز کی مخالفت دو وجہ سے کی، ایک تو اتنا بڑا ریڈیو اسٹیشن کہ جس کی آواز تمام دنیا تک پہنچ سکے اتنا زبردست خرچ ہے کہ جسے یونسکو کا مختصر بجٹ برداشت نہیں کر سکتا۔ دوسرے تجربے نے ثابت کیا ہے کہ شارٹ ویو پر جو پروگرام نشر کئے جاتے ہیں وہ سننے والوں تک صاف صاف نہیں پہنچتے چنانچہ جب تک شارٹ ویو کی مدد پر جا بجا میڈیم ویو کے مقامی اسٹیشن نہ قائم کئے جائیں اس وقت تک ایک مرکز سے تمام دنیا کے لئے پروگرام نشر کرنا تحصیل حاصل ہے۔ میں نے اس تجویز میں یہ ترمیم پیش کی کہ یونسکو ریڈیو کی جگہ فی الحال یونسکو کے ہیڈکوارٹر میں ایک ریڈیو کا محکمہ قائم کیا جائے اس محکمے میں یونسکو کے خیالات اور ارادوں کے مطابق پروگرام ترتیب دئے جائیں اور ان پروگراموں کو ریکارڈ بند کرنے کے بعد دنیا کے دوسرے اسٹیشنوں کو نشر کرنے کے لئے بھیج دیا جائے یا ان پروگراموں کا مواد اتحادی قوموں کے حوالے کر دیا جائے تاکہ سب قومیں اپنی اپنی لسانی

استعمالی ضرورت کے مطابق اس پروگرام کو مناسب ردو بدل کے بعد اپنے ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر کرلیں۔ میری اس ترمیم کو پروپیگنڈا کمیٹی نے منظور کرلیا۔

اس کمیٹی کے سامنے سب سے دلچسپ اور مفید تجویزیں برطانی ڈیلیگیشن کی طرف سے مشہور انگریز ادیب مسٹر پریسٹلے نے رکھی تھیں۔ ان تجویزوں میں تعلیمی فلموں کا خاص طور سے ذکر تھا۔ کیونکہ تجربے نے ثابت کیا ہے کہ اخبارات اور ریڈیو سے زیادہ ہم اپنے خیالات کی تبلیغ فلموں کے ذریعے کرسکتے ہیں۔ تعلیمی فلموں کے میدان میں اگرچہ پہلی کوشش برطانیہ نے کی تھی مگر اب امریکہ، سویڈن، روس اور فرانس نے بھی اس قسم کے بہت اچھے اچھے فلم تیار کئے ہیں۔ جرمنی میں بھی تعلیمی فلموں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے جنھیں یونسکو نے مناسب ردو بدل کے بعد استعمال کرنے کی تجویز منظور کی ہے۔

مجھے خطرہ ہے کہ اگر میں یونسکو کی تمام سب کمیٹیوں کا کام آپ کو سنانے کا ارادہ کروں تو یہ کہانی ختم نہیں ہوگی۔ اس لئے میں اس ذکر کو یہیں ختم کرتا ہوں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ اس مختصر روداد سے آپ کو یونسکو کے لائحۂ عمل کا اندازہ ضرور ہوگیا ہوگا۔

ہاں ایک بات اور بیان کرنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ یہ کہ یونسکو نے بھی بنیادی تعلیم کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی ہے جس کا جلسہ پیرس میں ہونے والا ہے۔ بنیادی تعلیم کے سلسلے میں جو کام شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے کیا ہے اس کا حال سب کو معلوم ہے اور اب آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ گورنمنٹ آف انڈیا کی درخواست پر ڈاکٹر ذاکر صاحب نے یونسکو کی بنیادی تعلیم کی کمیٹی میں شرکت منظور فرمالی ہے۔ ہم سب کو افسوس تھا کہ جامعہ کے جشن جوبلی کی وجہ سے ذاکر صاحب ہندوستانی ڈیلیگیشن کے ساتھ پیرس نہ جاسکے۔ مگر ایک حد تک یہ کمی بنیادی کمیٹی میں شرکت سے پوری ہوجائے گی۔

یونسکو برادری میں سب ڈیلیگیٹوں کی آنکھیں بار بار روس کو ڈھونڈ رہی تھیں کیونکہ روس نے ابھی تک یونسکو میں شرکت نہیں کی۔ اس کی چاہے وجہ کچھ بھی ہو لیکن روس کے شامل نہ ہونے

سے یونسکو کی بین الاقوامی حیثیت میں کمزوری پیدا ہوجاتی ہے۔ یونسکو میں باربار سب ڈیلی گیشن نے یہی کہا تھا کہ اس میدان میں بڑی اور چھوٹی قوموں کا سوال پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں تو ہر بات کو سچائی اور صداقت کی کسوٹی پر کسا جائے گا۔ ورنہ اگر تعلیم، کلچر اور سائنس کے مسئلوں میں بھی طاقت ور اور کمزور قوموں کی دھڑے بندی قائم ہوگئی تو ہماری نجات کی کوئی صورت نہیں ہوسکتی۔

یونسکو کے جلسوں میں یہ بالکل حسنِ اتفاق تھا کہ سب سے پہلی تقریر ہندوستانی ڈیلی گیشن کے لیڈر نے کی اور یونسکو کے آخری اجلاس میں ۱۰ دسمبر کو ہندوستان کے ایک اور ڈیلی گیٹ سیدین صاحب نے آخری تقریر کی۔

اس تقریر میں سیدین صاحب نے چند باتیں بہت پتے کی کہی تھیں مگر حاضرین نے سب سے زیادہ اقبال کے ان اشعار کو پسند کیا تھا جو سیدین صاحب نے خطرے سے آگاہی کے طور پر سنائے تھے۔

اقبال کے وہ دو شعر یہ ہیں ؎

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا کا سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اور انھی اشعار پر میں بھی اپنا بیان ختم کرتا ہوں۔

آغا محمد اشرف

ا ب ت ث ج چ ح خ

برسات

بادل کا آنچل لہراتی بجلی کے کنگن چمکاتی
دامن کی نمناک ہوا سے دل کو آتش زار بناتی
آئی، لو برسات پھر آئی
آئی لو برسات

"نیل کنول" نے لی انگڑائی کلیوں نے گویائی پائی
دور کہیں مستانہ لے میں چرواہے نے تان اڑائی
آئی، لو برسات پھر آئی
آئی لو برسات

میدانوں میں آئیں بہاریں جنگل جنگل مور پکاریں
دھرتی کے پیاسے ہونٹوں پر امرت کی پڑتی ہیں پھواریں
آئی، لو برسات پھر آئی
آئی لو برسات

کھیتوں پر آیا ہے جوبن ہر وادی مالن کا دامن
رنگ و بو کی ارزانی سے جنت در جنت ہر گلشن!
آئی، لو برسات پھر آئی
آئی لو برسات

میخواری پھر عام ہوئی ہے   توبہ غرقِ جام ہوئی ہے
آؤ چلو میخانے جائیں   وقت سے پہلے شام ہوئی ہے

آئی، لو برسات پھر آئی
آئی لو برسات

رم جھم، رم جھم پانی برسے   چھم چھم کرتی آجا گھر سے
آجا، آجا دید کو تیری !   آخر کب تک کوئی ترسے؟

آئی، لو برسات پھر آئی
آئی لو برسات

(سلیمان اریب)

مدرسہ میں دل نہ کہ دماغ

ملک کے ان بدلتے ہوئے حالات میں - انھیں بگڑتے ہوئے کہا جائے یا سدھرتے ہوتے، سمجھ میں نہیں آتا کیا کہا جائے، تعلیم، بچوں کی تربیت، مدرسہ، اس کی جدید تنظیم، نصاب، مضامین اور ان کی نئی ترتیب و تشکیل، اور دوسری جنگ عظیم کے تجربات کی روشنی میں ساری تعلیم کی ازسرِ نو تصویر کشی، تاکہ یہ عالم حقیقی معنوں میں "ایک عالم" ہو سکے یہ سب ایسی باتیں ہیں جو بظاہر بے وقت کی شہنائی اور صدائے بے ہنگام سے زیادہ نہیں - بھلا، جہاں سر پھٹول ہو، ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہو، پڑوسی، پڑوسی کا گلا کاٹنے پر آمادہ ہو، جس سماج میں ناخن و گوشت کا رشتہ بے معنی ہو چکا ہو، انسان اور اس کی شرافت، زندگی اور اس کی قدریں اپنی اہمیت کھو چکی ہوں، ان کی کھلم کھلا اہانت کی جا رہی ہو، انسانیت بہیمت کے اُس اسفل السافلین میں پہنچ چکی ہو کہ مرد کا قوی ہاتھ عورت جیسی کمزور جنس پر اُٹھ سکے، مضبوط اور بھرے ہوئے بازوؤں سے ننھی اور کمزور کلیوں کے مسلنے کا کام لیا جائے، تعلیم، تہذیب اور شائستگی کا تذکرہ بے محل نہیں تو اور کیا ہے - -

جہاں خدا کے بندے، خدا کی بندگی کا دم بھرنے والے بندے، خدا کے بندوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے ہوں اور کتّے کی موت مار رہے ہوں اور اسی میں اپنے لئے دل کا سکھ اور روح کا چین تلاش کر رہے ہوں، وہاں تمدّن، اور انسانی ارتقا کی داستان مجذوب کی بڑ کے سوا اور کیا ہے! مگر روغن داغ،

بالغ نظر اور صاحب بصیرت اچھی طرح جانتے اور خوب سمجھتے ہیں کہ یہ خیر ہے کس مُبتدا کی، اور نتیجہ ہے کن اسباب کا، آخر ہمارے دیس کے انسان کا سر تو نہیں پھر گیا ہے، اور یقیناً نہیں پھر گیا تو پھر اس ابتلائے عظیم کے وجوہ تلاش کرنا ہوں گے، ان وجوہ کی تلاش میں جہاں، تہاں سرگرداں ہونے کے بعد تان انسانی شخصیت ہی پر آکر ٹوٹے گی اور وجوہ اس انسانی شخصیت کی گہرائی ہی میں ملیں گے۔ اس انسانی شخصیت کی تشکیل تہذیب اور تربیت میں مدرسہ نے کتنا اور کیا حصّہ لیا، ہمیں اس کا جائزہ لینا ہے۔

کاروباری حکمرانوں کے ہاتھوں ہماری کیا درگت بنی اس کی داستان پارینہ بھی ہے اور فرسودہ بھی۔ اس پر رونا عبث ہے لیکن ستم تو یہ ہے کہ اپنی تعلیمی بدحالی کا احساس ہو جانے کے بعد بھی ہم نے اپنے لئے تعلیم کا جو ہتھیار تیار کیا، اس میں بھی ان بنیادی عناصر کی تربیت اور تقویت کا پورا پورا امکان نہیں ہے جو زندگی میں نصاب کے مختلف مضامین سے کہیں زیادہ اہم ہیں اور جن کی صحیح تربیت نہ ہونے کی وجہ سے آج ہم اس مصیبت میں مبتلا ہیں گو اس میں شک نہیں کہ ہماری پچھلی تعلیم کے مقابلہ میں نئی تجویزیں انقلابی ہیں۔ اس میں نصاب، مضامین اور طریقہ تعلیم پر کافی توجہ کی گئی ہے، جمہوریت اور اشتراکِ عمل کی روح بھی پھونکی گئی ہے اور سچ پوچھئے تو اس ملک میں پہلی مرتبہ تعلیم کو صحیح چولا نصیب ہوا ہے مگر اس میں بھی جذبات کی تربیت لاشعور کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ Hearts not heads in the School

نیل اپنی کتاب "مدرسہ میں دل نہ کہ دماغ" (

میں اُن ہی امور اور اُن سے متعلقہ دیگر ضروری امور پر توجہ دلاتا ہے۔ اس کتاب کا مقصد تعلیمی کام کرنے والوں کو تعلیم کے ان گہرے اور بنیادی حقائق کی طرف متوجہ کرنا ہے جن کو ایک عرصہ سے مدرسہ نظر انداز کرتا چلا آرہا ہے۔ اس پر طرّہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ دانستہ طور پر ہوا ہے۔ لوگ ان حقائق کی صداقت کا اعتراف تو کرتے رہے ہیں مگر اتنی جرأت

کسی سے نہ کی کہ ایک مرتبہ ان کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد مدرسہ میں ان کی صحیح جگہ کا تعین کر سکتا۔ آج کل نصاب میں تبدیلی، مضامین میں ردّ و بدل، طریقۂ تعلیم میں تنوّع، تعلیمی معیار میں بلندی، امتحان، ذہنی جانچ، اور نفسیات کا تعلیم میں بڑا زور ہے۔ معلم اور متعلم دونوں صبح سے شام تک اس وادی میں سرگرداں اور اس صحرا میں دشت پیما نظر آتے ہیں۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بچوں کو زندگی میں دوسری چیزوں پر، جو خود زندگی کے لئے محض لکھنے پڑھنے سے کہیں زیادہ اہم اور ضروری ہیں، توجہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ وہ زندگی کی بقیہ ساری مسرّتوں سے محروم رہتے ہیں ننھے دماغ اور معصوم ذہن مضمونوں کے بارے اتنے بوجھل رہتے ہیں کہ ان میں نہ کوئی امنگ باقی رہتی ہے اور نہ اُپج، یہ بوجھ انھیں نہ چابک دست ہونے دیتا ہے اور نہ طرّار، اس لئے زندگی کی دوڑ میں اُن کی رفتار عام طور پر سست ہوتی ہے۔ موجودہ مدرسوں میں جذبات کی ترتیب اور تہذیب کا تو سرے سے کوئی انتظام ہی نہیں جس کے نتیجہ میں متعلمین کی جذباتی زندگی غیر مطمئن رہتی ہے۔ اُن کے کردار پر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس میں توازن قائم نہیں ہوتا۔ مضامین اور امتحان متعلمین کو دماغی نشوونما پر متوجہ رکھتے ہیں، ان کے نت نئے تقاضے انھیں اتنی مہلت نہیں دیتے کہ وہ ان اہم عناصر پر جن سے انسانی شخصیت عبارت ہے کوئی توجہ کر سکیں۔ اس کا بدیہی نتیجہ یہ ہے کہ ذہنی تربیت اور ترقی تو بڑی حد تک ہو جاتی ہے مگر جذبات جہاں کے تہاں رہ جاتے ہیں اور انسان جذبات کے اعتبار سے طفلی کی منزل ہی میں رہتا ہے۔ دنیا کے موجودہ خلفشار کا اس سے کتنا گہرا تعلق ہے یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ سائنس کی ترقی اور جذبات کی نا ترتیبی نے انسانی شخصیت کو میکانکی بنا دیا ہے۔ چنانچہ سائنس اور اس کی ساری ترقیاں اس وقت انسان کے ہاتھ میں بالکل اسی طرح ہیں جیسے کسی ننھے بچے کے ہاتھ میں وہ نرم و نازک کھلونا جو پنڈورا کے بکس کی طرح ساری دنیا کے مصائب و آلام اپنے اندر لئے ہوئے ہو۔

جذبات کی ترتیب کے سلسلے میں جنسی مسئلہ بھی آجاتا ہے۔ اس مسئلہ میں آپ کو نیل سے کتنا ہی اختلاف ہو مگر اس صداقت سے روگردانی نہیں کی جا سکتی کہ ہماری بیشتر شادی شدہ زندگیاں، غیر مسرور اور ناکام رہتی ہیں۔ ان کی تعداد بڑھتی جاتی ہے کم نہیں ہوتی۔ ہمارے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہونے والے اشتہار، مدرسوں کے پاخانوں کی دیواروں پر عبارت نمائی گلی اور کوچوں میں دیواروں پر لکھے ہوئے مخصوص الفاظ اور ہمارے عوام، خصوصاً، مردوں کے گیت، جنسی مسئلہ پر ہمیں متوجہ کرنے کے لئے کافی سامان فراہم کرتے ہیں۔

جذبات کی طرح ہمارے مدرسوں میں لاشعور کی بھی کوئی اہمیت نہیں بلکہ امکان بھر شعور ہی پر زور دیا جاتا ہے اور اسی کی اہمیت جتائی جاتی ہے۔

آج کل مدرسوں میں نفسیات کا عمل دخل زور پکڑتا جارہا ہے، اس کی ابھی ابتدا ہی ہے۔ خود نفسیات اپنی جگہ پر بہت اچھی چیز ہے مگر مدرسے جیسے اجتماعی اداروں میں علم النفس کچھ زیادہ کارآمد ثابت نہیں ہوتا۔ اس کتاب میں آپ کو مصنف کے تجربوں کا پتہ چلے گا۔ اس نے علم النفس کی مدد سے ایک بچے کو درست کرنے کی کوشش کی، بچہ ایک مخصوص مدت میں درست ہوگیا۔ لیکن یہ معلوم کرکے آپ کو حیرت ہوگی کہ اسی عیب میں مبتلا ایک دوسرا بچہ اتنی ہی مدت میں بغیر کسی خاص کوشش کے خود بہ خود ٹھیک ہوگیا مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ نفسیات کوئی مفید علم نہیں اور نہ استاد کو اس علم کی ضرورت ہے۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، ہر اُستاد کو نفسیات سے واقف ہونا چاہئے مگر اس کا غلام نہیں۔

نیل بچوں کے لئے مدرسوں میں آزادی کا حامی ہے، اس نے اپنے مدرسہ میں اس کا تجربہ کیا ہے، اس تجربہ میں وہ کامیاب بھی ہوا ہے اس کے ہاں لکھنے پڑھنے کے معاملہ میں بچوں پر کوئی جبر نہیں، نہ اسباق میں حاضری پر کوئی پابندی ہے، اس پر بھی اس

کا تجربہ شاہد ہے کہ اس کے مدرسہ کے متعلمین لکھنے پڑھنے میں کسی دوسرے تعلیمی ادارے کے بچوں سے کسی حیثیت سے کم نہیں۔ بات سمجھ میں آتی ہے نیل کا مدرسہ اقامتی ہے اور مخلوط بچے اور بچیاں وہاں رہتے بھی ہیں، اگر کسی سبق میں انھیں دلچسپی نہ ہو، یا سبق سے زیادہ دلچسپی وقتی اور موسمی حالات کی بنا پر کسی دوسری چیز میں ہو، وہ سبق میں نہ جائیں، اس سلسلہ میں ان پر کوئی تادیب بھی نہ ہو، تو اس کا لازمی اور فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ طلبہ منتشر کی گتھی سے محفوظ رہیں گے اور جب بھی سبق میں شریک ہوں گے تو یہ شرکت پوری توجہ کے ساتھ ہوگی۔ اس طرح وہ اس ذہنی دوعملی سے بچے رہیں گے جو بچوں کے ذہن میں جبر اور پابندی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور جس کی مدد سے بقول John Dewey بچہ سبق پر اتنی توجہ کرتا ہے جتنی توجہ استاد کو مطمئن کرسکے ورنہ وہ ذہنی طور پر سبق سے غیر حاضر ہوتا ہے۔ اس طرح بچے کی شخصیت میں تضاد اور کردار میں ریاکاری پیدا ہوجاتی ہے۔

لیکن اس بات کو بھولنا نہ چاہئے کہ آزادی اور مطلق العنانی میں فرق ہے، ایک شخصیت کی تشکیل کے لئے جس قدر ضروری اور مفید ہے دوسری اتنی ہی مضر اور نقصان رساں۔ نیل آزادی کے حدود کا تعین اور مطلق العنانی سے متنبہ کرتا ہے۔

مدرسہ میں آزادی کے ساتھ ہی ذہن ضبط کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، ہمارے مدرسوں میں ضبط کا نظریہ قوت، اقتدار اور وقار کی پیداوار ہے جس سے بچے میں ذہنی گھٹیا اور خلل اعصابی پیدا ہوجاتی ہے، کردار میں توازن پیدا کرنے کے لئے ضبط بے حد ضروری ہے مگر ہمارے مدرسوں کا مروجہ ضبط سیرت اور کردار کی تشکیل میں اگر کوئی امداد کرتا ہے تو مضر اور نقصان رساں جو متعلمین کی آئندہ زندگی میں دشواری کا باعث ہوتی ہے۔ ضبط کو خارجی طور پر عائد کرنے کے بجائے اسے اصل میں بچوں کی اجتماعی زندگی کی ضروریات کی پیداوار ہونا چاہئے، اور بچہ کو یہ محسوس ہونا چاہئے کہ وہ اس کی اپنی ضرورتوں میں سے

ایک ضرورت ہے۔ اس کی سب سے اچھی صورت یہی ہے کہ بچوں کو بڑی حد تک مدرسہ کے انتظام میں دخیل کیا جائے، ممکن ہے آپ نیل کے اس خیال سے اتفاق نہ کریں کہ مضامین کے انتخاب میں بچوں کا مشورہ شامل ہونا ضروری ہے لیکن طلبہ کے باہمی قضیوں کے فیصلے کھیل کود کا انتظام اور دیگر مادرار نصاب مشاغل کا اہتمام اگر خود طلبہ کے ذریعہ عمل میں آئے تو آپ ضرور متفق ہو جائیں گے۔ اس طرح طلبہ میں ضبط کا احساس خود بہ خود پیدا ہوگا اور انھیں سیلف گورنمنٹ اور مختاریت کی تربیت کا موقع مل سکے گا جو جمہوریت کے اس دور میں بے حد ضروری ہے۔

اس وقت مدرسہ اور بعد کی زندگی میں کوئی ربط نہیں بلکہ دونوں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے۔ نیل مدرسہ کے نصاب میں ایسی تبدیلی کرنا چاہتا ہے، اور مضامین کی ایسی ترتیب چاہتا ہے کہ یہ فرق دور ہو جائے۔ نیل ہی پر کیا منحصر ہے ہر تعلیمی کام کرنے والا اس بے ربطی کو دور کرنے کا خواہش مند نظر آتا ہے۔ نیل کہتا ہے کہ مدرسہ سے بعض مضامین خارج کر دیے جائیں اور بعض جدید چیزیں جیسے ظرافت، سیاست اور جنسیات جن سے انسان کو ساری زندگی واسطہ رہتا ہے شامل کر دینی چاہئیں وہ بعض ایسی باتوں کو بھی مدرسہ میں رائج کرنا چاہتا ہے جن کی ہماری اشرافی تہذیب متحمل نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس بدلتی ہوئی زندگی میں سب سے پہلے اقدار ہی بدلتے ہیں کل تک جن قدروں کو ہم سینہ سے لگائے ہوئے تھے، آج وہ خود بہ خود ہم سے دور ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

نیل مدرسہ میں معلم و متعلم کے رشتہ کو محبت اور شفقت کی بنیاد پر قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس وادی میں وہ عقل کی راہ نمائی کا قائل نہیں اور نہ نفسیات کا زیادہ مرید ہے۔ اس دیس کے رہنے والوں کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں مگر ہمارے مدرسوں میں اس رشتہ کی بنیاد نہ ہے نہ کبھی ہو گی، آج تو ڈکا لس از سبق ماسٹر سے بل پیش کرنے کو کہتا ہے اب یہ رشتہ بالکل کاروباری ہے۔ ہماری تعلیم کی ناکامی کے جہاں اور وجوہ ہیں ان میں

ایک اور اہم وجہ یہ بھی ہے۔ نیل کو یقین ہے، اور اس یقین کے اس کے پاس وجوہ بھی ہیں کہ برے سے برے بچے کو محبت اور شفقت سے درست کیا جا سکتا ہے۔ وہ چور کو سزا نہیں دیتا۔ آپ شاید یہ سنکر تعجب کریں کہ وہ اُسے انعام دیتا ہے اس کو اُس نے اپنے بچوں پر آزمایا ہے، وہ اس میں کامیاب بھی ہوا ہے۔ نفسیات کا وہ صرف اس حد تک قائل ہے کہ بچوں کو عمر کے مختلف حصوں میں بالیدگی اور نشو و نما کے لئے نفسیاتی ضروریات بہم پہنچائی جائیں۔ وہ بچوں کا دل موہ لینے اور ان کا اعتماد حاصل کرنے کے اصول پر کاربند ہونے کی تلقین کرتا ہے وہ مُعلّم کو متعلّم کے سچے رفیق اور دوست کی حیثیت دیتا ہے، ایسے دوست کی جس سے متعلّم اپنا دکھ درد کہہ سکے یا یوں کہیئے کہ جس سے وہ اپنا کچا چٹھا بیان کر سکے۔ اس لئے کہ جب تک معلّم کو یہ حیثیت حاصل نہ ہو جائے وہ متعلّم کی نہ کوئی مدد کر سکتا ہے اور نہ اس کی راہ نمائی۔

نیل کے نزدیک فطرتِ انسانی خیر ہے، تعلیم کا کام اُس کے خیال میں صرف اس خیر کو شر سے بچانا ہے۔ اس لئے وہ طلبہ کے ساتھ مثبتی Positive ہونے کے بجائے منفی Negative ہونا بہتر سمجھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مُعلّم متعلمین کو اپنی رائے اپنے خیال اور اپنے معتقدات سے متأثر نہ کرے۔ اسے طلبہ کے ساتھ فعالی طریقہ نہ برتنا چاہیئے۔ یہ وہی بات ہے جیسے ذاکر صاحب یوں کہا کرتے ہیں "بچوں پر کوئی ٹھپّہ یا مہر نہ لگانی چاہیئے"۔ نیل استاد کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ بچے سے فرماں برداری اور احترام کی توقع کرے۔ کم سے کم یہ چیز یکطرفہ نہ ہونی چاہیئے۔ اگر استاد یہ توقع رکھتا ہے تو اُسے خود بھی اس کے لئے تیار ہونا چاہیئے بچے استاد کا احترام اور اس کی فرماں برداری کریں اور اُستاد بچوں کی۔

سفارش حسین رضوی

ملیریا کی کہانی

صحت کے جن مسائل سے آج انسان دوچار ہے اُن میں ملیریا کو ایک اہم جگہ حاصل ہے۔ دنیا کی آبادی کا ایک چوتھائی سے زیادہ حصہ اس جاں گسل اور قبیح بیماری میں مبتلا ہوتا ہے۔ تنہا ہمارے ہی ملک میں دس لاکھ نفوس چپ چاپ اس پر بھینٹ چڑھ جاتے ہیں اور یہ تعداد انگلستان کے شہر برمنگھم کی آبادی کے مساوی ہے۔

ملیریا کی تباہ کاریاں کسی دوسری وبائی بیماری سے کم نہیں اپنے مابعد اثرات کے لحاظ سے یہ ہیضہ اور طاعون سے زیادہ مہلک بیماری ہے۔ طاعون تو ایک آندھی کی طرح آتا ہے اور انسانی آبادی سے ایک بڑا خراج وصول کر کے چلا جاتا ہے، اور پھر عرصے تک امن رہتا ہے۔ لیکن ملیریا کی بیماری جانوں کے ایک معتدبہ خراج ہی پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ آبادی کی صحت پر ایسے اثرات چھوڑ جاتی ہے جو عرصہ تک باقی رہتے ہیں اور جن سے دوسری گوناگوں جسمانی اور اعصابی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ جن علاقوں کے معاشی اور معاشرتی حالات بہتر نہیں وہاں تو مصیبتوں کا ایک غیر مختتم سلسلہ شروع ہو جاتا ہے کیونکہ غذا کی کمی، جسمانی کمزوری اور صحت کی عام ادنیٰ سطح لوگوں کو ملیریا کا آسان شکار بنا دیتی ہے۔ ملیریا کے نتیجہ میں اُن کی صحت اس قدر گر جاتی ہے کہ وہ اپنی گزر بسر کے لئے اتنا بھی نہیں کما پاتے جتنا کہ وہ تندرستی کی حالت میں کما لیتے ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ صرف صوبۂ متحدہ میں جس میں ساڑھے چار کروڑ کے قریب لوگ بستے ہیں ایک چوتھائی آبادی دو ماہ کے لئے بے کار ہو جاتی ہے۔

محنت اور کارکردگی کا یہ نقصان ان علاقوں کے لیے تو اور زیادہ مہلک ہے جن کی آبادی نیم فاقہ کشی کی زندگی بسر کرتی ہے۔ جن علاقوں کے معاشرتی حالات بہتر بنا لئے گئے ہیں جیسا کہ انگلستان اور امریکہ، وہاں اس بیماری کا میدانِ عمل بہت تنگ ہو گیا ہے۔

ملیریا عام طور پر گرم مرطوب آب و ہوا کے خطوں کی بیماری ہے، لیکن اس کی گرفت سے معتدل علاقے بھی محفوظ نہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر تک انگلینڈ، اسیکس اور کینٹ کے دلدلی علاقوں میں یہ ایک عام بیماری تھی۔ ہالینڈ کے بعض اضلاع تو ہمیشہ سے ملیریا کا مسکن رہے ہیں۔ جن لوگوں نے اٹلی کی تاریخ پڑھی ہے وہ جانتے ہوں گے کہ متعدد بار اس مرضِ قبیح نے روم کے گرد و نواح کے زرخیز میدانوں کو ویران کر دیا اور لوگ عاجز آکر دوسرے علاقوں میں چلے گئے۔

فوجی تاریخ میں بھی اس بیماری نے خاصا پارٹ ادا کیا ہے۔ ۱۸۰۹ء میں ہالینڈ کے ضلع والچرن کے ملیریائی بخار کا ذکر تو اب بھی کیا جاتا ہے جب پندرہ ہزار برطانوی سپاہ میں سے دس ہزار بہ یک وقت اس میں مبتلا ہوئے تھے اور ۲۵ یا ۳۰ کی تعداد میں روزانہ مر جاتے تھے۔ جنگِ عظیم اوّل (۱۹۱۴ء) میں جس بیماری میں سب سے زیادہ اموات ہوئیں وہ ملیریا ہی تھی۔ میسیڈونیا، مصر، مشرقی افریقہ اور میسوپوٹامیہ میں بے شمار برطانوی فوج ملیریا میں مبتلا ہوئی۔

ملیریا کا سبب ننھے ننھے طفیلی کیڑے (Parasites) ہوتے ہیں۔ یہ کیڑے یا جراثیم خالص نباتی کیڑے (Bacteria) نہیں ہوتے بلکہ Protista سے تعلق رکھتے ہیں۔ "پروٹسٹا" ایسے خوردبینی نباتی اور حیوانی اجسام ہوتے ہیں جن سے ہمارے جسم کے خلیوں (Cells) کی تشکیل ہوتی ہے۔ ملیریا کے جراثیم خاص قسم کے مچھروں کے ذریعہ ایک انسان سے دوسرے انسان میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

ملیریا اور جراثیم | انسانوں میں ملیریا جن جراثیم سے پیدا ہوتا ہے اُن کی اب تک چار انواع (Species) معلوم کی جا چکی ہیں۔ جانوروں کے طفیلی کیڑے انسانی طفیلی کیڑوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک عجیب بات یہ معلوم کی گئی ہے کہ گو انسان اور مچھر کے مقابلہ میں انسان اور بندر ایک دوسرے سے زیادہ قریبی تعلق رکھتے ہیں پھر بھی انسانی ملیریا کا جرثومہ مچھر کے جسم میں تو خوب پھلتا پھولتا ہے لیکن بندر کے خون میں اُس کے لئے نامساعد حالات پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ مر جاتا ہے۔

ملیریا میں بخار دوروں کی شکل میں آتا ہے اور ہر دورہ کئی گھنٹے جاری رہتا ہے۔ اگر دورانِ بخار میں کسی مریض کے خون کا معائنہ کیا جائے تو اکثر خون کے سرخ ذرات پر جراثیم کا قبضہ ملے گا۔ اگر بخار کی ابتدا میں خون کی جانچ کی جائے تو جراثیم خون میں آزادانہ تیرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اس کے بعد پیدائش کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ ہر جرثومہ متعدد بچے دیتا ہے، جو خون کے سرخ ذروں کو پھوڑ پھوڑ کر باہر نکلتے رہتے ہیں۔ ان جراثیم کی سرگرمیوں سے خون میں زہر کی آمیزش شروع ہو جاتی ہے اور پھر یہی زہر حرارت میں تیزی سے اضافہ کا باعث بنتا ہے۔ جب زہر جسم کے دفاعی عمل سے صاف ہو جاتا ہے تو حرارت کم ہو جاتی ہے اور بخار اُتر جاتا ہے لیکن چند ہی گھنٹوں بعد جراثیم کی نئی نسل پیدا ہو جاتی ہے اور تازہ زہر کی آمیزش سے بخار عود کر آتا ہے اور اس طرح ملیریا کے دوروں کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

بخار کے دوروں کے درمیانی وقفوں کی مدت ملیریا کے جراثیم کی نوعیت کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے۔ ہر چوبیس گھنٹے کے بعد یا ہر تیسرے دن جو بخار چڑھتا ہے اُس میں اموات کی شرح عموماً کم رہتی ہے۔ اسی لئے انگریزی میں اسے "مہربان سہ روزہ بخار" (Benign Tertain) کہتے ہیں، بخار کی یہ قسم معمولاً معتدل خطوں میں پائی جاتی ہے لیکن "خبیث سہ روزہ بخار" (Malignant Tertain) میں شرحِ اموات بہت بڑھ جاتی ہے کیونکہ اس میں خون کے مردہ ذرات باہم مدغم ہو کر خون کی چھوٹی چھوٹی وریدوں کو بند

کردیتے ہیں۔ علاوہ ازیں چہار روزہ Quartain اور روزانہ Quotidian بخار بھی ہوتے ہیں۔ اور بخار کی وہ قسم بھی ہوتی ہے جس میں حرارت ہر وقت رہتی ہے۔ بخار کی مدوجزر کی کیفیت کا تعلق نئے جراثیم کی پیدائش، زہر کی صفائی اور سرخ ذرات کے ٹھہر ٹھہر کر پھٹنے سے ہوتا ہے۔ اگر جراثیم کی نئی پیدائش بغیر کسی رکاوٹ کے برابر جاری رہے تو ہونا تو یہ چاہیئے کہ مریض کے خون کے صحت بخش ذرات بہت جلد ختم ہو جائیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا کیونکہ جراثیم میں فنا پذیری بہت زیادہ ہوتی ہے اور ان میں سے نصف کے قریب پیدا ہوتے ہی اپنی موت آپ مر جاتے ہیں۔

خون میں جرثوں اور محافظ خلیوں کی جنگ

ملیریائی بخار کے دوران میں جگر اور طحال کا کام بہت بڑھ جاتا ہے۔ ان کے محافظ خلیے (Phagocytic Cells) تصفیۂ خون کا فرض انجام دیتے ہیں اور خون کے مردہ اور زہر آلودہ ذرات کو اپنے اندر جمع کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملیریا میں جگر اور طحال کی جسامت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اگر جراثیم کی پیدائش کی رفتار ان کے تصفیہ اور بربادی کی رفتار سے تیز ہے تو مریض کی حالت ابتر ہو جائے گی اور وہ مر سکتا ہے۔ لیکن اگر محافظ خلیے جراثیم کو برباد کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں تو مریض جلد ہی روبہ صحت ہو جائے گا۔

محافظ دفاعی خلیے اپنے کو مدافعت کے لئے بہت آہستہ آہستہ منظم کرتے ہیں۔ غالباً وہ جوابی حملے سے قبل حملہ آور جراثیم کی نوعیت سے واقف ہونے کی کوشش کرتے ہیں، گویا ماہرین جنگ کی طرح ان کا بھی یہ خیال ہے کہ دشمن کے ساز و سامان، اس کی طاقت اور قابلیت کو جانے بغیر حملہ کر دینا اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہے جس کا انجام معلوم۔ اس "فوجی تفتیش" کے دوران میں محافظ خلیوں میں ایک قسم کی حس پیدا ہو جاتی ہے اور جبتک یہ حس باقی رہتی ہے جسم کی دفاعی قوت بھی باقی رہتی ہے۔ لیکن جوں ہی یہ خلیے خون کو جراثیم سے پاک کر لیتے ہیں ان کی حس جاتی رہتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جسم کی دفاعی قوت

(Immunity) ہر صورت میں قابلِ اعتبار نہیں اور اس وقت تک تو اور زیادہ نہیں جب کہ مریض عموماً بیمار اور کمزور رہتا ہو۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انسان کی دفاعی قوت بہ یک وقت متعدد قسم کے جراثیم سے جنگ نہیں کر سکتی۔ اور اگر اس دوران میں کہ وہ اپنے کو کسی خاص قسم کے جراثیم کے لئے تیار کر رہی ہے کسی دوسری نوع کے جراثیم حملہ آور ہو جائیں تو پھر وہ کمزور پڑ جاتی ہے اور مریض ملیریا میں مبتلا ہو سکتا ہے۔

جب کوئی مچھر ملیریا کے مریض کا خون چوستا ہے تو سوائے معدودے چند کے، خون کے خلیے اور اکثر جراثیم اس کے پیٹ میں ہضم ہو جاتے ہیں۔ یہ ہضم ہو جانے والے جراثیم Schizonts کہلاتے ہیں۔ یہ جراثیم اگر انسان کے خون میں رہنے دیے جاتے تو ان کی تعداد میں بڑا اضافہ ہو جاتا اور ان کے بچے خون کے سرخ ذرات پر قبضہ جما بیٹھتے۔ وہ جراثیم جن کو مچھر ہضم نہیں کرتا Gametocytes یا "مزاحم جراثیم" کہلاتے ہیں۔ یہ اپنے طرزِ عمل میں Schizonts جراثیم سے مختلف ہوتے ہیں یعنی اگر ان کو انسان کے خون ہی میں رہنے دیا جاتا تو ان کی تعداد میں مزید اضافہ نہ ہوتا۔ یہاں یہ دلچسپ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ مزاحم جراثیم، Schizonts جراثیم ہی کی اولاد میں سے ہیں۔ لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، خود انسانوں میں یہ بوالعجبی اور نیرنگی پائی جاتی ہے کہ باپ کا طرزِ عمل بیٹے سے اور بیٹے کا طرزِ عمل باپ سے مختلف ہوتا ہے۔

<u>جراثیم مچھر کے پیٹ میں</u> | مزاحم جراثیم میں کچھ جرثومے مادہ ہوتے ہیں اور کچھ نر۔ مشاہدہ سے معلوم کیا گیا ہے کہ مزاحم نر جرثومہ (Male gametocyte) میں ایک قسم کا تولیدی سلسلۂ عمل واقع ہوتا ہے جسے Exflagellation کہتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ مزاحم نر جرثومہ آپ ہی آپ پھٹ پڑتا ہے اور اس میں سے چھوٹے چھوٹے لانبے لانبے، اجسام نکلتے ہیں جو پیچ و تاب کھانے لگتے ہیں۔ ان میں سے ایک بطور تولیدی مادہ کے ایک انڈے سے مخلوط ہو جاتا ہے جسے مزاحم نر جرثومہ کی مادہ دیتی ہے۔ حاملہ انڈا ایک بہت ہی

متحرک خلیہ کے قسم کی چیز ہوتا ہے جو پیٹ کی جلد میں نفوذ کرکے بس جاتا ہے اور وہاں بطور ایک طفیلی جرثومہ کے اپنی معینہ مدت گزارتا ہے۔ اس کے بعد اس کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہوجاتا ہے اور اس اضافہ سے وہ جگہ جہاں وہ پناہ گزیں ہے ایک ننھے ننھے بلبلے کی طرح پھولنا شروع ہوجاتی ہے حتی کہ وہ ایک خاص حد پر جاکر پھٹ جاتی ہے اور بیشمار نئے جراثیم (Sporozoites) مچھر کے خون میں مل جاتے ہیں۔ اور اس طرح مچھر میں آئندہ کی نیش زنی اور انتقالِ ملیریا کے لئے ایک تباہ کن ذخیرہ جمع ہوجاتا ہے۔ لیکن مچھر کے اندر جراثیم کی یہ پیدائش صرف اونچے درجۂ حرارت ہی کی صورت میں ممکن ہے۔ ورنہ حاملہ مزاحم جرثومہ جامد اور ضائع ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملیریا گرم مرطوب اور نیم گرم مرطوب علاقوں کی بیماری سمجھی جاتی ہے۔ جب ایک حاملِ جراثیم مچھر کسی انسان کو کاٹتا ہے تو زخم میں ہزاروں چھوٹے چھوٹے جرثومے منتقل ہوجاتے ہیں یہ جرثومے ایک دم خون میں پہنچ کر سرخ ذرات پر قبضہ نہیں کرلیتے بلکہ دافع جراثیم نظام Reticullo-endothelial System کے خلیوں میں پہنچ کر زندہ رہتے ہیں اور اپنی تعداد میں اضافہ کی کوشش کرتے ہیں۔ لہٰذا دافعِ جراثیم خلیے نہ صرف یہ کہ جراثیم کش ہوتے ہیں بلکہ پہلے پہلے جب جراثیم جسم میں داخل ہوتے ہیں تو ان کی پرورش گاہ کا کام بھی انجام دیتے ہیں۔

ملیریا کی بیماری اپنے ردِ عمل کے لحاظ سے دوسرے متعدی امراض سے (جیسے کہ چیچک ہے) مختلف ہوتی ہے۔ چیچک کے جراثیم خون میں کیمیائی تبدیلیاں پیدا کردیتے ہیں جو خود ان کی ہلاکت کا باعث ہوجاتا ہے۔ اب تک یہ بات طے شدہ نہیں ہے کہ ملیریا کی وجہ سے خون میں جوابی اجسام[1] (Antibodies) پیدا ہوتے

---

[1] جوابی اجسام Antibodies خون کے وہ ننھے ننھے ذرے جو جسم میں بعض خاص بیماریوں کے جراثیم کے داخل ہونے پر پیدا ہوتے ہیں اور دافعِ مضرت ہوتے ہیں۔

ہیں یا نہیں ۔ اگرچہ یہ فرض کرلیا جائے کہ وہ پیدا ہوتے ہیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ اتنے طاقت ور نہیں ہوتے کہ مرض کو قابو میں رکھ سکیں ۔ اسی لئے ملیریا کا علاج ٹیکہ لگاکر نہیں کیا جاتا البتہ کونین یا دوسری دواؤں کے انجکشن ضرور دئے جاتے ہیں ۔ لیکن کونین ملیریا کا کافی اور شافی علاج نہیں ۔ یہ مانع مرض ہے لیکن مرض کا استیصال اس کے بس کی بات نہیں ۔ یہ اُسی وقت تک کارآمد رہتی ہے جب تک آپ اسے مسلسل استعمال کرتے رہیں جوں ہی آپ نے بے توجہی برتی بیماری دوبارہ پیر تسمہ پا کی طرح آپ کی گردن پر سوار ہو جائے گی ۔ جنگ حبشہ وہ پہلی نوآبادیاتی جنگ سمجھی جاتی ہے جس میں ملیریا سے اموات بہت کم ہوئیں کیونکہ اطالوی فوج کے افسران نے فوجیوں کو کونین استعمال کرنے کی ترغیب دلانے میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا تھا ۔ حد یہ ہے کہ فوجیوں کا پیشاب بھی یہ معلوم کرنے کے لئے جانچا جاتا کہ انھوں نے کونین استعمال کی ہے یا نہیں ۔

کونین | کونین نہ صرف یہ کہ ایک قیمتی دوا ہے بلکہ اس کی رسد بھی بہت کم ہے ۔ یہ علاقہ پیرو (جنوبی امریکہ) کے سنکونا نامی درختوں کی چھال سے بنائی جاتی ہے ۔ یورپ میں اس کا تعارف اہلِ اسپین نے سترھویں صدی میں کرایا ۔ اور اب تو یہ اپنے وطنِ مالوف سے باہر ہندوستان، سیلون اور جاوا وغیرہ میں خوب نکالی جاتی ہے ۔ ساری دنیا کی کونین کی پیداوار کا ۹۰ فیصدی حصّہ صرف انڈونیشیا اور اس کے آس پاس کے جزائر میں پیدا کیا جاتا ہے ۔ لیکن کونین کے لئے دنیا کی طلب اس کی رسد سے کہیں زیادہ ہے ۔ کونین کے باغات کے مالک ضرورت سے زیادہ قیمتیں لیتے ہیں ۔ ملیریا کے موسم اور وبائی اوقات میں تو کونین ایک بیش بہا چیز بن جاتی ہے ۔ جنگ عظیم ثانی میں لوگوں نے اس کی ذخیرہ اندوزی سے خوب منافع کمائے ۔ کونین کے اس قلت رسد کے پیش نظر

سائنس دانوں نے اس کا کیمیائی بدل دریافت کرنے کی کوششیں شروع کردیں اور بڑی کدوکاوش اور تجربوں کے بعد وہ ایسی ادویہ جاننے میں کامیاب ہو گئے جن کو مصنوعی کونین کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کیمیائی بدل بھی خاصے گراں قیمت ہوتے ہیں اور عام آدمی اِن سے فیض یاب نہیں ہو سکتے۔ سب سے اچھی اور مکمل ملیریا کش دوا وُہ ہوگی جو مریض کو نقصان پہنچائے بغیر ملیریا کے جراثیم کو اُس کی پرورش کی ہر منزل پر ختم کر سکے۔ اور فی الحال ہماری تیار کردہ دواؤں میں سے کوئی بھی اس کسوٹی پر پوری نہیں اُترتی۔

ملیریا شعبہ طب میں ایک عجیب وغریب حیثیت کی حامل ہے یعنی یہ بیماری ہوتے ہوئے ایک دوسری بیماری کا علاج کرتی ہے، خاص طور پر اس جنون کا جو آتشک کی آخری منزل پر پیدا ہوتا ہے، چنانچہ انگلستان میں اس قسم کی ایک لیبارٹری قائم ہے جس میں جراثیم اور مچھروں کی باقاعدہ نسل کشی کی جاتی ہے۔

انسان پر ملیریا کے جراثیم کے اثرات کے متعلق اوپر بتلایا جا چکا ہے۔ اب آیئے دیکھیں کہ خود مچھر پر ان جراثیم کا کیا اثر ہوتا ہے۔ انگلستان کے شعبۂ صحت عامہ کی لیبارٹری کے نتائج بتلاتے ہیں کہ اگر مچھروں میں ملیریا کے جراثیم داخل کردئے جائیں اور اُن کو اُن کے قدرتی صحت مند ماحول میں رکھا جائے تو اُن کی مدّت عمر کم نہیں ہوتی۔

دوسرے تجربوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ملیریا کے جراثیم دوسرے نحیف اور کمزور کیڑوں میں داخل کئے جائیں تو مضرت رساں نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ملیریا کے مچھر پسوؤں سے زیادہ خوش قسمت ہیں جو طاعون کے جراثیم منتقل کرتے ہیں۔ جب پسوؤں کا معدہ جراثیم کی کثرت سے خوب بھر جاتا ہے تو پھر ان کے معدہ میں گنجائش نہیں رہتی کہ وہ مزید خون چوس سکیں اور وہ بیچارے پیاس کی شدت سے مر جاتے ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم مچھروں کو مارنے اور ملیریا پر قابو پانے کے مختلف طریقوں سے بحث کریں جراثیم کی زندگی کے متعلق ایک نکتہ واضح کر دینا ضروری ہے۔ ملیریا کے طفیلی جرثومہ کی زندگی کا چکر اتنا سادہ نہیں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اس میں دوسری پیچیدگیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ ملیریا کے انسانی جراثیم دوسرے جانوروں میں تو بالکل زندہ نہیں رہتے لیکن خود انسان میں اُن کی فنا پذیری کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے بشرطیکہ صاحب کہ مریض میں دفاعی قوت موجود ہو یا وہ کونین وغیرہ استعمال کر رہا ہو۔ چنانچہ جراثیم جلد مر جاتے ہیں اور جو باقی بھی رہتے ہیں ان میں اتنی سکت نہیں ہوتی کہ اپنی نسل کو بڑھا سکیں تاوقتیکہ صحیح قسم کا مچھر دوبارہ اس شخص کو صحیح وقت "پر" نہ کاٹے۔ صحیح قسم کا وہ مچھر ہوتا ہے جس کے خون میں مزاحم جرثوموں gametocytes کی نئی نسل سِن بلوغ کو پہنچ چکی ہو اور وہ انسانی خون میں منتقل ہونے اور اُسے تباہ کرنے کی پوری صلاحیتوں سے متصف ہو۔ اب سوال ہو سکتا ہے کہ "صحیح قسم کے مچھر" سے کیا مراد ہے۔ اب تک ہزار سے زائد مچھروں کی قسمیں معلوم ہو چکی ہیں۔ ان میں سے صرف چند خاص انواع ہی کے مچھر انسانی ملیریا سے متاثر (Infected) ہو سکتے ہیں۔ "ایڈیس" نوع کے مچھر کو جو زرد بخار کے جراثیم کا حامل ہوتا ہے، انسانی ملیریا کے جراثیم سے متاثر کرنے کی ساری کوششیں ناکام رہی ہیں۔ لہٰذا اکثر "غلط نوع" کے مچھر میں پہنچ جانے کے بعد طفیلی جراثیم ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اور اگر وہ صحیح نوع کے جسم میں بھی پہنچ جائیں تب بھی انھیں بڑے نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مچھروں کی عادات | ملیریا کے جراثیم کے حامل کی حیثیت سے مچھروں کی صرف ۲۵ انواع اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کی اس خاص حیثیت کا انحصار اُن کی عادات پر ہوتا ہے بعض مچھر انسان کے مقابلہ میں جانوروں کے خون کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ اسی لئے بعض ماہرین کی طرف سے مچھر دانی لگانے کی بجائے چارپائی کے پاس جانور باندھنے

کی تجویز پیش کی جاتی ہے۔ لیکن بعض مچھروں کی قوت تمیزی زیادہ ہوتی ہے اور وہ جانوروں کی موجودگی کے باوجود انسانوں کو کاٹنے سے باز نہیں آتے۔ ان میں سے سب سے زیادہ خطرناک تو وہ گھریلو مچھر ہوتے ہیں جو دن بھر تو کونے کھدروں میں چھپے رہتے ہیں اور رات میں ہوشیار قزاقوں کی طرح شبخون مارتے ہیں۔

شمالی یورپ میں ملیریا کے جراثیم کے حامل (Vector) کی چھ قسمیں پائی جاتی ہیں جن میں سے تین تازہ اور صاف پانی میں انڈے دیتی ہیں اور انسان کے مقابلہ میں جانوروں کو ترجیح دیتی ہیں اور دوسرے تین گندے پانی میں انڈے دیتی ہیں اور انسان اور حیوان میں کوئی تمیز نہیں کرتیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مچھروں کی وبائی خصوصیت اُن کے ماحول اور ان کی عادات سے متعلق ہوتی ہے میسیا Messed اور ٹیپکس Typmeen نامی دو مچھر یورپ کے اکثر علاقوں ہی سے بے ضرر ثابت ہوئے ہیں لیکن والگا کی وادی میں یہ خطرناک قسم کے حامل مرض بن جاتے ہیں کیونکہ والگا کی وادی میں جانوروں کی کمی ہے اور وہ انسانوں کو کاٹنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ملیریا سے بچاؤ کے طریقے | ملیریا کے معنی بُرنساد ہوا کے ہیں جو عموماً دلدلی اور مرطوب علاقوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ ملیریا کا مچھر پانی میں انڈے دیتا ہے اور اُس کی مختصر سی زندگی کے اور بھی لمحے آبی ماحول ہی میں گزرتے ہیں۔ اسی لئے خشکی کی بہ نسبت پانی میں مچھروں کا استیصال زیادہ آسان ہے۔ کیونکہ پانی میں وہ لاروں کی شکل میں ہوتے ہیں اور خشکی میں پردار بن جاتے ہیں۔ پانی کو خاص قسم کے کیمیائی تیل یا تانبے کے ترشئی سفوف (پیرس گرین) کے ذریعہ زہریلا بنایا جا سکتا ہے اور اس طرح مچھروں کی نئی نسل نیست و نابود کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ مچھروں کے لاروں کو ختم کرنے کے لئے اُن کے قدرتی دشمن مچھلیوں اور بطخوں سے بھی کام لیا جا سکتا ہے اس سلسلہ میں گپی (Gappy) نامی ایک مچھلی جو صرف ایک انچ لانبی

ہوتی ہے بہت کارآمد ثابت ہوئی ہے۔ بعض کرم خور آبی پودے بھی مچھر کے لاروؤں کو بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔

لیکن مچھر اپنے بچوں کی حفاظت کے معاملہ میں بہت محتاط ہوتے ہیں اس لئے محض سمیات اور کرم خور جانوروں یا پودوں سے کام نہیں چل سکتا۔ مچھروں کو مارنے کے دوسرے طریقوں میں مسٹر واٹسن کے طریقے کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اس طریقہ میں حاملین مرض مچھروں کی نسل افزائی کے موافق حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد اُن کو ناموافق حالات مُہیّا کردئے جاتے ہیں۔ مثلاً جہاں وہ کھلے ہوئے شفّاف پانی میں انڈے دیتے ہیں وہاں پردے کے طور پر جھاڑیاں لگائی جاسکتی ہیں۔ جہاں وہ سایہ میں انڈے دیتے ہیں وہاں سے جھاڑیوں اور آبی نباتات کو صاف کیا جا سکتا ہے۔ مچھر کی اس نسل کے خلاف جو صاف پانی میں انڈے دیتی ہے کٹی ہوئی گھاس ڈال کر مواقع پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ اگر کسی نوع کے مچھروں کو اتھلا اور ٹھہرا ہوا پانی اپنی نسل افزائی کے لئے موافق آتا ہے تو وہاں سے دلدلوں کو صاف کیا جا سکتا ہے اور جھیل اور تالابوں کے کناروں کو پختہ بنا دیا جا سکتا ہے۔ جہاں وہ پہاڑی علاقوں میں تیز رَو پانی کے شائق ہیں وہاں چھوٹے چھوٹے بندھ بنائے جا سکتے ہیں جن کی وجہ سے کبھی پانی کی تہ بالکل خشک ہوجائے گی اور کبھی پانی اتنی تیزی سے کھولا جا سکے گا کہ سارے لاروے اُس کے ساتھ بہ جائیں۔ ہالینڈ میں جہاں ملیریا کا مچھر گندے اور دلدلی پانی میں انڈے دیتا ہے وہاں زمین پاٹنے اور سمندر پر پشتے لگانے سے ملیریا بہت کم ہوگیا ہے۔

جیسا کہ ہم معلوم کرچکے ہیں کہ ملیریا کے مچھروں سے کسی خاص علاقہ کو نجات دلانے کے لئے وہاں کے حاملِ مرض مچھر کی نسل افزائی کی عادات اور اُس کے خاص ماحول کا علم ہمارے لئے بڑا مفید ثابت ہوتا ہے۔ لیکن یہی علم بعض صورتوں میں گمراہ

کمی بھی ہو سکتا ہے، خصوصاً جب کہ اُس علاقہ کے حالات بدل گئے ہوں، جنگلوں کو کاٹ دیا گیا ہو اور زراعت ہونے لگی ہو یا زرعی اور فصلی طریقے بدل دیے گئے ہوں یا جہاں نئے انجینیرنگ پراجکٹس شروع کر دیے گئے ہوں۔ اس صورت میں اس کا امکان ہو سکتا ہے کہ نیا ماحول اور بدلے ہوئے حالات مچھروں کو پہلے سے کہیں زیادہ راس آئیں۔

انسان کی کوششوں کے علاوہ بعض فطری ذرائع سے بھی ملیریا میں کمی یا زیادتی ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً موسم ہی کو لیجئے۔ بعض علاقوں میں کثرتِ بارش یا سیلاب کی وجہ سے مچھروں کی کمین گاہوں کی تعداد بہت بڑھ جاتی ہے یا کبھی خشک سالی کی وجہ سے چشمے اور جھیلیں چھوٹے چھوٹے اُتھلے تالابوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور مچھروں کو اپنی آبادی میں اضافہ کے لئے مناسب ماحول مل جاتا ہے۔ سیلون میں ۱۹۳۵ء کی بڑی وبا کا اصلی سبب امساکِ باراں تھا۔ جس کے نتیجہ میں فصلیں خراب ہوئیں۔ خراب فصلوں نے غذا کی کمی، قحط اور افلاس کو عام کر دیا اور لوگ ملیریا کا آسان شکار بننے لگے۔

ملیریا کے جرثومہ، مچھر اور آدمی کا باہمی رشتہ بہت پیچیدہ ہے اور اس کا گہرا اور غائر مشاہدہ اس علم کی دوسری شاخوں کی سمت ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اس لئے ملیریا پر کامیابی کے ساتھ قابو پانے کے لئے مختلف علوم کے ماہرین کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹروں اور نرسوں کے پہلو بہ پہلو ماہرین عمرانیات اور موسمیات بھی خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ کیمسٹ ایسی دوائیں تیار کر سکتے ہیں جو جراثیم کش ہوں۔ ماہرینِ حیاتیات جراثیم پذیر مچھروں کی شناخت میں مدد دے سکتے ہیں اور اُن کی عادات کا پتہ لگا سکتے ہیں تاکہ انجینیر اُن کی تحقیقات سے فائدہ اٹھا کر مچھروں کی پیدائش کے مقامات کو اُن کے لئے غیر موزوں بنا دیں۔

آج سے نصف صدی پیشتر یہ بات دریافت ہوئی تھی کہ ملیریا کی بیماری اور مچھروں

میں ایک رشتہ ہے ۔ اس پچاس سال کے اندر ہم اپنی سائنٹفک ترقیوں کے نتیجہ میں ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں کی صحت کو بہتر بنانے کے ذرائع معلوم کر چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں دو حالیہ ایجادیں سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں، ایک مصنوعی کونین جو امریکہ میں بنائی گئی ہے اور دوسرا ڈی، ڈی، ٹی" (D.D.T.) نامی وہ کیمیائی مرکب جو لاروؤں اور مچھروں دونوں کے لئے مہلک ثابت ہوا ہے ۔ اگر ساری دنیا کے اعداد شمار کو سامنے رکھا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہنوز ملیریا کی تباہ کاریاں جاری ہیں اب بھی ہندوستان میں برسات کا موسم ملیریائی مچھروں کی فوجوں اور جراثیم کی فراوانی کے ساتھ غریب ہندوستانیوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتا ہے ۔ پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بچاؤ کی نئی نئی تدبیروں سے متعدد ملیریائی علاقوں کے حالات اب پہلے کی بہ نسبت بہت بہتر ہو گئے ہیں اور اگر ہم نے اپنے نیک ارادوں کے ساتھ ساتھ سائنس اور علم، محنت اور مہارت صبر و استقلال سے کام لیا تو ہمیں پوری امید ہے کہ ہم بہت جلد اس موذی مرض کو انسانی بستی سے ہمیشہ کے لئے جلا وطن کر دیں گے ۔

منہاج محمد خاں :

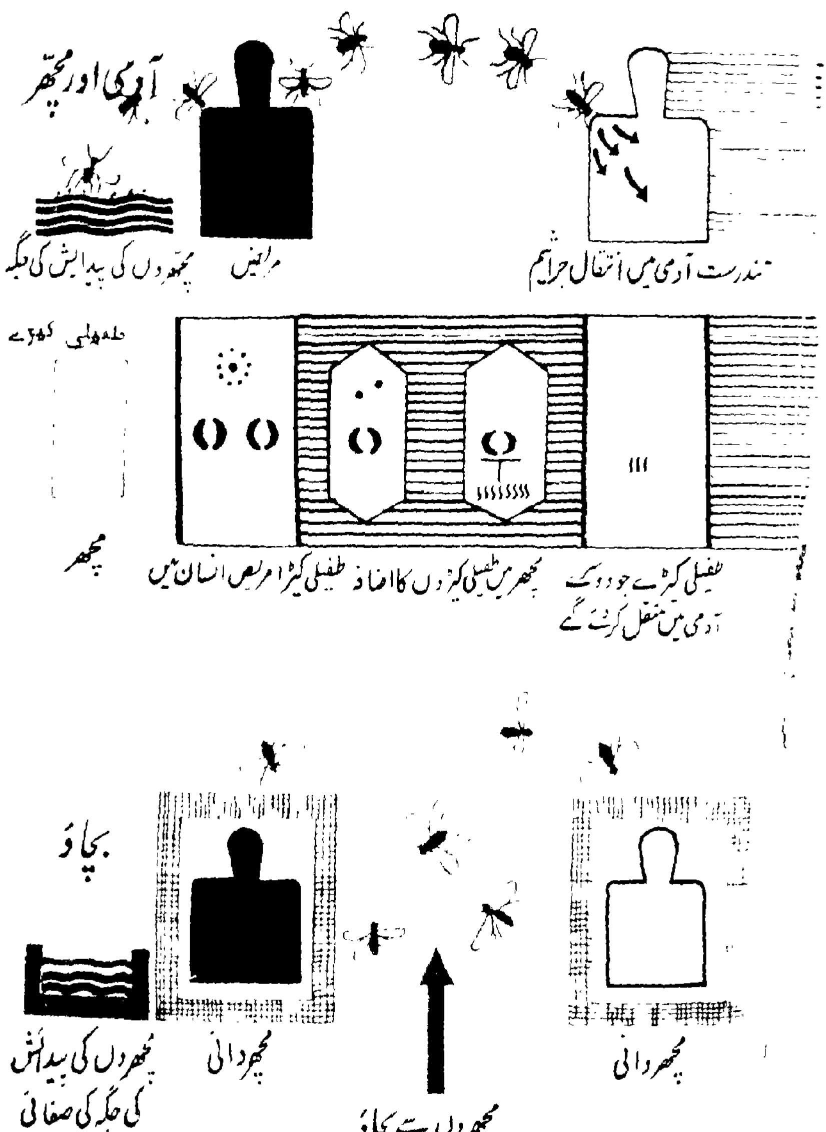
نقشوں کی تشریح (نقشہ نمبر ۱)

(۱) آدمی اور مچھر:- ایک آدمی سے دوسرے آدمی میں ملیریائی جراثیم کا انتقال مچھروں کے ذریعہ عمل میں آتا ہے جو اپنے انڈے بچے پانی میں دیتے ہیں۔

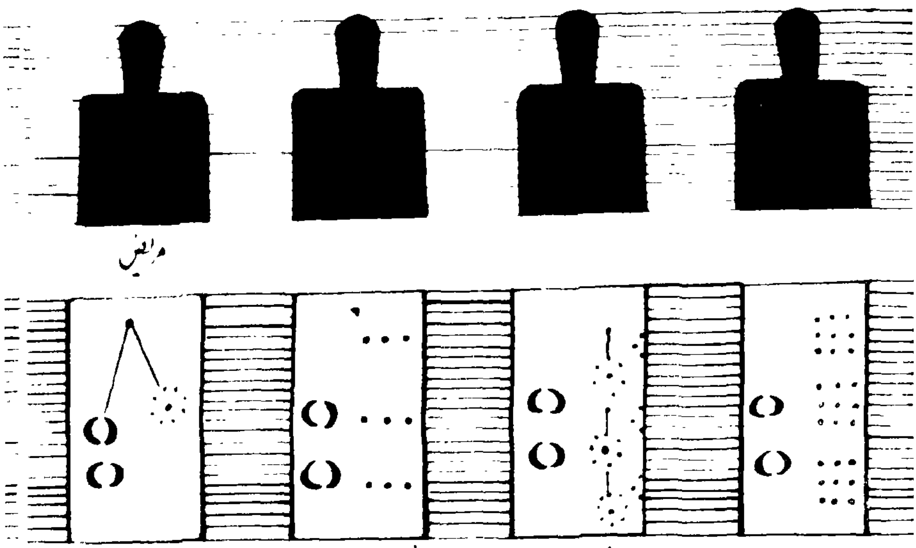
(۲) ملیریائی طفیلی کیڑے:- ملیریائی جراثیم آدمی اور مچھر کے جسم میں متعدد پیچیدہ تبدیلیوں سے گذرتے ہیں۔ جب ایک مچھر کسی ملیریا کے بیمار سے خون چوستا ہے تو وہ اپنے ساتھ دو قسم کے ملیریائی جراثیم لے جاتا ہے۔ (الف) مچھر کے پیٹ میں ہضم ہو جانے والے یعنی Schizonts (ب) اور وہ جو چند تبدیلیوں کے ساتھ مچھر کے پیٹ میں زندہ رہتے ہیں یعنی Gametocytes اور جو بعد میں طفیلی جرثوموں کی تیسری شکل یعنی Sporozites کو پیدا کرتے ہیں۔ جب یہ تیسری شکل کے جراثیم مچھر کے ذریعہ آدمی کے خون میں منتقل ہو جاتے ہیں تو پھر ان سے دوبارہ Schizonts برآمد ہوتے ہیں اور ان کی نسل افزائی سے مزید Schizonts اور Gametocytes (مزاحم جراثیم) پیدا ہوتے ہیں Schizonts کی نسلیں دوبارہ Schizonts ہی کو پیدا کرتی ہیں لیکن مزاحم جراثیم Gametocytes انسان کے خون میں بے حس پڑے رہتے ہیں ان میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ البتہ مچھر کے پیٹ میں پہنچکر ان کو نئی زندگی ملتی ہے اور وہاں وہ دوبارہ Sporozoites پیدا کرتے ہیں۔

(۳) بچاؤ:- مچھروں کی آبادی اُن کی پیدائش کے مقامات کی صفائی اور نگرانی سے کم ہو سکتی ہے۔ اور انسان مچھروں سے بچنے کے لئے مچھردانی کا استعمال کر سکتے ہیں۔ ملیریا کے بیماروں کا علاج کونین اور دوسری جراثیم کش دواؤں سے کیا جا سکتا ہے۔

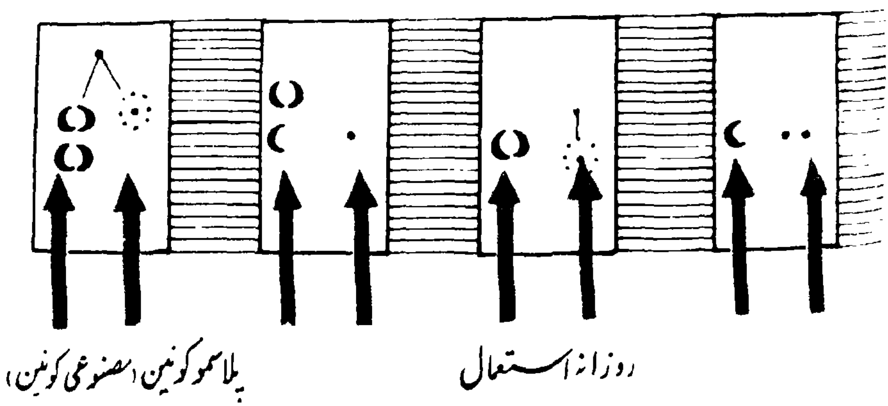
(نقشہ نمبر ۱)


آدمی اور مچھر
مچھروں کی پیدائش کی جگہ
مریض
تندرست آدمی میں انتقال جراثیم
طفیلی کیڑے
مچھر
مچھر میں طفیلی کیڑوں کا اضافہ
طفیلی کیڑا مریض انسان میں
طفیلی کیڑے جو دوسرے
آدمی میں منتقل کرتے گے
بچاؤ
مچھروں کی پیدائش
کی جگہ کی صفائی
مچھردانی
مچھروں سے بچاؤ
مچھردانی

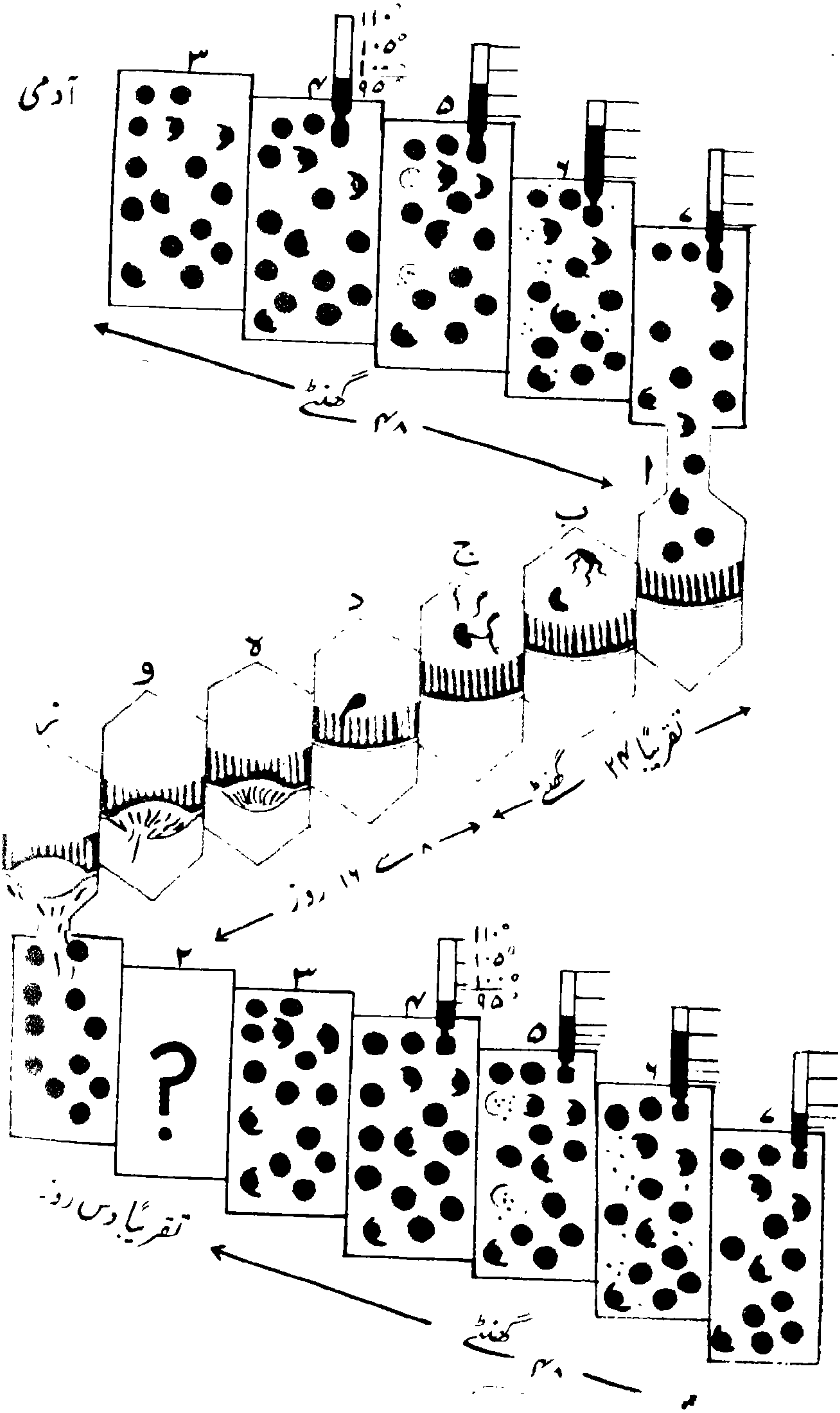
ملیریا کی کہا



انسانی جسم میں طفیلیوں کی نسل میں اضافہ



آدمی اور مچھر میں طفیلی کیڑوں کی زندگی (نقشہ نمبر ۲)



(نقشہ نمبر ۲)

آدمی اور مچھر کے جسم میں طفیلی کیڑوں کی زندگی

آدمی | ۳ ــــ انسان کے خون میں صحت بخش سرخ ذرّات کو دکھایا گیا ہے جن میں سے دو کے اندر Schizonts جراثیم کا قبضہ اور چار پر مزاحم جراثیم Gametocytes کا۔

۴ ــــ Schizonts جراثیم کی تعداد میں خون کے سرخ ذرات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

۵، ۶ ــــ خون کے سرخ ذرّات پھٹ جاتے ہیں اور ان سے Schizonts جراثیم کے بچّے اور سمیات برآمد ہوتے ہیں اور خون میں مل جاتے ہیں۔ نتیجتاً حرارت بڑھ جاتی ہے

۷ ــــ Schizonts جراثیم کے نوزائدہ بچّے خون کے نئے سرخ ذرّات میں داخل ہو جاتے ہیں۔ بخار اتر جاتا ہے کیونکہ خون کے اور جگر اور طحال کے محافظ خلیوں نے زہر کو صاف کر دیا ہے۔

اس تمام عرصہ میں مزاحم جراثیم Gametocytes بے حس اور بیکار پڑے رہے ہیں۔

مچھر | (الف) ملیریا کے مریض کا خون مچھر کے پیٹ میں پہنچ گیا ہے۔

(ب) Schizonts جراثیم اور دوسرے خالی اور مردہ خون کے جراثیم برباد ہو جاتے ہیں۔ نر مزاحم جرثومہ میں اضافۂ نسل کے عمل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

(ج) انڈا حاملہ ہو جاتا ہے۔

(د) حاملہ انڈا پیٹ کی جلد میں نفوذ کر جاتا ہے۔

(ہ) انڈے سے ایک چھوٹے سے جلدی بلبلے کے اندر تعدد جراثیم شروع ہوتا ہے جس سے جلدی بلبلے کا حجم بڑھتا رہتا ہے حتیٰ کے وہ پھوٹ جاتا ہے۔

(و) اس سے جرثومہ کی تیسری شکل کے بے شمار جراثیم برآمد ہوتے ہیں جو مچھر کے لعاب دار غدود میں پہنچ جاتے ہیں۔

(ز) اور وہاں دوسرے آدمی کے خون میں منتقل ہونے کے لئے منتظر رہتے ہیں۔

آدمی — (۲) ہمیں ٹھیک ٹھیک اس کا علم نہیں کہ جب مچھر سے دوسرے انسان میں جراثیم Sporozoite منتقل ہوتے ہیں تو ان پر کیا گذرتی ہے البتہ کچھ عرصہ کے بعد خون میں ان کے ذریعہ Schizonts اور gametocytes ظاہر ہوتے ہیں۔

منہاج محمد خاں

تبصرے

سفرنامۂ مخلص (فارسی): سلسلۂ مطبوعات کتاب خانہ ریاست رامپور۔ نمبر۷۔

رائے رایان آنند رام مخلص عہد محمد شاہی کے ایک نامور منشی اور شاعر تھے جو عہد مغلیہ کے فارسی ادب میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔

یہ مختصر سفرنامہ ان کی ایک سرسری تحریر ہے جس میں محمد شاہ کے حملۂ بن گڈھ کا ذکر ہے۔ لڑائی تو محض جنگ زرگری تھی یعنی نواب وزیرزادہ صفدر جنگ کے اکسانے سے محمد شاہ نے روہیلوں کی ریاست پر حملہ کیا لیکن نواب قمر الدین خاں وزیر اعظم نے جو صفدر جنگ کے مخالف تھے، نواب علی محمد خاں کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ بادشاہ کے حضور میں حاضر ہو کر اپنے فرضی قصور کی معافی مانگ لیں اور اس طرح معاملہ رفع دفع ہو گیا لیکن اس مہم سے یہ فائدہ ہوا کہ مخلص کو جو شاہی لشکر کے ساتھ تھے ایک دلچسپ روزنامچہ لکھنے کا موقع مل گیا جس سے اس عہد کی تہذیب و معاشرت خصوصاً دیہات کی زندگی، شاہی دربار کی حالت اور اُمرا کی سازشوں پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ جناب ڈاکٹر اظہر علی صاحب نے کتاب کی تصحیح و تحشیہ میں بڑا اہتمام کیا ہے اور ایک بسوط مقدمہ لکھا ہے جس میں مخلص کے حالات، اس کی تصانیف کا شمار، اس کے کلام اور طرز انشا پر تبصرہ۔ نواب علی محمد خاں کی خاصی مفصل سوانح عمری، اور بہت سی ترکیبوں اور اصطلاحوں کی جو کتاب میں استعمال ہوئی ہیں محققانہ تشریح ہے جس سے کتاب کی تاریخی اور ادبی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔ کتاب خوشنما ٹائپ میں عمدہ کاغذ پر چھپی ہے۔ مقدمہ ۱۴۰ صفحے میں اور متن و حواشی ۱۰۰ صفحے میں آئے ہیں اور آخر میں فہرست اشخاص، فہرست مقامات اور فہرست کتب متعلقہ اس کے علاوہ ہے قیمت چھ روپئے مقرر کی گئی ہے۔

نظام نو: محمد ظہیر الدین صدیقی۔ مکتبہ نشاۃ ثانیہ، حیدر آباد دکن۔ قیمت ۱۲ر

یہ مقالہ "نیا نظم عالم" کے عنوان سے ۱۹۴۲ء میں رسالہ جامعہ میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت دوسری جنگِ عظیم کی ابتدا تھی۔ اس درمیانی مدت میں حالات و واقعات میں عظیم الشان تبدیلیاں رونما ہوئیں اسی وجہ سے یہ مضمون ضروری ترمیم اور اضافہ کے ساتھ دوبارہ مکتبہ نشاۃ ثانیہ حیدرآباد دکن کی طرف سے شائع ہوا ہے۔

مؤلف نے ابتدا میں مغرب کے ضمیر عقلی کی تحلیل کی ہے اور موجودہ تمدن کی تین بڑی خصوصیات عقلیت پسندی، مادیت پسندی، اور خارجیت پسندی پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ اس کے بعد ان نظریات اور تحریکات کا جائزہ لیا ہے جو تمدن جدید کے مفاسد کی اصلاح کے دعویدار ہیں۔ مثلاً قومیت پرستی، مذہب انسانیت، اشتراکیت۔ اور بین الاقوامی وفاق۔

آخر میں مؤلف نے بتایا ہے کہ اگر مستقبل میں کوئی نظام انسانی فلاح و سعادت کا ضامن ہو سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہے اس لئے کہ "اس کی تمام تعلیمات ایک اٹل اور دائمی نظام اخلاق پر استوار ہیں۔ جس میں مغرب کی مادیت پسندی اور ادنیٰ درجہ کی مصلحت بینی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ خیر و شر کا ایک اعلیٰ اور ابدی تصور پیش کرتا ہے جو زمان و مکان کے حدود و قیود سے ماوریٰ ہے"۔

طرز بیان مضبوط، مدلل اور موثر ہے۔ لکھائی چھپائی معمولی۔

برفان اور دوسرے روسی افسانے: مترجمہ محسن علی۔ انڈین پریس۔ الہ آباد۔ قیمت ۱۲/

یہ روسی افسانوں کا مختصر سا مجموعہ ہے۔ اس میں سب سے پہلے پشکن کا نام نظر آتا ہے۔ اسے عام طور پر روس میں "آدمِ ادب" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ روسی واقعیت کی ابتدا بھی اسی سے ہوتی ہے۔ برفان میں واقعیت اور فن کی نہایت عمدہ آمیزش ہے۔ اس کے بعد چیخوف کا افسانہ انتقام درج ہے۔ تمام نقاد اس کے صناعانہ کمال کے معترف ہیں۔ اس نے آرٹ میں زندگی پیدا کی اور افسانہ کو اپنے نفس گرم کی آمیزش سے ایسی بلند منزل پر پہنچا دیا کہ اس میں انتخاب کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ ہر افسانہ دامنِ دل کو کھینچتا ہے اور ہمارے لطیف احساسات میں نئی اور صحت بخش حرکت پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے بعد گارشن Garshin کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس کا افسانہ

"چار دن" بہت مشہور ہے لیکن مؤلف نے لال جھنڈی کا ترجمہ کیا ہے۔ جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ آخر میں ٹالسٹائی کا افسانہ الیاس ہے۔ ٹالسٹائی نے وہ افسانے جو عوام کے لئے لکھے ہیں ان میں جذباتی تحلیل نہیں کی ہے۔ ان میں اختصار، اعتدال اور اثر ہے۔ یہ خصوصیات اس افسانہ میں بھی موجود ہیں۔

ہرچند کہ یہ انتخاب روسی ادب اور ادیبوں کی پوری اور حقیقی نمائندگی نہیں کرتا لیکن اس میں شک نہیں کہ دلچسپ ہے۔ اس میں زندگی کی حرارت ہے جو اس خوبی کے ساتھ دوسری جگہ کم ملتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ترجمہ شگفتہ نہیں ہے اور کتابت و طباعت کی بعض غلطیاں بڑی اذیت رساں ہیں۔

خ۔ ا۔ ف

سہیل (ماہوار) ایڈیٹر عارف سہاروی۔ قیمت سالانہ للعہ، فی پرچہ ۶ر مقام اشاعت گیا۔

یہ رسالہ چار سال پہلے گیا سے نکلتا تھا۔ غالباً کاغذ یا اور دوسری دقتوں کی وجہ سے بند ہوگیا۔ اب اپریل سے پھر نکلنے لگا ہے۔ پہلے بھی اس کا شمار بہار کے بہت کامیاب رسالوں میں تھا۔ زیر نظر رسالہ میں دو مختصر مقالے ہیں "ہم کیا چاہتے ہیں" اور تبصرہ فن کی حیثیت سے پہلے مضمون میں مضمون نگار نے نئے ادب کی حمایت کی ہے۔ بہت اعتدال کے ساتھ۔ دوسرے میں تبصرے کی فنی اہمیت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ افسانوں اور نظموں کا عنصر غالب ہے ہمیں امید ہے کہ اپنے نئے دور میں یہ رسالہ اور ترقی کرے گا۔

(ح۔ ح)

جدید مطبوعات مکتبہ سلطانی
کے
بیش بہا ادبی جواہر پارے

انجم کدہ دورِ حاضر کے اساتذہ اور مشاہیر شعراء کا بہترین منتخب کلام۔ نظم و غزل مع مختصر حالات زندگی و فوٹو بلاک کے۔ قیمت عہ؍

بیل بوٹے۔ پُر از معلومات مضامین کا نایاب مرقع اور دلکش افسانوں کا بہترین مجموعہ۔ قیمت عہ؍

پہلا پیار۔ مسٹر نعیم الحق صاحب بی، اے کے افسانوں کا نادر مجموعہ۔ قیمت عہ؍

رازکی باتیں۔ ذوالفقار حیدر صاحب نیرؔ کے افسانوں کا قیمتی مجموعہ۔ قیمت عہ؍

بوچھے۔ ملک کے ہر دلعزیز افسانہ نگار کرشن چندر کا تازہ ترین شاہکار۔ قیمت عہ؍

سندیسے۔ نادم سیتاپوری کی وہ انمول پیش کش جس کو پڑھنے کے بعد سیاسی سماجی اور تاریخی زندگی کا ہر پہلو صاف اُجاگر ہو جاتا ہے۔ قیمت عہ؍

اَن مِٹی۔ طوائف جب محبت کرنے لگتی ہے تو سوسائٹی اور سماج چیخ اُٹھتے ہیں۔ نہ جانے کیوں؟ قیمت عہ؍

منجدھار۔ ان افسانوں میں ہماری اخلاقی اور سماجی زندگی کے خاکے نہایت عجیب انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ قیمت عہ؍

دل کے آنسو۔ از۔ رئیس احمد صاحب جعفری۔ یہ ایک آئینہ ہے ان ٹھوس حقیقتوں کا جن سے ہمیں روزانہ سابقہ پڑتا ہے۔ قیمت عہ؍

جھلکیاں۔ رہبر بٹالوی کے ان انوکھے افسانوں کے ذریعہ زندگی کی وہ تصویریں دکھائی گئی ہیں جو محبت بھرے دلوں کے لئے پیام حیات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ قیمت عہ؍

ملنے کا پتہ۔ سلطان حسین تاجر کتب۔ ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی ۳

رجسٹر ایل نمبر ۱۸۹۲